بزمِ غالب

عبدالرؤف عروج

غالب کے احباب و دشمنان

بزمِ غالب

ناشر ——— مرزا ظفر الحسن
معتمد عمومی، ادارۂ یادگار غالب، کراچی

چھپائی ——— آفسٹ

تعداد ——— گیارہ سو

اشاعت کی تقریب ——— غالب کی صد سالہ برسی

ماہ و سال ——— مارچ ۱۹۶۹ء

مطبع ——— ایجوکیشنل پریس۔ کراچی

بزمِ غالب

عبدالرؤف عروج

ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی

واحد متکلّم

آدمی اپنے بزرگوں، عزیزوں، استادوں، دوستوں اور شاگردوں سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ غالب کے واقعات و حالات کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن ان کی شاعری اور شخصیت کو اس نقطۂ نگاہ سے پہچاننے کی کوشش نہیں کی گئی یہی احساس اس تالیف کا محرک ہوا۔ شروع میں میرا ارادہ تھا کہ میں ان تمام افراد کے حالات پوری شرح و بسط کے لکھوں، جن کا ذکر غالب کی اردو اور فارسی تحریروں میں آیا ہے لیکن یہ کام اتنا مشکل تھا کہ مجھے اس کے جلد مکمل ہونے کی امید نظر نہیں آتی تھی، مجبوراً میں نے موضوع کو معاصرین غالب تک محدود کر لیا، اس سلسلہ میں عود ہندی، اردوئے معلیٰ، کلیاتِ نثر فارسی، کلیاتِ نظم فارسی، دیوان غالب، نادرات، مکاتیب، ماثر اور متفرقات سے ان کی اہم شماری کی تو پتا چلا کہ وہ تعداد میں پانچ چھ سو سے کم نہیں۔ بظاہر ان سب کے حالات کا فراہم ہونا مشکل تھا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری۔ جس کے نتیجے میں وقت بھی ضائع ہوا اور روپیہ بھی، علاوہ ازیں سینکڑوں، ضروری اور غیر ضروری کتابوں کو الگ پڑھنا پڑا، تب کہیں جا کر یہ ہو سکا کہ میں اس موضوع پر کچھ لکھ سکوں۔

یہاں یہ بتا دینا غالباً نامناسب نہیں ہوگا کہ جس وقت میں نے اس موضوع پر لکھنا شروع کیا تھا غالب کی سوویں برسی میں صرف تین مہینے باقی رہ گئے تھے۔ اس

بنا پر نہ مجھے اتنا موقع مل سکا کہ میں کسی خاص تحقیقی اصول اور منصوبہ کی پابندی کرسکوں، نہ اتنی فرصت فراہم ہو سکی کہ مسودے پر نظر ثانی کی جا سکے۔ بس یوں سمجھ لیجئے ڈیڑھ دو ماہ کے عرصے میں، میں نے دو سو سے زائد افراد کے حالات لکھے اور کتابت کروائے۔ اس کے بعد اگر مزید افراد کے حالات لکھنے بیٹھتا تو ممکن نہیں تھا کہ یہ تالیف جسے بزم غالب کا نام دیا گیا ہے شایع ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بعض ایسی شخصیتیں اور افراد کے حالات، درج ہونے سے رہ گئے ہیں جن کو غالب کی زندگی میں انتہائی اہم حیثیت حاصل رہی ہے۔ اگر اس تالیف کو قابلِ اعتنا سمجھا گیا اور اس کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت محسوس ہوئی تو کوشش کروں گا کہ متن میں بعض ضروری تصحیح اور درستی کے ساتھ ان افراد کے حالات بھی درج ہو جائیں جنہیں بہ امر مجبوری چھوڑ دیا گیا ہے۔ احسان ناشناسی ہوگی اگر میں سید حسام الدین راشدی، مسلم ضیائی اور ابن حسن قیصر کا شکریہ ادا نہ کروں، یہ واقعہ ہے کہ ان کی بدولت نہ صرف مجھے انتہائی اہم اور نادر کتابیں دیکھنے کو ملیں بلکہ انہوں نے مجھے اپنے گراں قدر مشوروں سے بھی نوازا۔

آخر میں مجھے اس بات کا اعتراف کرنے دیجئے کہ اگر مرزا ظفر الحسن دن رات پیہم اور مسلسل تقاضا نہ کرتے تو مجھ سے نہ یہ تذکرہ مرتب ہوتا نہ اس کی بُری بھلی اشاعت کی نوبت آتی۔

عبدالرؤف عروج

۲ مئی ۱۹۶۹ء

۲۶۹- پیر الٰہی بخش کالونی
کراچی - ۵

ترتیب

۱

مرزا ابوالقاسم خاں

مرزا ابوالقاسم خاں کا پورا نام معہ خطاب مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں تھا وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ عبدالغفور نساخ کے بیان کے مطابق ان کا سلسلۂ نسب امیر تیمور تک پہنچتا ہے۔ بینی نرائن کے بقول وہ دہلی کے خاندان بادشاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ غالب نے ایک شعر میں ان کو "درد کی یادگار" کہا ہے۔ درد کے خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاید انہوں نے درد سے اصلاح لی ہو۔ اس سلسلہ میں بھی وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ ان کے حالات میں تذکرہ نویسوں کے بیانات بہت مختصر اور بڑی حد تک نامکمل ہیں۔ ان سے یہ بھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ مرزا ابوالقاسم خاں نے کب اور کیوں دہلی سے ہجرت کی۔

مولوی عبدالقادر رام پوری نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران مرزا ابوالقاسم خاں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ مرزا ابوالقاسم خاں نے دہلی سے نکلنے کے بعد کچھ دنوں لکھنؤ میں قیام کیا، پھر تلاش معاش میں کلکتہ پہنچے لیکن وہاں بھی لیاقت کے مطابق معاش کی صورت پیدا نہیں ہو سکی، جن دنوں غالب کا قیام کلکتہ میں تھا مرزا ابوالقاسم خاں اور غالب میں موانست پیدا ہو گئی تھی۔ غالب نے ان کے نام جتنے

بھی خطوط لکھے ہیں، ان میں بعض گھریلو باتوں کا تذکرہ ہے اور بس۔ ایک مرتبہ غالب نے مرزا ابوالقاسم خاں کو مسہل پینے کا مشورہ دیا۔ مسہل سے مرزا ابوالقاسم خاں کو فائدہ ہوا تو یہ مختصر قطعہ کہہ کر غالب کو بھیجا۔

اے مسیح زماں تو می دانی | بہ جنابت ارادتے کہ مراست
جو علی کے رسد بہ تشخیصت | کے فلاطون مثال تو داناست
می سزد گر بگو تمت بقراط | ورا فلاطون بخوانمت زیباست
مسہلی دادیٔ و لیف مودی | بہ عمل آو بے گماں کہ شفاست
زاں عمل دور شد مرض بالکل | گر بگویم توئی مسیح بجاست

غالب نے اس قطعہ کے جواب میں فوراً ایک قطعہ کہا اور انہیں ارسال کیا۔

دیوانِ جہاں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۱۲ء کو کلکتہ میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا تھا جس میں مرزا کاظم علی جواں، میر حیدر بخش حیدری، سید جعفر علی رواں، افتخار الدین علی خاں شہرت، مرزا ہاشم علی طپاں، مرزا قاسم علی ممتاز، مرزا لطف علی ولا اور دوسرے شعرا نے اپنی طرحی غزلیں پڑھی تھیں۔ اسی مشاعرے میں مرزا ابوالقاسم خاں نے یہ شعر سنائے تھے

ہجر میں اس گل کے گل ہاتھوں پہ کھایا چاہیئے | ہاتھ کو گلدستۂ رنگیں بنایا چاہیئے
دل کہے ہے گیروی کفنی رنگایا چاہیئے | بھیس اے قاسم فقیری کا بنایا چاہیئے
جی اسی کے دھیان میں اپنا لگایا چاہیئے | دل سے اسباب تعلق سب اٹھایا چاہیئے
خانقاہِ قیس پر اور مرقدِ فرہاد پر | شمع اور گل عاشقو جا کر چڑھایا چاہیئے
آگ بھڑکی ہے جگر میں بے طرح اے چشمِ تر | دے کے چھینٹا اشک کا اسکو بجھایا چاہیئے
چاہتے ہو گر شفا اس عاشقِ رنجور کی | خاک تھوڑی مرقدِ مجنوں سے لایا چاہیئے
لگ رہی ہے لو تمہیں قاسم اب کئی دن سے ہیں | حضرتِ دہلی کو کلکتہ سے جایا چاہیئے

بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالقاسم خاں کلکتہ سے دہلی

آکر وقائع نگار سلطانی ہو گئے اور ہیضہ کی وبا میں ۱۲ دسمبر ۱۸۴۵ء کو انتقال کیا۔

(دیوانِ جہاں صفحہ ۲۴۲، متفرقات صفحہ ۵، صفحہ ۱۰۱

علم و عمل صفحہ ۱۴۳ بہترین شعرا صفحہ ۳۰۵

بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ)

حکیم احسن اللہ خاں

حکیم احسن اللہ خاں کا پورا نام احترام الدولہ، عمدۃ الحکماء، معتمد الملک حاذق الزماں ثابت جنگ حکیم احسن اللہ خاں بہادر تھا۔ وہ دربارِ تیموریہ کے معتمد اور با اثر امیر ہونے کے علاوہ انتہائی معروف و ممتاز معالج بھی تھے۔ ان کے والد حکیم عزیز اللہ نے کشمیر سے دہلی آکر حکیم ذکاء اللہ سے طب پڑھی اور طبابت کرنے لگے۔

حکیم احسن اللہ خاں کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۸۰۰ء ہے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر نے لفظ "عزیب" سے ان کا سال ولادت برآمد کیا ہے۔

حکیم احسن اللہ خاں آں کہ بود — ارسطو نشاں عیسوی دم طبیب
بیامد چو اندر وجود از عدم — سن مولدش بودہ لفظ "عزیب"

حکیم احسن اللہ خاں نے طب میں اپنے والد سے استفادہ کیا، پھر نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ کے ملازم ہو گئے۔ بعد میں نواب فیض محمد خاں جھجر کا توسل اختیار کر لیا۔ ان کے انتقال پر دوبارہ دہلی آکر اکبر شاہ ثانی کے درباری طبیبوں میں شامل ہو گئے اور اس قدر ترقی کی کہ لال قلعہ کی سیاست میں ان کا سکہ جم گیا۔

سرسید احمد خاں نے غلط نہیں لکھا ہے کہ ہر شخص حکیم صاحب کو اپنا محسن سمجھتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ سرسید ہی نہیں، غالب اور مومن پر بھی ان کے احسانات تھے۔

۱۸۴۲ء میں سرسید کو بہادر شاہ ظفر نے جواد الدولہ عارف جنگ کا جو خطاب دیا تھا

اس کی تحریک حکیم صاحب ہی نے کی تھی۔ حکیم صاحب ہی کی وجہ سے غالب کو قلعۂ معلیٰ میں باریابی کا موقع ملا تھا۔ حکیم صاحب ہی نے بہادر شاہ ظفر کو تیموری خاندان کی تاریخ مرتب کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور اس خدمت پر غالب کو مامور کیا تھا۔ اس تاریخ کی صورت یہ تھی کہ حکیم صاحب واقعات جمع کرتے اور غالب ان کو اپنی بہار آفرین عبارت کا لباس پہناتے تھے۔ اس کے علاوہ حکیم صاحب ہی نے اپنی ذاتی کوششوں سے مومن کا فارسی کلام اور مکاتیب شائع کرائے تھے۔ اس بناء پر کلب علی خاں فائق رام پوری نے ان کو مومن کا پھوپھی زاد بھائی سمجھ لیا۔ محمود احمد برکاتی نے اس کی پُر زور طریقہ پر تردید کی ہے۔

۱۸۵۷ء کی سعیٔ انقلاب میں حکیم احسن اللہ خاں کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں جو قلعہ کے اندر اور قلعہ کے باہر اسے ناکام بنانے کے درپے تھے۔ چنانچہ حکیم احسن اللہ خاں اور بیگم زینت محل کے مشورے سے بہادر شاہ ظفر نے تیز رو سانڈنی سوار کی معرفت لیفٹنٹ گورنر کے نام ایک شقہ آگرہ بھیجا، جس میں دہلی پر مجاہدین کے چڑھ دوڑنے کی اطلاع دی گئی تھی اور لکھا گیا تھا:

برلب رسیدہ جانم، تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم بہ چہ کار خواہی آمد

اس کا علم مجاہدوں کو بھی ہوگیا، جس پر انھوں نے حکیم صاحب کے مکان کو آگ لگادی۔ غالب نے لکھا ہے:

"ایک شخص جس کے دل میں فرماں روائی ذکبر کے خیالات بھرے ہوئے تھے، درپردہ وہ اپنے آقا (حکیم احسن اللہ خاں) کا دشمن بن گیا۔ اس خیال سے کہ اگر یہ واقف کار اور رازداں زندہ رہے گا تو میں نے جو خزانہ ناجائز طریقوں سے جمع کیا ہے، اس کا راز کھل جائے گا، ہمیشہ

نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچتا تھا اور یہ بات مشہور کر کے کہ حکیم احسن اللہ خاں انگریزوں کے خیر خواہ ہیں، فوج کے افسروں کو ان کی طرف سے بھڑکاتا تھا۔ ایک دن کچھ لوگ حکیم احسن اللہ کو قتل کرنے کے لئے ان کے محل پر چڑھ دوڑے۔ حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں بادشاہ کے پاس تھے۔ چند آشفتہ سر قلعہ میں گئے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ بادشاہ نے انتہائی محبت و بندہ پروری سے حکیم صاحب کو بچانے کے لئے اپنے آپ کو ان پر گرا دیا۔ اس طرح حکیم صاحب بچے۔ جان تو بچ گئی لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوا جب تک کہ ان کا سارا گھر تباہ و برباد نہیں ہو گیا۔"

جب انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ قائم کیا اور اس کی سماعت کے لئے فوجی کمیشن کی تقرری عمل میں آئی۔ حکیم صاحب نے اس کے سامنے بہادر شاہ ظفر کے خلاف بیان دیا۔ اس کے باوجود انگریزوں نے ان کو معاف نہیں کیا اور ان پر پہرے بٹھا دیئے۔ کچھ دنوں کے بعد غالب کے بیان کے مطابق،

"وہ سپاہی جو ان کے اوپر متعین کیا گیا تھا، اٹھا لیا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ اپنی وضع پر قائم رہو، مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصد کرو تو پوچھ کر جاؤ، ہفتہ میں ایک بار کچہری میں حاضر ہوا کرو۔"

اس کے ساتھ ان کی پنشن بھی مقرر ہو گئی اور دو سو روپے ماہانہ ملنے لگے۔ اس اثنا میں انھوں نے جے پور میں سکونت اختیار کر لی، کبھی کبھی دہلی آتے لیکن اتنی خاموشی کے ساتھ کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ ۱۲۹۰ھ میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں بمقام بڑودہ انتقال کیا۔ ضیاء الدین خاں نیر نے "حکیم غریب" سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

دریغا بہ شہر بڑودہ بہ مرد — بہ غربت از وطن عنقریب

بود سال فوتش حکیم غریب — ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۰ء

حکیم صاحب نے مرات الاشباہ کے نام سے فرماں روایان ہند کے حالات میں ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ ان کی تصانیف میں مجربات و معمولات کی ایک بیاض کا بھی نام لیا جاتا ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

(حاشیہ سیرت فریدیہ ص
تاریخ عہد انگلشیہ ص۲۹۳ تا ۶۶۰
تذکرہ اہل دہلی ص۳۹
جلوۂ صحیفۂ زریں ص۱۵۶
ترجمہ دستنبو مشمولہ اردوئے معلی دہلی ۱۹۶۰ء
مٹکاف کی ڈائری ص۵۲
بہادر شاہ کا روزنامچہ ص۱۳۳
خطوط غالب ص۳۶۴)

آغا احمد علی

آغا احمد علی کے آباؤ اجداد کا اصل وطن اصفہان تھا، انھوں نے تلاش معاش میں ہندوستان کا قصد کیا اور نادر شاہ کی افواج کے ساتھ دہلی پہنچے اور پھر دہلی سے ڈھاکہ آکر مستقل سکونت اختیار کرلی۔

آغا احمد علی آغا شجاعت علی کے صاحبزادے اور آغا عبدالعلی کے پوتے تھے جن کو ایران میں اپنے عہد کا مشہور ترین خوش نویس خیال کیا جاتا تھا۔ آغا احمد علی کا سال ولادت ۱۸۳۹ء ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر اسداللہ کوکب سے رجوع ہوئے۔ بعد ازاں ۱۸۶۲ء میں کلکتہ پہنچ کر وہاں مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۴ء میں مدرسہ عالیہ میں مدرس فارسی مقرر ہوئے۔ دریں اثنا انھوں نے ایشیاٹک سوسائٹی کے لئے منتخب التواریخ، اقبال نامہ جہانگیری، مآثر عالمگیری اور اکبر نامہ کے کچھ حصوں کی تصحیح بھی کی۔

غالب نے ۱۸۵۷ء میں برہان قاطع کے مطالعہ کے دوران اس کے حاشیہ

پر اپنے اعتراضات لکھے تھے اور ان کو کتابی صورت میں ۱۸۶۲ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے طبع کروایا تھا۔ قاطع برہان کے شائع ہوتے ہی تمام علمی حلقوں میں اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ آغا احمد علی نے بھی اس کے جواب میں ۴۴۴ صفحوں کی ایک کتاب موید برہان کے نام سے مرتب کی اور اسے ۱۸۶۶ء میں مطبع مظہر العجائب کلکتہ سے شائع کیا۔ غالب کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہوں نے فارسی میں ایک طویل قطعہ لکھ کر آغا احمد علی کو ارسال کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخۂ

درخصوص گفتگوئے پارس انشا کردہ است

اس کے بعد انہوں نے موید برہان کا مطالعہ کیا اور تیغ تیز کے نام سے اس کے اعتراضات کے جوابات دیئے۔ تیغ تیز میں انہوں نے آغا احمد علی کے بارے میں لکھا ہے

"عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر، فارسیت میں برابر، فحش و ناسزا گوئی میں کمتر، جتنے الفاظ تذلیل کے ہیں، وہ چن چن کر میرے واسطے استعمال کئے اور نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں، شاعر نہیں، آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے۔ صاحب عزوشان ہے۔ عالی خاندان ہے۔ امرائے ہند، رؤسائے ہند، مہاراجگان ہند سب اس کو جانتے ہیں۔ رئیس زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ہے، بادشاہ کی سرکار سے نجم الدولہ کا خطاب ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں خاں صاحب بسیار مہربان دوستاں القاب ہے جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی ہے اس کو سڑی اور کتا اور گدھا کیونکر لکھوں، فی الحقیقت یہ تذلیل بہ مجرائے ضرب المثل اہانت المولیٰ گورنمنٹ بہادر کی توہین اور وقیع و شریعت ہند کی مخالفت ہے۔ میر اکیا بگڑا مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر کیا۔ میں نے

معلم امین بے دین کو شیطان کے حوالے کیا اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع نظر کیا اور ان کے مطالب علمی کا جواب اپنے ذمہ لیا۔"

آغا احمد علی نے تیغ تیز کا جواب شمشیر تیز میں دیا، ان کی یہ تصنیف سوا سو صفحوں پر محیط تھی اور ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی تھی۔

آغا احمد علی ۱۸۷۳ء میں کلکتہ سے ڈھاکہ چلے گئے تھے۔ وہاں چند مہینہ کے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ عبدالغفور نساخ نے " واصل حق آغا احمد" سے ان کا سال رحلت برآمد کیا ہے۔ آغا احمد علی کے تلامذہ میں محمود آزاد، محمد اشرف، عبدالعلیم، عاصم اور فدا اسلمٰی قابل ذکر ہیں۔

(بنگال میں اردو ص۹۳، مجموعۂ نثر غالب ص۱۸۰، ص۱۸۱

ذکر غالب ص۱۷۹، دیباچہ ہفت آسماں)

حکیم احمد حسن مودودی

حکیم احمد حسن مودودی، شاہ قطب اعظم مودودی کے چھوٹے صاحبزادے تھے جن کا سلسلۂ نسب حضرت شاہ مودود چشتی تک پہنچتا ہے جو حضرت امام حسن عسکری کی اولاد سے بتائے جاتے ہیں۔ حکیم احمد حسن مودودی ۹ ذی الحجہ ۱۲۶۰ھ کو لکھنؤ کے ایک محلہ رستم نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش سے چند ماہ قبل ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی علاتی بہن لاڈو بیگم نے ان کی پرورش کی۔ حکیم احمد حسن مودودی نے ابتدائی تعلیم شاہ قطب الدین حسن مودودی سے حاصل کی پھر دیگر علوم اور فن خوش نویسی کی تحصیل کے لئے مولوی محمد اصغر سے رجوع ہوئے۔

۱۸۵۴ء میں حکیم احمد حسن مودودی کے بہنوئی سردار مہدی حسن خاں بہادر فیروز جنگ والئ ریاست باونی کدورا نے ان کو اپنے پاس بلا لیا۔ باونی کدورا کالپی کے

وسیع و عریض علاقہ میں پہلی مسلمان ریاست تھی ۔ یہاں پہنچنے کے بعد حکیم احمد حسن مودودی نے خواجہ نظام الدین دہلوی سے دینی علوم کی تحصیل کی ۔ اسی زمانے میں ان کو شاعری کا بھی شوق ہوا ۔ کچھ دنوں کی مشق کے بعد غالب سے رجوع ہوئے اور پہلے ہی خط میں ان کو قبلۂ قبلہ اور کعبہ کعبہ سے مخاطب کیا جس پر غالب نے ان کے طرز تخاطب کی اصلاح کرتے ہوئے لکھا ۔

" آپ صحیح النسب سیّد، تمام امت مرحومہ محمد علیہ السلام کے قبلہ و کعبہ، جب آپ مجھ کو قبلہ و کعبہ لکھیں تو پھر میں آپ کو کیا لکھوں، خدا کے واسطے غور کیجیے، قبلۂ قبلہ اور کعبۂ کعبہ یہ کیا ترکیب ہے ۔ چونکہ آپ نے مجھے استاد گردانا ہے، اس التماس کو بھی از راہِ اصلاح تصور کیجیے، زنہار قبلۂ قبلہ کبھی نہ لکھئے، یہ سوئے ادب ہے بہ نسبت قبلہ ۔"

حکیم احمد حسن مودودی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں حضرت مودود چشتی کی سجادگی ایک عرصہ سے چلی آرہی تھی ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے بزرگوں کا ایک شجرہ بھی منظوم کیا تھا ۔ اور اسے اصلاح کی غرض سے غالب کے پاس بھجوایا تھا جس پر غالب نے اصلاح سے معذرت کر لی اور ان کو لکھ بھیجا ۔

" میرے قبلۂ و کعبہ واسطے خدا کے شجرۂ منظوم ارسال نہ فرمائیے گا، اس کی اصلاح میرے حد وسع سے باہر ہے ۔"

اسی طرح ایک اور خط میں غالب نے لکھا ۔

" آپ کے جدّ امجد کا غلام تو مر رہا، کثرتِ احکام، تواتر ورودِ اشعار اور پھر یہ ہنجار کہ سو روپے کے نوٹ کی رسید سو بار مانگی، غزلیں آپ کی برستی ہیں، کہاں تک دیکھوں ۔"

حکیم احمد حسن مودودی نے ۱۸۸۵ء میں اپنے بہنوئی نواب کدورا کے ساتھ

لکھنؤ کا قصد کیا اور پھر وہیں سے حج کے لئے روانہ ہوگئے۔ واپسی پر ۱۳۱۳ھ میں اسہال میں مبتلا ہوکر انتقال کیا۔ ان کی تصانیف کا علم نہیں ہے۔ شاید ان کے اہل خاندان میں ان کا کچھ کلام محفوظ ہو۔

مالک رام نے تلامذۂ غالب میں سہوانی کے رہنے والے ایک بزرگ حکیم سید حسنؒ پر حکیم احمد حسن مودودی کا التباس کر لیا ہے اور فنا اور جمالی تخلص بتائے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں حکیم سید حسن سے نہیں، حکیم احمد حسن مودودی سے مخاطب کیا ہے۔

(گلدستۂ مودودی، خطوط غالب ص ۳۴۹، تلامذۂ غالب ص ۲۳۶)

نواب احمد بخش خاں

مرزا عارف جان کا سلسلۂ نسب، باب ارسلاف کے ایک بزرگ خواجہ احمد یسویؒ سے ہوتا ہوا حضرت علی کے صاحبزادے محمد بن حنیفہ تک پہنچتا ہے۔ وہ اپنے بھائیوں قاسم جان اور عالم جان کے ہمراہ ہندوستان آتے وقت کچھ دنوں اٹک میں رک گئے۔ اس دوران وہاں کے صوبہ دار محمد بیگ خاں نے ان کو فرزندی میں لے کر اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح کر دیا۔ نواب احمد بخش خاں ان ہی کے صاحبزادے اور نبی بخش خاں، الٰہی بخش خاں اور محمد علی خاں کے بڑے بھائی تھے۔ غالب نے اپنے اکثر خطوط میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان کا سال ولادت ۱۷۵۰ء اور مقام ولادت اٹک ہے۔ جب مرزا عارف جان نے دہلی کی راہ لی تو یہ بھی اپنے والد کے ساتھ ہو لئے اس طرح ان کی جوانی کا زمانہ دہلی ہی میں گذرا۔ بعد ازاں انھوں نے گوالیار جا کر مہاراجہ کی فوج میں ملازمت کر لی، لیکن اس ملازمت کا سلسلہ زیادہ دنوں نہیں چل سکا اور وہ گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ ایک دفعہ وہ اسی غرض سے دہلی جا رہے تھے کہ ریاست الور کے مہاراجہ بختاور سنگھ سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے ان کو دیکھتے ہی ان کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا اور اپنے دربار میں ملازمت کی پیش کش کی جسے

انہوں نے قبول کرلیا اور عمائدین ریاست میں شمار ہونے لگے۔ جب انگریزوں نے جمنا کی جانب ریاست الور کے بعض حصوں پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی حیثیت دینے کی کوشش کرنے لگے تو مہاراجہ بختاور سنگھ نے نواب احمد بخش خاں کو اپنا وکیل بنا کر لارڈ لیک کی خدمت میں بھیجا جس کے بعد ان کے ذریعہ انگریزوں کے اور ریاست کے درمیان ایک عہد نامہ طے پا گیا۔

جب ۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے ریاست بھرت پور کے قلعہ ڈیگ پر چڑھائی کی تو مہاراجہ بختاور سنگھ نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ نواب احمد بخش خاں مہاراجہ کی فوجوں کے ساتھ انگریزوں کی کمک کیلئے بھرت پار پہنچ گئے۔ نواب احمد بخش خاں نے اس موقع پر بڑی دلیری اور بہادری کا ثبوت دیا اور اپنی جان پر کھیل کر جنرل فریزر کو دشمنوں کی زد سے نکالا لیکن اس کے اتنے کاری زخم لگے تھے کہ وہ زندہ نہیں رہ سکا۔ اس نے اپنے مرنے سے پہلے نواب احمد بخش خاں کو سندِ خوشنودی لکھ کر دی جس پر لارڈ لیک نے فیروزپور جھرکہ اور اس کے نواح کے کچھ علاقے اعزازی جاگیر کے طور پر انہیں دیئے اور فخر الدولہ اور دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ مہاراجہ بختاور سنگھ نے بھی ان کی بہادری اور دلیری کے اعتراف کے طور پر ان کو پرگنہ لوہارو کی جاگیر عطا کی اس طرح وہ بیک وقت فیروزپور جھرکہ اور لوہارو کے رئیس بن گئے۔ مہاراجہ بختاور سنگھ نے ۱۸۱۵ء کو انتقال کیا۔ اس کے انتقال پر بنے سنگھ اور بلونت سنگھ نے مسندِ نشینی کا دعویٰ کیا۔ نواب احمد بخش خاں نے بلونت سنگھ کی حمایت کی۔ اس وقت اختر لونی ریذیڈنٹ تھا۔ اس نے بنے سنگھ کو جائز حق دار قرار دیا اور اس باب میں صدر دفتر کو رپورٹ ارسال کی۔ جس پر نواب احمد بخش خاں نے گورنر جنرل سے ایک تحریر کے ذریعہ اختر لونی کی شکایت کی جس پر اس سے کہا گیا کہ وہ نواب احمد بخش خاں کی مرضی کے مطابق کام کرے۔ جس کے نتیجہ میں وہ نواب احمد بخش خاں کا دشمن ہو گیا۔ اس کے ساتھ بنے سنگھ کے حامی بھی در پردہ ان کو ہلاک کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔ ۱۸۲۲ء میں ایک رات جب کہ نواب احمد بخش خاں دہلی

، اپنی خواب گاہ میں سو رہے تھے۔ میو نامی ایک شخص نے ان کے
رہانے پہونچ کر ان پر تلوار کے تین وار کئے۔ تیسرے وار پر تلوار
ٹ گئی۔ لیکن نواب احمد بخش خاں کو کوئی کاری زخم نہیں آیا۔ اور وہ
م دنوں کے بعد صحت یاب ہو گئے۔

نواب احمد بخش خاں کی دو بیویاں تھیں، ایک میواتی الاصل اور
مری ہم قوم، پہلی کے بطن سے نواب شمس الدین خاں اور ابراہیم
خاں اور دوسری کے بطن سے نواب امین الدین خاں اور نواب
ء الدین خاں پیدا ہوئے۔ نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی ہی
ریاست الور اور سرکارِ انگریزی کی منظوری سے نواب شمس الدین
کے نام فیروز پور جھرکہ اور نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں
نام لوہارو کی جائیداد تقسیم کر دی اور ریاست کے انتظامی امور
دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ اس واقعہ کے ایک سال
اکتوبر ۱۹۲۷ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ حیف مقام فخر الدولہ سے ان
سال وفات نکلتا ہے۔ درگاہ حضرت خواجہ بختیار کاکی کے احاطہ میں مولانا
الدین کے مزار کے بائیں جانب ان کی تدفین عمل میں آئی۔

(تاریخ راجگانِ ہند ص ۳۶۸، ۳۶۹، کارنامۂ راجپوتاں ص ۲۵۲، ۲۵۳
دیباچۂ دیوانِ معروف، دیباچۂ صحیفۂ زریں، تلامذۂ غالب ص ۲۸۰، ۲۸۱)

واجد علی شاہ

واجد علی شاہ اختر ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ کو پیدا ہوئے۔ امین الدولہ امداد حسین خاں
ان کا اتالیق مقرر کیا گیا ابھی وہ لڑکپن کے ہی کے دور سے گزر رہے تھے کہ ندیموں اور

مصاحبوں نے ان کو لہو و لعب کے راستہ پر ڈال دیا، جس کے نتیجہ میں کئی طوائفیں مختلف خطابوں کے ساتھ ان کی زندگی میں داخل ہو گئیں۔

امجد علی شاہ نے ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ کو انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے دوسرے روز واجد علی شاہ کی مسندِ نشینی کا جلوس انتہائی شان و شوکت سے منایا گیا۔ مختلف شاعروں نے اس موقع پر تاریخی قطعات نذر گزارے، ایک شاعر کا مادۂ تاریخ "چراغِ ہند" بڑا مقبول ہوا۔

واجد علی شاہ نے مسند نشین ہونے کے بعد اپنے اتالیق امین الدولہ امداد حسین خاں کو عہدۂ وزارت پر مامور کیا۔ ابھی ان کو عہدۂ وزارت سنبھالے ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک خوفناک حادثہ پیش آ گیا۔ اس کی تفصیل غالب نے ایک خط میں یوں بیان کی ہے

"واجد علی شاہ جو اب تخت نشین ہوا ہے، بدحواس اور بدتدبیر ہے۔ اس نے ہندوؤں کے مندر گرانے کا حکم دے دیا ہے۔ چنانچہ ایک فتنہ و فساد برپا ہو گیا۔ شہر کے غنڈوں نے وزیر دربار (امین الدولہ امداد حسین خاں) کو بازار میں پکڑ کر تلوار کے دو تین وار کئے اور زخمی کر ڈالا، بعد ازاں وہیں اسے چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ بادشاہ کو گانے بجانے والوں کے سوا کسی سے دلچسپی نہیں۔ عقل و شعور سے بے بہرہ ہے"

امیر مینائی کے استاد مظفر علی اسیر نے اس واقعہ کی تاریخ یوں نکالی ہے:

اسیر سالِ وقوعِ فساد کرد رقم
رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت

اس وقوعِ فساد کے بعد امین الدولہ امداد حسین خاں کی وزارت زیادہ دنوں نہیں چلی، واجد علی شاہ اختر نے ان کو معزول کر کے نواب علی نقی خاں کو ان کی بجائے مقرر کیا۔ ان کے وزیر ہوتے ہی ارذل طبقہ کے بن آئی۔ ڈوم ڈھاڑی سب ہی ندیموں، مصاحبوں

اور مشیروں میں شامل ہو گئے۔ ان سے ہٹ کر مجتہدوں نے اپنا اثر جمایا۔ ان کے زیرِ نگرانی عدالتیں قائم ہوئیں اور فقہ جعفری کے مطابق فیصلے صادر کئے جانے لگے۔

اسی دوران ۱۲۷۰ھ میں واجد علی شاہ اختر کو سید الشہدا کی جانب سے بشارت ہوئی کہ ہم تمہارے لئے خاکِ شفا روانہ کر رہے ہیں؛ نجف اشرف کے مجتہد نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ وہ خاکِ شفا لکھنؤ روانہ کرے۔ چنانچہ ۲۶ شعبان ۱۲۷۰ھ کو خاکِ شفا کی ضریح بڑے اہتمام سے لکھنؤ آئی۔ واجد علی شاہ نے مجتہد العصر سلطان العلما سید محمد لکھنوی کو لکھا۔

"میں بہ سبب عارضہ خفقان پیادہ روی کی طاقت نہیں رکھتا اس لئے میں نے برخوردار صاحب عالم و عالمیان مرزا ولی عہد بہادر اور دوسرے شہزادوں کو حکم دیا ہے کہ وہ میرے قائم مقام ہو کر ضریح خاک مقدس کا استقبال کریں۔"

اس موقع پر غالب کو دوبارہ اودھ سے کچھ امید ہوئی۔ انھوں نے سلطان العلما سید محمد لکھنوی کی خدمت میں یہ قصیدہ لکھ کر ارسال کیا تاکہ وہ واجد علی شاہ اختر کے ملاحظہ میں پیش کریں:

بیا در کربلا تا اس ستم کش کارواں بینی
کہ در مرے آدم و آل عبا را سارباں بینی

یہ قصیدہ ساٹھ شعروں پر مشتمل ہے، اس کو پڑھنے کے بعد سلطان العلما سید محمد لکھنوی نے واجد علی شاہ اختر سے سفارش کی۔

"خاکِ شفا کی ضریح مقدس کے پہنچنے کی خوش خبری اس دارالسلطنت سے شاہجہاں آباد کو پہنچی، وہاں سے اسد اللہ خاں غالب نے جو بے مثل شاعر ہیں۔ ایک قصیدہ مدح ضریح میں لکھ کر اور حضور والا کی ثنا گری بھی بطریق ہدیۂ مختصرہ کے گزرانا ہے۔ میں ہمیشہ نیک کاموں میں سعی کرتا ہوں۔ اس کو دربار میں روانہ کر رہا ہوں، امید ہے کہ مدح گو ہمیشہ

مورد مراحم خسروی رہے گا"

یہ قصیدہ واجد علی شاہ اختر کو بہت پسند آیا۔ انھوں نے سلطان العلماء سید محمد لکھنوی کی سفارش پر غالب کو خلعت ناضرہ دیے جانے کا حکم دیا۔ جس کی اطلاع دیتے ہوئے سلطان العلماء سید محمد لکھنوی نے غالب کو لکھا:

"قصیدہ حضور کو بہت پسند آیا، خلعت ناضرہ کے عطا کرنے کا حکم ہوا لیکن اس خیال سے کہ آپ خاندان صاحب قران سے تعلق رکھتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ اس کا بھیجنا مخالف مزاج اس بادشاہ کے ہو اور آپ کے وظیفہ مقرر میں خلل پڑے۔ اس معاملے میں توقف کیا گیا، جو آپ کی رائے ہوگی اسی پر عمل کیا جائے گا۔"

اس واقعہ کے ایک سال بعد انگریزوں نے اودھ کی ضبطی کا اشتہار جاری کر کے ایک عہد نامہ پر واجد علی شاہ اختر سے دستخط کرائے اور ان کو بہ جبر معزول کر دیا گیا۔ واجد علی شاہ اختر نے اس سلسلہ میں لندن جا کر استغاثہ کرنے کے ارادے سے کلکتہ کا سفر کیا، لیکن طبیبوں اور مشیروں کے مشورہ پر مٹیا برج میں رہ پڑے اور وہیں اپنا دربار آراستہ کیا اور ۱۸۸۷ء تک زندہ رہے۔

واجد علی شاہ اختر کی تصانیف کا صحیح اندازہ ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے ہر فضا میں اور ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف نظم و نثر میں قصائد المبارک، صحیفہ سلطانی، نصائح اختری، عشق نامہ، حزن اختر، رسالہ ایمان، دفتر پریشان، متفق جعفر، دستور واجدی، صوت المبارک، ہیبت حیدری، جوہر عروض، ارشاد خاقانی نسبتاً زیادہ مشہور ہیں۔ ان کا کلام یہ ہے:

اس عشق نے رسوا کیا میں کیا بتاؤں کیا کیا
آہ دل ناشاد نے اور آسماں پیدا کیا

برائے سیر مجھے ساز ند میخانے میں گر آتے ٭ گرے ساغر لنڈھے شیشے ہنسے ساقی بہے دریا

یہی تشویش شب و روز ہے ہنگام میں ٭ لکھنؤ پھر دکھائے گا مقدر میرا

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بار خدا ٭ پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھائے غربت
ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا ٭ یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت
وسعت خلد سے بڑھ کر ہے کہیں حب وطن ٭ تنگی گور سے بدتر ہے فضائے غربت
یوں تو شاہان جہاں پر ہے پڑا وقت مگر ٭ ختم ہے اختر بے کس پہ جفائے غربت

(دستور الفصل اودھ ، معارف اپریل و مئی ۱۹۲۲ ،
بید باغ دو ورق ۱۱ ، تاریخ ادب اردو ص ۲۲۰)

قاضی محمد صادق اختر

قاضی محمد صادق خاں اختر کا سلسلۂ نسب خواجہ عبداللہ احرار تک پہنچتا ہے۔ وہ قاضی محمد لعل کے صاحبزادے تھے جن کے آباؤ اجداد نے عرب سے ترکی اور وہاں سے دہلی کی طرف ہجرت کی اور پھر بنگال پہنچ کر قاضی قضات کے عہدہ پر مامور ہوئے۔

قاضی محمد صادق خاں اختر کا سال ولادت ۱۲۰۱ھ ہے۔ وہ ہوگلی میں پیدا ہوئے اور وہیں علوم درسیہ کی تکمیل کی۔ زبان فارسی و اردو کو خوب جانتے تھے۔ فن شعبدہ میں کمال تھا۔ کیمیا گری میں مشہور تھے۔ شاعری میں مرزا قتیل سے تلمذ تھا۔ جس وقت انھوں نے ہوگلی کا توطن ترک کیا اور لکھنؤ پہنچے تو غازی الدین حیدر نے ان کی بڑی قدر افزائی کی۔ نہ صرف ان کو ملک الشعراء کا خطاب دیا بلکہ عہدۂ تالیف د

تصنیف کی خدمت بھی سپرد کی اور بطور وظیفہ ایک ہزار روپے ماہانہ مقرر کئے۔ نساخ کے بیان کے مطابق وہ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوئے۔ تاریخ فرخ آباد کے مولف مولوی ولی اللہ نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ فرخ آباد آ کر ان سے ملاقات کی تھی۔

جب غازی الدین حیدر کا انتقال ہوگیا تو قاضی محمد صادق خاں اختر نے لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر کان پور کی راہ لی اور وہاں انیس سال تک تحصیلداری کی خدمت پر کام کرتے رہے۔ ۱۲۵۹ھ میں پھر ایکبار لکھنؤ کا قصد کیا اور واجد علی شاہ کے زمرۂ ملازماں میں شامل ہوئے۔ واجد علی شاہ نے ان کو تخلص خوشتر عنایت کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد کسی وجہ سے واجد علی شاہ ان سے ناراض ہو گئے تو ان کو دوبارہ ہجرت اختیار کرنا پڑی۔ وہ لکھنؤ سے اٹاوہ چلے گئے اور ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں نے دہلی اور لکھنؤ پر مکمل قبضہ کرلیا۔ اس دوران انھوں نے دوبارہ لکھنؤ میں رہائش اختیار کی۔ ابھی ان کو یہاں آباد ہوئے ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ۱۲۷۴ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اختر درجنت سے ان کا سال وفات (۱۸۵۸ء) برآمد ہوتا ہے۔

غالب کو ہندوستان کے فارسی دانوں پر سخت اعتراض تھا۔ وہ امیر خسرو کے سوا کسی کو بھی بدرجہ استاد تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ صاحب عالم مارہروی کو مرزا قتیل سے تلمذ تھا، اس کے باوجود انھوں نے ان کے نام ایک خط میں لکھا:

> "منت اور مکین اور واقف اور قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجئے۔ ان حضرات میں عالم علوم عربیہ کے شخص ہیں، خیر ہوں، فاضل کہلایئں، کلام میں ان کے مزہ کہاں؟ ایرانیوں کی سی ادا کہاں؟"

اسی کے ساتھ وہ مرزا قتیل کے ایک اور شاگرد قاضی محمد صادق اختر پر بھی اس طرح کے چھینٹے اڑا گئے۔ لکھتے ہیں:

"قاضی محمد صادق اختر، عالم ہوں گے۔ شاعری سے ان کو کیا علاقہ"

غالب کے اس خط پر صاحب عالم مارہروی کو نہ صرف رنج ہوا بلکہ وہ ان سے حد تک ناراض بھی ہو گئے۔ غالب کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے صاحب عالم ہروی کو ایک اور خط لکھا اور اپنی صاف گوئی پر داد اور انصاف کے طلب گار تے۔ لکھتے ہیں:

"میرا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ پیر و مرشد حضرت صاحب عالم مجھ سے آزردہ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ میں نے ممتاز و (محمد صادق خاں) اختر کی شاعری کو ناقص کہا تھا"

اسی خط میں غالب نے آگے چل کر ایرانی اور ہندوستانی فارسی گو شعرا سانی فرق کو سمجھایا ہے اور لکھا ہے کہ:

"خالصاً ممتاز اور (محمد صادق) اختر کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ بلاشبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز ہی اور ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے۔ خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد، انصاف، انصاف۔"

اس کے برعکس قاضی محمد صادق خاں اختر، غالب اور حامیانِ قتیل کے معرکہ میں ب کی بلند پروازی اور زورِ طبع کے قائل تھے۔ نساخ نے ان کی تصانیف کے سلہ میں محامد حیدریہ، دیوان فارسی و ریختہ، گنج نیر ، تذکرۂ آفتاب عالم تاب ، مثنوی سراپا سوز کا ذکر کیا ہے۔ سعادت خاں ناصر کے بیان کے مطابق انھوں ے بہار اقبال، مفید المستفید، بہار ہجراں، گلدستۂ محبت، بہار بے خزاں اور ت اختر نامی تصانیف لکھی تھیں۔ صدیق حسن خاں نے ان کی ایک تصنیف

نفوذ الحکیم کا بھی ذکر کیا ہے ۔

محمد صادق خاں اختر کا نمونۂ کلام یہ ہے :

مستی و ہوش کسی نے کہیں یک جا دیکھا — شب کو بے چینی ہے بیخوابی ہے تنہائی
کیا تاسف سے تڑپتے ہیں اسیرانِ قفس — کچھ جو اڑتی سی سنی ہے کہ بہار آئی ۔

کل شیخ بن کے مجتہد عصر آ گیا — دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا زراہِ تبختر مجھے بہ طنز — معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا — پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں — لیکن نہ کیجیے مجھے مورد عتاب کا
مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو اور ماہ وش — اور کوئی بھی محل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب — یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا
منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو پیے — گر پی نہ جاتے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو — گر کچھ بھی خوف کیجیے روز حساب کا

کہاں تک مثل ہدہد خواہش تاج جہاں بانی
ہوا پریاں پہ ہر ہر مور ہے تخت سلیمانی
قدم ہرگز رکھوں باہر نہ گھر سے مثل آئینہ
سکندر بھی مری دعوت کرے گر میہمانی
گریباں گیر مطلب اہل دنیا سے بنوں گا میں
کر اپنی چارہ سازی درد دل ہے دامن افشانی
ہنرمندوں کی ہے افتادگی باعث ترقی کا
صدا ہے دستگیر گوہر شہوار سلطانی

(خوش معرکہ زیبا (بحوالہ نگار پاکستان اپریل ۵۸ء

قطعہ منتخب ص۱۱ (بحوالہ اُردو جولائی اگست ستمبر ۶۸ء

عہد بنگش ص۳۵۹ سخن شعرا ص۱۶، ص۱۷، ص۱۸

عود ہندی ص۱۱۸، ص۱۱۹ ،

خم خانہ جاوید جلد اوّل ص۱)

مولوی فرزند علی اخگر

مولوی فرزند علی نام تھا اور اخگر تخلص، عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ مرزاپور کی عدالت میں وکیل ہو گئے تھے۔ یہیں ان کی ملاقات غالب کے ایک شاگرد احمد حسین مینا مرزاپوری سے ہو گئی۔ احمد حسین مینا مرزاپوری نے غالب کے نام اپنے ایک خط میں ان کا ذکر کر دیا، جس پر غالب نے ان کو اطلاع دی کہ وہ فرزند علی اخگر کے دیرینہ آشنا ہیں۔ انھوں نے لکھا:

"مولوی فرزند علی صاحب اخگر کا کون شخص مشتاق نہ ہوگا۔ حسن صورت اور حسن سیرت دونوں ان میں جمع ہیں۔ فقیر تو ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ آنکھیں ان کے حسنِ صورت سے روشن اور دل ان کے حسن سیرت سے مسرور ہو گیا۔"

مالک رام نے فرزند علی اخگر کو تلامذۂ غالب میں شامل کیا ہے۔ اس شمولیت کی وجہ بے جواز، وہ غالب کی محولہ تحریر کی روشنی میں بھی ان کے شاگرد نہیں ٹھہرتے ہیں۔ عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ میں ان کا صرف یہ شعر نقل کیا ہے:

خود نما تھا سب حسینانِ زمن میں آئینہ
ہے مگر حیران تیری انجمن میں آئینہ

(تلامذۂ غالب صفہ ۲۹ ، مرقع ادب جلد دوم صنہ ۲۴ ،
سخن شعراء صفہ ۱۹)

شیو نارائن آرام

منشی شیونرائن آرام کے بزرگوں اور غالب کے اہلِ خاندان کے تعلقات قدیمی تھے اس کا اندازہ غالب کی متعدد تحریروں سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے :

"میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو، جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دل بند ہو۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہ گار، تم کو اپنے اور ہمارے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے، مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمہارے پر دادا نے بھی کمر کھول دی اور پھر کہیں نوکری نہ کی، یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر خاں صاحب کے ساتھ ہیں اور انھوں نے جو اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا ہے تو بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک یا دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں، انیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی ان کی عمر، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت، آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔"

منشی شیونارائن آرام کی تاریخ ولادت ۱۰ ستمبر ۱۸۳۳ء اور مولد آگرہ ہے۔ وہ ابھی تین چار سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی تمام تر پرورش ان کے دادا کے چھوٹے بھائی منشی کنہیا لال نے کی۔ یہ کنہیا لال وہی ہیں جن کے متعلق حالی نے یادگارِ

غالب میں یہ واقعہ درج کیا ہے۔

"لالہ کنہیا لال ایک صاحب آگرہ کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عمر تھے۔ ایک بار دلی آتے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثنائے کلام میں یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی وہ بھی آپ کو یاد ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔"

ان ہی منشی کنہیا لال کی وجہ سے آرام کی تعلیم و تربیت بہت اچھے طریقے پر ہوئی ۱۸۴۷ء میں آگرہ کالج میں داخلہ لیا، انگریزی اور فارسی کی تکمیل کی اور ۱۸۵۶ء میں اسی کالج میں ۲۵ روپے ماہانہ پر انگریزی کے مدرس ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں انھوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ مقدور بھر اسی امر کی کوشش کی کہ حکام کی زندگی شر پسندوں سے محفوظ رہے، اس کے صلہ میں ان کو دو ماہ کی تنخواہ بطور انعام دی گئی۔ ۱۸۵۸ء میں مدرسی کو خیرباد کیا اور آبکاری کے محکمہ میں ملازم ہوئے۔ یہاں طبیعت نہیں لگی تو محکمۂ انکم ٹیکس میں پہنچے اس کے چند دنوں بعد منصفی پر فائز ہوئے۔ دو سال گزرے تھے کہ ان کو سو روپے ماہانہ پر محکمہ چنگی کے سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ پیش کیا گیا۔ بعد ازاں آگرہ میونسپلٹی کے سکریٹری ہو گئے، اس زمانے میں انھوں نے جو خدمات انجام دیں، ان کے اعتراف کے طور پر حکومت نے ۱۸۷۷ء کے دہلی دربار میں انھیں خلعت اور سند کارکردگی عطا کی۔ ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر رائے بہادر کا خطاب عطا ہوا اور دربار میں کرسی نشینی کی اجازت دی گئی ـــــــ!

منشی شیو نارائن آرام کو رفاہی کاموں سے بھی دلچسپی تھی، انھوں نے اپنے خرچ سے ۱۸۵۸ء میں مفید عام اسکول قائم کیا تھا، اس کے علاوہ انھوں نے مشہور مطبع مفید

خلائق' کی بھی داغ بیل رکھی تھی اور یہاں سے غالب کا دستنبوئے فارسی اور دیوان شائع کیا تھا جن کا سن طباعت بالترتیب ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۲ء ہے۔ ان کی ادارت میں ایک پندرہ روزہ گلدستہ معیار الشعرا اور ماہنامہ مفید الخلائق کے نام سے شائع ہوتا تھا جس میں غالب کی غزلیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی تھیں۔

آرام نے میونسپلٹی میں ۱۸۹۸ء تک ملازمت کی، بعد میں دو سو روپے ماہانہ کے وظیفہ پر سبکدوش ہو گئے۔ ان کو اس وظیفہ سے زیادہ دنوں متمتع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ ۴ ستمبر ۱۸۹۸ء کو گردے کا مرض جان لیوا ثابت ہوا جو ۱۸۹۶ء سے چلا آ رہا تھا۔

منشی شیو نارائن آرام کو غزل کے مضامین سے بہت کم دلچسپی تھی، وہ زیادہ تر تصوف کے میلانات کی طرف توجہ دیتے تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں شوخی اور بے باکی کی بجائے متانت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کی ایک غزل کا انتخاب یہ ہے:

غضب ہے مدعی جو ہو وہی پھر مدعا ٹھہرے
جو اپنا دشمن دل ہو وہی دل کی دوا ٹھہرے

نہ ٹھہرے ناامیدی اس کے دل میں اور کیا ٹھہرے
کہ جس کا بعد مرنے کے حصول مدعا ٹھہرے

وہ چاہیں جس قدر جور و جفا ہم پر کریں لیکن
ہمیں تسلیم سر لازم ہے کہ پابند رضا ٹھہرے

دنیا اک سرا ہے اس کو آخر چھوڑ جانا ہے
اگر دو چار دن آکر یہاں ٹھہرے تو کیا ٹھہرے

اسی کو زندگی کا لطف ہے اس دہر فانی میں
کہ جو نزدیک اچھوں کے بھلا اور باخدا ٹھہرے

قیام اپنا ہو اس محنت سرائے دہر میں کیونکر
جہاں آفت ہی آفت ہو وہاں آرام کیا ٹھہرے

(ادبی خطوط ص ۱۰۱، خطبات گارساں دتاسی ص ۲۷۶، ص ۳۰۹، ص ۴۶۹، خطوط غالب ص ۲۴۳، خم خانۂ جاوید اول ص ۱۰، یادگار غالب ص ۱۳۶)

مفتی صدرالدین آزردہ

سر سید احمد خاں نے مفتی صدرالدین آزردہ کو "سرگروہِ علمائے روزگار" لکھا ہے۔ ان کے والد کشمیر سے بہ غرض تجارت دہلی آئے تھے۔ یہیں مفتی صاحب کی ولادت ہوئی لفظ چراغ سے ان کا سال ولادت برآمد ہوتا ہے۔ انھوں نے علوم عقلی و نقلی کی تکمیل شاہ عبدالعزیز، مولانا عبدالقادر مولانا محمد اسحاق اور مولوی فضل امام سے کی۔ بعد ازاں درس تدریس میں مصروف ہو گئے۔ جامع مسجد کے قریب دارالبقا کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ اکثر طالب علموں کے طعام و قیام اور لباس کے اخراجات وہ خود اٹھاتے تھے۔ جب انگریزوں نے سیاسی استحکام کی خاطر ذی حیثیت مسلمانوں کو صدر الصدور اور افتا کے عہدوں پر مامور کرنا چاہا تو ان کی نگاہ مفتی صاحب پر بھی پڑی اور وہ باصرار دہلی کے صدر الصدور بنائے گئے۔

مشہور ہے کہ ایک موقع پر ان کے سامنے غالب کے خلاف قرض کا مقدمہ پیش ہوا، مدعا علیہ نے حاضر ہو کر جواب دعویٰ کی بجائے یہ شعر پڑھ دیا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب مسکرائے، غالب کے خلاف قرض کی ڈگری دیدی لیکن سارا روپیہ اپنے پاس سے ادا کر دیا۔ ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں کے خلاف شورش برپا ہوئی، تو مفتی صاحب گوشہ نشین ہو گئے۔ لیکن حالات نے انھیں گوشہ نشین نہیں رہنے دیا، وہ عدالتی امور جاری رکھنے پر مجبور کیے گئے۔ اسی دوران بخت خاں نے علما اور مشائخ سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ لکھایا۔ اس پر مفتی صاحب سے بھی زبردستی دستخط لئے گئے۔ انھوں نے اپنے دستخط کے ساتھ کتب الجبر لکھ دیا لیکن نقطے نہیں دیے

انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد مفتی صاحب کو بھی گرفتار کر کے حوالات میں رکھا روبکاری ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ دستخط ان ہی کے ہیں لیکن انھوں نے صاف طور پر کتب الجبر لکھ دیا ہے، یعنی دستخط جبر و تشدد سے لئے گئے ہیں۔ غالب کے الفاظ میں

"صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائداد ضبط، خستہ و تباہ لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائیداد واگذاشت کی"

مفتی صاحب نے اس تباہی اور بربادی کے زمانے میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق ان کا دیوان خانہ تمام منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔

عمر کے آخری ایام میں مفتی صاحب پر فالج گر پڑا، انھوں نے پانچ چھ سال تک اسی میں مبتلا رہنے کے بعد ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۰ھ کو انتقال کیا۔ مولوی ظہیر علی نے "چراغ دو جہاں بود" سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ مفتی صاحب نے انتقال سے ایک روز قبل ۲۳ ربیع الاول کو نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کی خدمت میں ایک درخواست ارسال کی جس میں لکھا تھا:

"میں ایک عرصۂ دراز سے مرض فالج میں مبتلا تھا۔ اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجہ ضعیفہ اور دوسرا خواہرزادہ محمد احسان الرحمٰن نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے۔ ان دونوں کو آپ کے سپرد کئے جاتا ہوں۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری فرماتے رہیں، یہ ایک نوع کا سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہوگا۔"

اس درخواست کے فوری بعد کلب علی خاں والیٔ رام پور نے پانچ سو روپے بھجوائے اور ان کی بیوی لاڈو بیگم کی درخواست پر دو سو روپے ماہانہ مقرر کر دئے

ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

جمع طوفان و چشمِ تر سرِ رف — اب مصارف کا کچھ حساب نہیں
دھو دیا سب کو دیدۂ تر نے — وہ نہیں درس وہ کتاب نہیں
کاش مقبول ہو دعائے عدو — کیا کروں وہ بھی مستجاب نہیں
اَب تو اس چشمِ تر کا چرچا ہے — ذکرِ دریا نہیں سحاب نہیں
مختصر حال چشم و دل یہ ہے — اِس کو آرام اس کو خواب نہیں
عشق بازی کا منہ چڑانا ہے — اب وہ موسم نہیں شباب نہیں

شب جوشِ گریہ تھا مجھے یادِ شباب میں — تھا غرق میں تصورِ آتش سے خواب میں
قسمت تو دیکھ کھولی گرہ کچھ تو رہ گئے — ناخن ہمارے ٹوٹ کے بندِ نقاب میں
یارب یہ کس نے چہرے سے اُٹھا نقاب جو — سوراخ اب نکلنے لگے آفتاب میں
میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں

عالم خراب ہے نہ نکلنے سے آپ کے — نکلو تو دیکھو خاک میں کیا گھر کے گھر ملے
دل نے ملا دیں خاک میں سب وضع داریاں — جوں جوں کھنچے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

(آثار الصنادید ص ۱۸۱، خطوط غالب ص ۶۵۵، گلستان سخن ص ۲۱۶
دہلی کالج اردو میگزین ۱۹۵۱ء نقش آزاد ص ۲۱۶۔)

الیگزنڈر ہیڈرلی آزاد

الیگزنڈر ہیڈرلی آزاد کو اردو کے ان یورپی شعراء میں امتیازی حیثیت حاصل ہے جنھوں نے ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی قومیت اختیار کرلی تھی اور اس کی تہذیب

اور معاشرتی خصوصیات کو اپنایا تھا۔ آزاد کے مورث اعلیٰ سالسبری (انگلینڈ) کے تعلقدار تھے۔ آزاد کے دادا جیمز ہیدرلی اپنے خورد سال لڑکے کو ساتھ لے کر بسلسلہ تجارت انگلستان سے کلکتہ آکر بحری بیڑہ میں کپتان کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ کچھ دنوں بعد ان کی بیٹی اور بیوی انگلستان واپس ہوگئیں، کچھ عرصہ بعد انھوں نے اپنی جائیداد کے تصفیہ کے لئے، اپنے اہل وعیال کو کلکتہ میں چھوڑ کر انگلستان کا قصد کیا لیکن واپس نہیں ہو سکے

ان کا خورد سال لڑکا جیمز ہیدرلی ثانی کلکتہ میں غربت کی ٹھوکریں کھاتا اور دوسروں کے رحم وکرم پر پرورش پاتا رہا۔ ۱۸۰۱ء میں جب کہ اس کی عمر مشکل سے چودہ سال کی تھی اسے فورٹ ولیم کلکتہ میں کلرکی مل گئی، پھر وہ بریلی، میرٹھ، مراد آباد اور سہارن پور میں اعلیٰ عہدوں پر مامور ہونے کے بعد پنشن پر سبکدوش ہوا۔ چونکہ اس کی اردو اور فارسی نوشت و خواند اچھی تھی۔ والیٔ جھجر نواب فیض محمد خاں نے اس کو اپنے دربار میں ملازم رکھ لیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس کو فرانسیسی بتایا ہے، یہ درست نہیں۔ لالہ سری رام کے بیان کے مطابق جیمز ہیدرلی ثانی نے ایک مسلمان خاتون سے شادی کی تھی۔ جس کے بطن سے ۱۸۲۹ء میں آزاد (الیگزنڈر ہیدرلی) پیدا ہوئے۔ آزاد کی تعلیم وتربیت اسلامی ماحول میں ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اتنی مشق بہم پہنچائی کہ اس کو ہر موضوع پر فی البدیہہ شعر کہنا آگیا۔ اس نے پہلے غالب اور پھر زین العابدین عارف سے اصلاح لی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے وقت آزاد الور میں ملازم تھا۔ غالب کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کو الور کے راجہ کے یہاں اثر ورسوخ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ غالب نے میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"الور کا حال کچھ اور ہے، مجھے اور انقلاب سے کیا کام، الیگزنڈر ہیدرلی کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہر ہوا ان کی مصاحبت نہیں، ورنہ مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا "

آزاد کی عمر نے زیادہ وفا نہیں کی ، وہ تیس سال کی عمر میں ، ۲ جولائی ۱۸۶۱ء کو انتقال کر گیا - اس کے انتقال کے دو سال بعد ۱۸۶۳ء میں مطبع احمدی آگرہ سے اس کے بڑے بھائی تامس ہیدرلی نے اس کا دیوان شائع کیا اور دیباچہ میں اس امر کی وضاحت کی کہ " آزاد کو اپنے استاد عارف اور استاد کے استاد غالب کا انداز پیشِ نظر تھا - چنانچہ اکثر غزلیں عارف، غالب، شیفتہ، ممنون اور دیگر اساتذہ کے تتبع میں کہی ہیں "

قانع ہوں اس پہ عشق میں جو خشک و تر ملے
کھانے کو داغ، پینے کو خونِ جگر ملے

بے درد ہو نصیب مرے مدعی کو دل
بے داغ دشمنوں کو ہمارے جگر ملے

حاصل زبس خلاف تمنا ہے کام دل
جب ہو گی زہر کی ہمیں خواہش شکر ملے

آزاد کس کے شیخ و برہمن نزاں سے پوچھ
ہے مفت دین جا کے بھی وہ بُت اگر ملے

افسوس خاک تک نہ ہمیں بھر سر ملے
وہ لوگ بھی ہیں جن کو اڑانے کو زر ملے

بس ہو گیا یقین کہ یہی راہِ یار ہے
دل جا بجا پڑے ہیں جو سر رہ گزر ملے

پھرتا ہے تو تو خلق کی آنکھوں میں رات دن
روئے زمیں پہ کس کو ترا رہ گزر ملے

آزاد ہم تو آج گزر جائیں جان سے
کوئے صنم میں جا یئے مدفن اگر ملے

(خمخانۂ جاوید اوّل ص۴۲، خطوطِ غالب ص۲۳۳
دیوانِ آزاد ، ماہِ نو ستمبر ۱۹۶۶ء)

اندریو اسٹرلنگ

اندریو اسٹرلنگ کو بعض وجوہ کی بنا پر غالب کا مربّی اور محسن خیال کیا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ وہ ۱۸۱۳ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کے مشورہ پر انگلستان سے ہندوستان بھیجے گئے تھے۔ انھوں نے ابتداء میں دہلی اور آگرہ میں مختلف معزز عہدوں پر کام کیا۔ بعد میں حکومت انگریزی کے سیکرٹری بنائے گئے اور ان کی تعیناتی کلکتہ میں ہوئی۔ ———

غالب ۱۸۲۷ء میں اپنی پنشن کے مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ پہنچے، وہاں ان کی ملاقات اندریو اسٹرلنگ سے بھی ہوئی۔ انھوں نے غالب کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور انتہائی تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آئے۔ اس بنا پر غالب کو توقع ہوگئی کہ ان کے مقدمہ کا فیصلہ ان کے موافق ہو جائے گا۔ لیکن یہ توقع یوں پوری نہیں ہو سکی کہ اندریو اسٹرلنگ کا ۲۵، ۲۶ برس کی عمر میں ۱۸۳۰ء میں اچانک انتقال ہوگیا۔ انکے انتقال پر غالب نے فارسی میں ایک دردناک مرثیہ لکھا، اس کے چند شعر یہ ہیں:

فروغ طالع ایام مسٹر اسٹرلنگ — کہ فر خسرویش تافتی خور ز جبیں !
شگفتہ روئے و پسندیدہ خوئے و مشکیں موئے — بہ رائے نیک و نکو گوہر خوش و در شیوہ گزیں
بہار خوش نگہاں را نسیم پردہ کشا — بساط کج کلہاں را امیر صدر نشیں
لطافت از لب وکامش اسیر حرف و سخن — سعادت از سر و دستش رہین تاج و نگیں
سواد ہند ز فیضش شکنج طرۂ حور — بساط دہر ز لطفش فضائے خلد بریں

اندریو اسٹرلنگ فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ غالب نے ان کی مدح میں ایک

پرزور فارسی قصیدہ بھی لکھا ہے جو ان کی کلیات نظم فارسی میں موجود ہے :

فغاں کہ نیست سر و برگ دامن افشانی　　بہ بند خویش فرو ماندہ ام زعریانی

فغاں کہ ریخت تمنائے بستہ وبالیں　　خسک بہ پیرہن لذت تن آسانی

فغاں کہ نامۂ شوقم بہ چار سوئے قبول　　نبرد راہ بجائے ز بہرزہ عنوانی

(کلیات نظم فارسی اول ص۲۱۵ ، عود ہندی ص۳۸۳
دوم ص۱۹ ، کلیات نثر غالب ج۱ ص۱۲۱)

مفتی اسداللہ خاں

مفتی اسداللہ خاں بہادر مفتی کریم قلی خاں کے صاحبزادے تھے جن کا آبائی وطن الہ آباد تھا ۔ انھوں نے علوم متداولہ کی تحصیل اپنے دور کے مشہور عالم مولانا فضل رسول بدایونی سے کی ۔ پھر فتح پور میں مفتی عدالت کی خدمت پر مامور ہوئے ۔ علمائے ہند کے مؤلف رحمان علی نے بتایا ہے کہ جن دنوں مفتی اسداللہ خاں بہادر کا قیام فتح پور میں تھا ، اس نے ان سے احادیث وعقائد کی کتابیں پڑھی تھیں ۔ اس کے چند دنوں بعد مفتی صاحب کا تبادلہ ہوگیا اور وہ آگرہ میں قاضی القضات کے عہدے پر فائز کئے گئے ۔

غالب کی کلیات نظم فارسی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۳ء میں تیار ہوا ۔ جن دنوں ان کے پاس اس کی کاپیاں تصحیح کے لئے آرہی تھیں ۔ مفتی صاحب کا کسی کام سے دہلی جانا ہوا جہاں انھوں نے غالب کو اپنا ہم نام خیال کرتے ہوتے ان سے ملاقات کی ۔ غالب نے عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں تاکید کی ہے کہ وہ مفتی اسداللہ خاں بہادر کی خدمت میں ان کا سلام پہنچا دیں ۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اور اپنی ملاقات کا حال بھی لکھا ہے ۔ لکھتے ہیں : ــــــ

" آپ مفتی صاحب سے کہئے کہ مجھ کو باوجود شدت نسیاں آپ کا

تشریف لانا یاد ہے، چھاپے کے اجزا ارشاد کریں نے آپ کے سامنے ایک غزل اپنی پڑھی تھی جس کے دو شعر قطعہ بند ہیں ۔

از زندہ گوہرے چو من اندر زمانہ نیست
خود را بہ خاک رہگذر حیدر افگنم
منصور فرقۂ علی اللہیان منم
آوازۂ انا اسد اللہ در افگنم

خدا کرے حضرت کو بھی یہ واقعہ یاد ہو۔ اتحاد اسمی دلیل مودت روحانی ہے۔"

مفتی اسد اللہ خاں بہادر سے غلام غوث خاں بے خبر کی بھی مراسلت تھی۔ فغان بے خبر میں ان کے نام چند خطوط ملتے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بے خبر ان کو ایک لائق احترام اور برگزیدہ شخصیت خیال کرتے تھے۔ مفتی اسد اللہ خاں بہادر ایک طویل عرصہ تک آگرہ میں قاضی القضات کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ آخر عمر میں ان کو جونپور میں صدر الصدور کا عہدہ دیا گیا۔ یہاں چند سال کام کرنے کے بعد ان کا یکم جمادی الاول ۱۳۰۰ھ کو انتقال ہو گیا۔ جونپور کے ایک محلہ چند ساری میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

(تذکرہ علمائے ہند ص۲۲ ، عود ہندی ص۸۳)

مرزا اسفندیار بیگ

مرزا اسفندیار بیگ کا مولد بریلی تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں پائی تھی۔ بعد میں اپنی ذاتی کوششوں اور صلاحیتوں سے ضلع مظفر نگر میں نیابت فوجداری کے منصب پر متمکن ہو گئے۔ اسی زمانے میں نواب شمس الدین خاں والیٔ لوہارو نے ان کو اپنے پاس بلا کر بطور مختار کار ملازم رکھ لیا۔

نواب شمس الدین خاں پر ولیم فریزر کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چلا اور مجسٹریٹ نے اس سلسلہ میں مقدمہ کے سارے کوائف تفتیش کے نتائج، گواہوں کے بیانات اور اپنی رائے لکھ کر صدر کلکتہ کو آخری فیصلے کے لیے بھیجدی تو نواب شمس الدین خاں نے اسفندیار بیگ کو اپنا وکیل نامزد کیا اور مقدمہ کی پیروی کے لئے کلکتہ بھیجا - اسفندیار بیگ نے کلکتہ پہنچ کر ایک انگریز وکیل چارلس تھیکرے کی خدمات حاصل کیں، اس کے باوجود مقدمے میں ناکامی ہوئی۔ اسفندیار بیگ کو اس ناکامی کا اتنا صدمہ پہنچا کر انھوں نے دستار باندھنا چھوڑ دی اور تمام عمر ایک مختصر سا دوپٹہ سر پر لپیٹتے رہے ۔

اس واقعے سے چند سال پہلے ۱۸۳۱ء میں ریاست الور کے راؤ راجہ نے انتظام کی ابتری سے تنگ آکر آغا صاحب خوش نویس کی معرفت ریذیڈنٹ دہلی کے میر منشی امین اللہ خاں عرف امو خاں کو سات سو روپے ماہوار پر بلا کر دیوان مقرر کر دیا تھا - اس واقعہ کے بعد اسفندیار بیگ بھی تین سو روپے ماہوار پر نائب دیوان ہو گئے - کچھ دنوں بعد منشی امین اللہ خاں اور اسفندیار بیگ میں اختلافات کا زنجیرہ کھل گیا - مرزا نے ان کے خلاف سازشیں شروع کیں اور رشوت ستانی کا الزام لگا کر ان پر سات لاکھ روپے جرمانہ کروایا - اس طرح دیوان کی خلعت مرزا کو مل گئی - لیکن راؤ راجہ نے اپنے فالج میں مبتلا ہونے کے بعد منشی امین اللہ خاں کے بھائیوں فضل اللہ خاں اور انعام اللہ خاں کے کہنے سننے پر ان کو دوبارہ دیوان مقرر کر دیا - اس کے کچھ عرصہ بعد راجہ بنے سنگھ پچاس برس کی عمر میں انتقال کر گیا - اس کے انتقال پر اس کے تیرہ سالہ لڑکے شیو دھان سنگھ کی گدی نشینی کی رسم ادا کی گئی اسی دوران غدر کا ہنگامہ برپا ہو گیا - اس صورت حال میں انگریزوں نے ریاست کے معاملات میں مداخلت مناسب نہیں سمجھی - ریاست کا سارا انتظام پولیٹیکل ایجنٹ

لکھودیر سنگھ کی نگرانی میں چلنے لگا۔ شیودھان سنگھ کو منشی امین اللہ خاں، فضل اللہ خاں، انعام اللہ خاں اور ان کے رشتہ داروں کی حمایت حاصل تھی۔ اس نے راجپوتوں کی مخالفت کرنا شروع کردی، جس پر مرزا اسفندیار بیگ کو پھر ایک بار سازشیں کرنے کا موقع مل گیا اور لکھودیر سنگھ کو یہ بات سمجھائی کہ دیوان اور اس کے رشتہ دار نوعمر راجہ کو اپنے آبائی مذہب سے برگشتہ کردینگے جس پر لکھودیر سنگھ نے فسادیوں کو لیکر راتوں رات منشی امین اللہ کے مکان پر حملہ کردیا جس کے نتیجے میں دو افراد قتل ہوگئے، منشی امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں نے اصطبل کی دیوار کود کر جان بچائی، لیکن ان کو گرفتار کرلیا گیا۔ دوسرے روز شیودھان سنگھ اور رانی نے لکھودیر سنگھ کو غیرت دلائی جس پر اس نے ستم سے ہاتھ روک لیا اور منشی امین اللہ خاں، ان کے بھائی اور اہل خاندان مال واسباب سمیت الور سے نکال دئے گئے۔ مرزا اسفندیار بیگ کو ان سازشوں کی بدولت الور کے رہنے والے مرزا پھینٹے باز کے نام سے پکارتے تھے اور یہی نام ان کا عرف بن گیا تھا۔

مرزا اسفندیار بیگ کو ان سازشوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ انگریزوں نے اس ابتری کو دیکھتے ہوئے راجہ کے بالغ ہونے تک ریاست کا نظم ونسق چلانے کے لئے نومبر ۱۸۵۸ء میں ایجنسی قائم کردی اور اس کا سربراہ کپتان امپے کو مقرر کیا۔

اس دوران مرزا اسفندیار بیگ بینائی سے محروم ہوکر ریاست سے نکالدئے گئے اور ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے متبنیٰ لڑکے نے ریاست سے وظیفہ کے حصول کے لئے بڑی کوشش کی لیکن انگریزوں نے انکار کردیا۔

غالب کے خطوط میں کئی جگہ مرزا اسفندیار بیگ کا ذکر آیا ہے۔ پنج آہنگ میں ان کا ایک خط مرزا اسفندیار بیگ کے نام ملتا ہے۔ یہ خط ۱۸۵۰ء میں لکھا گیا تھا۔ اس وقت الور کے دیوان مرزا اسفندیار بیگ تھے۔ غالب نے اس خط کے

ذریعہ گوشہ دو توشہ دیرینہ کی بحالی درخواست کی لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

(کلیات نثر غالب ص ۲۱۹، کارنامۂ سروری ص ۱۳۰

کارنامۂ راجپوتاں ص ۳۵۳ ص ۳۵۴

دقیع الورص ۱۴۴ ص ۱۵۲ ،)

حکیم اشرف علی

حکیم میر اشرف علی ابن میر اسد علی دہلی کے رہنے والے تھے۔ میر مہدی مجروح اور ان میں بے حد دوستی تھی۔ میر مہدی مجروح ہی کے ذریعہ غالب ان سے پہلی مرتبہ متعارف ہوئے تھے۔ میر مہدی مجروح نے ایک تعارفی خط دے کر ان کو پانی پت سے غالب کے پاس بھیجا تھا۔ ان سے پہلی ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے غالب نے لکھا۔

"کل دوپہر ڈھلے ایک صاحب اجنبی سانولے سلونے داڑھی منڈھے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے، تمہارا خط دیا، صرف ان کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ یا رے ان سے اسم شریف پوچھا گیا، فرمایا اشرف علی۔ قومیت کا استفسار ہوا، معلوم ہوا سید ہیں، پیشہ پوچھا، حکیم نکلے، یعنی حکیم میر اشرف علی، میں ان سے مل کر خوش ہوا، خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔"

ایک مرتبہ چودھری مجروح کو شدید تپ آگئی، غالب کو اس کا علم ہوا تو بے حد پریشان ہو گئے۔ اس اثنا میں حکیم اشرف علی سے بھی ان کی ملاقات ہوئی جس میں انھوں نے بتایا کہ انھوں نے نسخہ لکھ کر ڈاک میں بھیج دیا ہے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم میر اشرف علی کو کتابیں خریدنے کا بڑا شوق تھا۔ بقول غالب :۔

"انھوں نے ٹکے ٹکے کی کتابیں چالیس چالیس روپے میں خریدی تھیں"

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران جہاں اور لوگوں پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے وہاں حکیم میر اشرف علی کو بھی متعدد پریشانیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، انگریزوں نے ان کی تمام املاک کو اپنی تحویل میں لینے کے بعد انھیں نہ صرف قید میں ڈال دیا، بلکہ طرح طرح کی اذیتیں بھی پہنچائیں۔

جب عام معافی کا اعلان ہوا اور لوگوں نے دوبارہ آکر دہلی میں آباد ہونا شروع کیا، حکیم میر اشرف علی خاں کو بھی قید و بند سے رہائی مل گئی۔ وہ دہلی میں عسرت کی زندگی گزارنے لگے۔ آخری عمر میں پانی پت چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ غالباً مجروحؔ نے ان کے انتقال پر قطعہ تاریخ کہا تھا۔ اب ذہن سے محو ہو گیا ہے۔

(حاشیہ نادرات غالب ص ۱۳۹)

پیارے لال آشوب

پیارے لال آشوب کے خاندان کا سلسلہ دربار اکبری کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل تک پہنچتا ہے۔ اُن کے آباؤ اجداد میں رائے بال مکند اور رائے سیتا رام نے مرہٹوں کے عہدِ اقتدار میں زبردست ترقی کی اور مناصب جلیلہ پر فائز ہوئے۔

پیارے لال آشوب کا سال ولادت ۱۲۴۸ھ ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد قدیم دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ ماسٹر رام چندر اور مولانا صہبائی سے ریاضی اور فارسی پڑھی بعد ازاں محکمہ تعلیم کو اپنے لئے انتخاب کر کے گوڑگاؤں کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ ان کے بھتیجے لالہ سری رام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں پیارے لال آشوب گوڑگاؤں میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر کیو ا ن کا تبادلہ ہو گیا، جس پر شہریوں کی ایک کمیٹی کی جانب سے تجویز ہوئی کہ ان کو الوداعی تقریب میں بطور یادگار چاندی کا شمعدان

پیش کیا جائے۔ قلمدان پر شعر کندہ کرانے کا مرحلہ آیا تو پیارے لال آشوب نے غالب کے ایک دوست کو اپنے ساتھ لیا اور ان کی خدمت میں جا پہنچے۔ غالب نے عرض مدعا پر مندرجہ ذیل قطعہ لکھ کر ان کے حوالے کیا۔

گوڑگاؤں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم
عاشق ہے اپنے حاکم عادل کے نام کی
سو یہ نظر فریب قلمدان نذر ہے
مسٹر کیوان صاحب عالی مقام کی

یہ واقعہ پیارے لال آشوب اور غالب کے تعلقات کی ابتدا تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد پیارے لال آشوب کا تبادلہ ہو گیا اور وہ دہلی کے نارمل اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو کر آ گئے۔ اس اثنا میں ان کی غالب سے روز ملاقات ہونے لگی۔ غالب ان سے اپنی پنشن وغیرہ کے معاملات کے بارے میں انگریزی میں سوداشتیں لکھواتے اور انگریزوں کی خدمت میں روانہ کرتے رہے۔ اسی دوران پیارے لال آشوب کی مساعی سے دہلی سوسائٹی کے نام سے ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ وہ جب اس سے الگ ہو کر ۱۸۶۴ء میں پنجاب کے سرکاری کتاب گھر کے ناظم ہو کر لاہور جانے لگے تو عمائدین شہر میں مرزا الٰہی بخش، نارائن داس گڑوالا، شہاب الدین احمد خاں، نواب نجف خاں، چھنامل، پنڈت شیام لال، مسٹر کوک پرنسپل دہلی کالج، مرزا سلیمان شاہ، صاحب سنگھ اور دوسرے لوگوں کی جانب سے سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اس سپاسنامہ پر غالب نے بھی اپنے دستخط اور مہر کے ساتھ یہ جملے تحریر کر دئے:

"فقیر اسد اللہ خاں غالب کہتا ہے کہ جو بابو پیارے لال کی مفارقت کا غم و اندوہ ہوا ہے، وہ میرا جی جانتا ہے۔ بس اب میں نے جانا کہ میرا دلّی میں کوئی نہیں"

ماسٹر پیارے لال آشوب کے قیام لاہور کے زمانے میں میجر فلر پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ ان کے حسب حکم ماسٹر پیارے لال آشوب نے غالب سے بھی طلبہ کے لیے فارسی زبان کے صرف کے قواعد تحریر کرنے کی درخواست کی، اس درخواست پر غالب نے دو مختصر رسالے نکاتِ غالب اور رقعاتِ غالب مرتب کیے، اوّل الذکر قواعد زبان فارسی سے عبارت ہے جو اردو میں لکھا گیا۔ دوسرے میں پندرہ خط ہیں جو پنج آہنگ کے آہنگ پنجم سے انتخاب کیے گئے۔

پیارے لال آشوب نے ایک اندازہ کے مطابق سولہ سال کا طویل عرصہ پنجاب میں گذارا۔ اس اثنا میں ان کی کشش خواجہ الطاف حسین حالی، مرزا اشرف بیگ خاں اشرف، مولوی امو جان علی، منشی درگا پرشاد نادر، مولوی سید احمد، مرزا ارشد گورگانی، خواجہ سجاد حسین اور دوسرے بہت سارے ادیبوں اور شاعروں کو دہلی سے لاہور کھینچ لائی اس دوران انھوں نے قصص ہند، رسوم ہند، تاریخ انگلستان، دربار قیصری اور رسالہ اتالیق پنجاب کے لیے متعدد مضامین لکھے جس پر ان کو رائے چند بہادر کا خطاب دیا گیا

پنجاب کے سرکاری کتاب گھر کے بند ہو جانے پر پیارے لال آشوب کو انسپکٹر آف اسکولز بنا دیا گیا۔ اس طرح وہ پہلے ہندوستانی تھے جس کو یہ خدمت تفویض کی گئی ۱۸۹۵ء میں انھوں نے پنشن پر الگ ہونے کے بعد دہلی کا قصد کیا اور بقیہ عمر دہلی میں گزاری۔

برج موہن دتاتریہ کیفی نے ان کی تاریخ وفات ۲۸ مئی ۱۹۱۴ء بتائی ہے۔

لالہ سری رام نے اپنے تذکرہ میں ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے۔ ذیل میں ان کے چند اشعار درج کیے جا رہے ہیں:

گر شیخ پاک دامن طالب نہ ہو ریا کا
رندوں کی محفلوں میں اس کا اٹھے نہ خاکا

پتھر پہ شکل شیریں فرہاد نے بنائی
اور ہم نے اپنے دل پر کھینچا ہے تیرا خاکا

اپنا تو سر جھکے ہے دونوں طرف کہ اس کی
تصویر میکدہ میں ہے اور حرم میں خاکا

مجنوں کو ہم نے مانند خاک دیکھا گویا کہ وہ ہماری تصویر کا ہے خاکا

زاہد چھوٹے جو دامنِ رندانِ بادہ کش تو چاہیے کہ مے سے اسے شست و شو کریں

(خمخانۂ جاوید جلد اول ، ذکرِ غالب ص ۲۱۵

دلّی کالج اردو میگزین "قدیم دہلی کالج نمبر ۱۹۵۳ء" ص ۲۹

ادبی خطوطِ غالب ص ۲۰۳ تا ص ۲۰۴)

میر امداد علی آشوب

میر امداد علی آشوب، میر روشن علی فروغ کے بیٹے اور میر اکبر علی کے پوتے تھے، جن کے بزرگوں کو مغل حکمرانوں نے خانی کا خطاب دیا تھا۔ میر امداد علی آشوب نے اپنے والد کی طرح اپنا کلام میر نظام الدین ممنون کو دکھایا اور ان ہی سے اصلاح لی۔ قادر بخش صابر نے ان کو خوش اخلاق، پاک طینت اور صاف ضمیر بتاتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ وہ دوست اور دشمن کے ساتھ ایک ہی وضع سے بسر کرتے ہیں۔ شیفتہ کے بیان کے مطابق ان کو ہر مشاعرہ میں شریک ہونے اور طرحی غزل کہنے کا شوق تھا۔

میر امداد علی آشوب کی غالب اور شیفتہ سے دوستی تھی۔ وہ میر مہدی مجروح، میر سرفراز حسین اور میر اشرف علی سے بھی ارتباط رکھتے تھے۔ ان کا جواں سال بیٹا محمد میر مر گیا تو غالب نے میر مہدی مجروح کو لکھا:

"بے چارہ منشی میر احمد حسین کا بھتیجا، یعنی میر امداد علی آشوب کا لڑکا محمد میر شب گذشتہ گذر گیا۔ آج صبح کو اس کو دفن کر آئے، جوان صالح، پرہیز گار اور مومنین کا پیش نماز تھا، اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔"

اسی کے ساتھ میر مہدی مجروح کو یہ بھی تاکید کی کہ وہ اس سانحہ کی اطلاع میر اشرف علی کو بھی دیں اور ان سے کہیں کہ اگر ان میں راہ و رسم تعزیت ہو تو میر احمد حسین کو خط لکھیں

میر امداد علی آشوب نے فن سخن میں اپنے استاد کی مکمل تقلید کی اور ان کے رنگ کو اس طرح اپنایا کہ لوگوں کو ان کے کلام پر ان کے استاد کے کلام کا شبہ ہوتا ہے۔ مختلف تذکروں میں ان کا جتنا کچھ کلام ملتا ہے اس کا مختصر تر انتخاب یہ ہے :

پاس آلودگی - دامن قاتل نہ گیا　　کس قدر ذوق تپیدن سے پریشاں ہوں میں
دل کہیں دیدہ کہیں صبر کہیں تاب کہیں　　ہائے کتنا شب ہجراں میں پریشان ہوں میں

پوچھا جو میں نے یار سے انجام سوز عشق　　شوخی سے شب چراغ کو اس نے بجھا دیا

گنہ کے بوجھ سے محشر تلک پہنچ نہ سکے　　اسی میں پردہ رہا ہم گنہگاروں کا !

عذر جفا کے کب تلک تم کرو ہم گلا کریں　　وصل کی رات کم رہی آؤ معاملہ کریں،

(گلشن بے خار ص۱۲ ، سخن شعراء ص۳۲ ص۳۶۶
گلستان سخن اول ص۲۳۵　　عود ہندی ص۲۴۹

طبقات الشعرائے ہند ص۵)

سیّد اعظم علی اکبرآبادی

سیّد اعظم علی اکبرآبادی، مولوی ببر علی کے صاحبزادے اور مثنوی مولانا روم کے شارح ملا محمد کے نواسے تھے، انھوں نے تمام تر تعلیم اپنے نانا ہی کے سایۂ عاطفت

یں پائی، اس کے بعد تحصیل مین پوری میں لگان کے حصول پر مامور ہوتے - اسی
دوران آگرہ کالج میں فارسی مدرس کی ایک آسامی خالی ہوتی - لگان کے حصول کا
کام ان کی طبیعت کے منافی تھا، انھوں نے جلد ہی اس سے گلو خلاصی کی اور آگرہ
آکر آگرہ کالج میں فارسی کے مدرس ہو گئے -

سید اعظم علی اکبرآبادی نے ۱۸۰۵ء میں سکندر نامہ کا اردو ترجمہ کیا ہے اسوقت
غالب کی عمر صرف نو سال کی تھی - غالب کا ایک فارسی خط پنج آہنگ میں ان کے نام
درج ہے، جس میں بڑی عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے - اس سے بعض لوگ شبہہ کرتے
ہیں کہ غالب نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی تھی، یہ تو ممکن ہے کہ غالب نے
شاگرد نہ ہونے کے باوجود ان سے کسب علم کیا ہو لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ ان کے
باقاعدہ شاگرد رہے ہوں - البتہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ غالب
کے سید اعظم علی اکبرآبادی اور ان کے اہل خاندان سے تعلقات ہمسائگی پر مبنی تھے کیونکہ
جس محلہ میں غالب کا قیام تھا اسی محلہ میں سید اعظم علی اکبرآبادی اور ان کے اہل
خاندان رہتے تھے -

سید اعظم علی اکبرآبادی کو اردو کے ابتدائی نثر نگاروں میں بعض وجوہ سے
انتہائی اہمیت حاصل ہے - انھوں نے ۱۸۲۴ء میں فسانہ سرور افزا اردو میں لکھا -
اسی طرح ۱۸۳۵ء میں ایک فارسی مثنوی اکسیر اعظم کے عنوان سے کہی تھی -

(کلیات نثر غالب ص۱۰۲، ص۱۰۳، داستان نثر اردو ص۱۸۲
سیر المصنفین ص۲۱۰)

معتمد الدولہ آغا میر

غالب نے کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ میں بھی قیام کیا تھا - ان کو غازی الدین حیدر

ے اُ ، راُنھیں مناسب رقم مل جائے گی۔ اس کے پیش نظر انھوں نے نائب سلطنت اودھ معتمد الدولہ آغا میر کی مدح میں ایک نثر بصفت تعطیل لکھی اور ایک غزل میں یہ اشعار بھی شامل کر دیے: ——

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی　　ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
طاقت رنج سفر ہی نہیں پاتے اتنا　　ہجر یاران وطن کا بھی الم ہے ہم کو
لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید　　جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

اس کے باوجود غالب کی معتمد الدولہ آغا میر سے ملاقات نہیں ہو سکی، اس میں غالب کی وضعداری کو زیادہ دخل تھا۔ انھوں نے یہ شرط لگادی تھی کہ معتمد الدولہ آغا میر کھڑے ہو کر انکی پذیرائی کریں گے اور انھیں نقد نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے گا۔ معتمد الدولہ آغا میر اس حد تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔

معتمد الدولہ آغا میر کا نام سید محمد خاں تھا۔ ان کے والد میر تقی، شاہ ترکمان کی اولاد میں ہونے کے علاوہ اصلاً کشمیری تھے، آغا میر نے اپنے دور اقتدار کی ابتدا غازی الدین حیدر کے ایام صاحبزادگی میں ان کے یہاں پیش دستوں میں ملازم ہو کر کی۔ نواب سعادت علی خاں کے انتقال پر مسند نشینی کا مسئلہ پیدا ہوا تو آغا میر نے غازی الدین حیدر کو برسر اقتدار لانے میں ان کی حد درجہ اعانت کی اور انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ غازی الدین حیدر کو مسند نشین تسلیم کریں۔ اس کے صلہ میں ان کو معتمد الدولہ مختار الملک ضیغم جنگ بہادر کے خطابات کے علاوہ اودھ کی نیابت بھی ملی۔ اس کے تین سال بعد ہی ۱۲۳۶ھ میں آغا میر کے زوال کی صورت پیدا ہو گئی اور غازی الدین حیدر نے بعض واقعات و شبہات کی بنا پر انھیں معزول کر کے حراست میں لے لیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کے گھر کی ایک ایک چیز نیلام ہو گئی۔ دریں اثنا، انگریز والئ اودھ کو دہلی کی اطاعت سے آزاد کرانے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لئے انھوں نے آغا میر کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ ان ہی کی تجویز کے مطابق غازی الدین

حیدر نے اپنے بادشاہ بننے اور ان کے نائب مقرر کئے جانے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت سے غازی الدین حیدر کے انتقال تک آغا میر کا دور دورہ رہا۔ انھوں نے اس دوران غازی الدین حیدر کو بھنگ کے نشہ کا خوگر بنا کر تمام امورِ حکومت سے اسے نہ صرف غافل کر دیا بلکہ اس کے تمام اختیارات بھی خود ہی سنبھال لئے۔ غازی الدین حیدر کے انتقال پر نصیر الدین حیدر نے جلوس کیا اور اس کے چند ہی ماہ بعد آغا میر کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے درپردہ کوششیں شروع کر دیں۔ بالآخر وہ وقت بھی آ گیا کہ آغا میر معتوب ہو گئے۔ ان کے مکانوں پر بادشاہی پہرہ لگا دیا گیا اور حساب فہمی کی کوششیں کی جانے لگیں۔ اس دوران انگریزوں نے آغا میر کو اپنی حفاظت میں لے لیا، اس کی وجہ سے شاہی عمال ان کو کسی بھی قسم کی کوئی گزند نہیں پہنچا سکے۔ اس واقعہ کے دو سال بعد ۱۸۳۰ء میں انگریزوں نے ان کو اور ان کے اہلِ خاندان کو اپنی حفاظت میں تمام مال و اسباب اور سازوں کے ساتھ کانپور پہنچا دیا جہاں وہ ۱۸۳۳ء میں فوت ہوئے۔

(حیاتِ غالب ص۳۷، یادگارِ غالب ص۳۵
تاریخ اودھ سوم ص۱۱۹، ۱۱۹، ص۱۳۶، ص۱۳۹
کلیاتِ نثرِ غالب ص۶۵، ص۱۵۶)

مرزا افضل بیگ

مرزا جیون بیگ غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ کے ساتھ بدخشاں سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے صاحبزادوں میں مرزا اکبر بیگ اور مرزا افضل بیگ کے نام معلوم ہوئے ہیں۔ مرزا افضل بیگ قلعہ معلّٰی میں بہت رسوخ رکھتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی نے ان کو اپنا سفیر بنا کر گورنر جنرل کے پاس کلکتہ بھیجا تھا۔ جن دنوں غالب اپنی پنشن کے مقدمہ کے سلسلے میں کلکتہ پہنچے تھے، مرزا افضل بیگ کا قیام کلکتہ ہی میں تھا۔

غالب کی پنشن کے مقدمہ کی وجہ سے ان کے بھانجے خواجہ امان اور خواجہ جان متاثر ہوئے تھے۔ اس لئے انھوں نے غالب کی درپردہ مخالفت شروع کی۔ غالب نے اپنے مقدمہ کی ناکامیوں اور مشکلوں کا اصل ذمہ دار مرزا افضل بیگ کو قرار دیا ہے۔

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دہلی واپس ہونے کے چند ہی دنوں بعد مرزا افضل بیگ نے بھی دہلی کا قصد کیا اور کھانسی اور بخار میں مبتلا ہوگئے اسی دوران ان کو اکبر شاہ ثانی کے دربار سے مقرب الدولہ معزز الملک دلاور جنگ کا خطاب دیا گیا۔ اس خطاب کی حصول کے بعد انھوں نے غالب سے ان کے مکان پہنچ کر ملاقات کی۔ غالب نے ان کو "برادر ریا پیشہ و کج اندیشہ" بتایا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ان کو پنشن کے معاملہ میں ایک لفظ تک نہیں بتایا —— یہی مرزا افضل بیگ اردو کے مشہور انشا پرداز مرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا تھے۔

(متفرقات غالب ص۱۰۰-۱۰۱ ، کلیات نثر غالب ص۱۳۱
ذکر غالب ص۲۵ ص۲۶)

میر افضل علی عرف میرن

غالب نے میر مہدی مجروح کے نام جتنے خط لکھے ہیں، ان میں سے چند میں میر افضل علی عرف میرن کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں وہ مکتوب الیہ کی بجائے براہ راست میر افضل علی عرف میرن سے مخاطب ہوگئے ہیں، جس سے پہلی نظر میں شبہ ہوتا ہے کہ یہ خط میر مہدی مجروح کے نام نہیں میر افضل علی عرف میرن کے نام لکھا گیا ہے۔ ایک خط میں ان کو یوسف ہند میر افضل علی بھی کہا ہے۔

میر افضل علی عرف میرن بچپن میں یتیم ہوگئے تھے۔ ایک شہزادہ نے اپنے بیٹوں کی طرح ان کی پرورش کی، اسی دوران انھوں نے گانے بجانے میں نام نکالا اور اپنے گود

کے استادوں سے مرثیہ خوانی کی ایسی مشق بہم پہنچائی کی خود بھی استاد سمجھے جانے لگے، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں دلی میں قتلِ عام شروع کیا اور شہزادوں، امیروں اور رئیسوں کے علاوہ شہریوں پر بھی مصیبتیں ٹوٹنے لگیں تو میر افضل علی عرف میرن کے سامنے فرار کے علاوہ کوئی صورت نہیں تھی - وہ پانی پت جا کر روپوش ہو گئے - حالات معمول پر آنے کے بعد الور جا کر راجہ شیو دھان سنگھ کی ملازمت اختیار کر لی، وہاں سے پٹودی پہنچ کر نواب پٹودی کے مصاحب بن گئے، یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا، جس پر دوبارہ دلی کا قصد کیا - اس وقت امرا کی حالتِ مالی اتنی سقیم ہو گئی تھی انھوں نے عزا خانوں کے اخراجات بڑی حد تک کم کر دیئے تھے، جس کے نتیجہ میں میر افضل علی عرف میرن کا متاثر ہونا یقینی تھا

غالب نے میر افضل علی عرف میرن کی پریشان روزگاری دیکھی تو انھیں علی بخش خاں خانساماں کے نام تعارفی خط دے کر رام پور بھیجا تاکہ محرم میں جہاں پانچ دس مرثیہ خواں اور مقرر ہوتے ہیں، وہ بھی مقرر ہو جائیں، میر افضل علی عرف میرن نے رام پور پہنچ کر علی بخش خانساماں سے ملاقات کی - ان کو غالب [illegible] یا - لیکن ملازمت نہیں مل سکی آمد و رفت میں اتنا سو روپے کا نقصان ہو گیا - ناچار پھر دلی آئے، کچھ دنوں بعد، نواب سعید الدین احمد خاں طالب دہلوی نے سرپرستی کی - اسی دوران نواب محسن الملک کے عم زاد سید علی حسن نے ان کو حیدرآباد بلا کر نواب وقار الامراء سے ملا دیا - وقار الامراء نے ان کی بڑی قدر کی اور ان کے لیے سالانہ پانچسو روپے مقرر کر دیے - مولوی عبدالحق کے بیان کے مطابق میر افضل علی عرف میرن کی صاحبزادی کی شادی عبدالرؤف بیرسٹر سے ہوئی تھی، یہی بیرسٹر عبدالرؤف بیرسٹر آصف علی کے والد تھے

(مکاتیب غالب ص ۴۴ ص ۴۳ ، اردو جولائی ۱۹۳۷ء

خطوط غالب ص ۲۴۲ ص ۳۴۰)

مرزا اکبر بیگ

غالب کی حقیقی بڑی بہن چھوٹی خانم کی شادی مرزا جیون بیگ کے صاحبزادے مرزا اکبر بیگ سے ہوئی تھی جو حضرت سرخ پوش بدخشی کی اولاد میں قبیلہ برلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ مرزا اکبر بیگ کو سیاحت سے دلچسپی تھی۔ وہ عربی اور فارسی میں مزد فرید تھے۔ یہی نہیں بلکہ ان کو ریاضی، ہیئت، ہندسہ اور اسی قسم کے دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ رمل اور نجوم پر بھی مکمل عبور تھا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے دور دراز کے شہروں اور علاقوں کا بھی سفر کیا تھا۔

جن دنوں وہ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے گئے تھے۔ واپسی میں مصر کے راستہ اطالیہ کی سیاحت کی اور وہاں ایک عرصہ تک اس خیال سے مقیم رہے کہ ریاضیات کی تکمیل کرلیں، جب اس میں مہارت حاصل ہوگئی تو مغرب اقصیٰ کے شہروں کا مشاہدہ کرتے ہوئے حیدرآباد دکن کا قصد کیا۔ حیدرآباد دکن میں اس وقت مہاراجہ چندو لال شاداں کی علم دوستی اور فن نوازی کی بڑی دھوم تھی۔ دُور دُور کے علاقوں کے باکمال شعراء اور ادباء ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ مہاراجہ چندو لال شاداں نے ان کو نہ صرف اپنا مہمان رکھا بلکہ مناسب پذیرائی بھی کی۔

مرزا اکبر بیگ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ کسی ایک جگہ مستقل طور پر قیام کرسکیں، انھوں نے چند دنوں کے بعد مہاراجہ چندو لال شاداں سے رخصت کی اجازت چاہی اور دہلی آگئے۔ دہلی میں ان کا مکان شیش محل کے نام سے مشہور تھا۔ انھوں نے اس کے آگے ایک گھنٹہ گھر تعمیر کرایا۔ اس کے بعد پھر ایک مرتبہ سفر کی سوجھی اور دہلی سے نکل کر سیدھے لکھنؤ پہنچے۔

مرزا اکبر بیگ کی اولاد میں تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہوئی، صاحبزادوں

کے نام مرزا عاشور بیگ، مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ اور مرزا عباس بیگ تھے اور صاحبزادی کا نام امانی خانم تھا۔

(کارنامہ سروری صفحہ ۱۹، ذکر غالب ۲۳، ۲۴، ۲۵

رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۱ء)

اکبر علی خاں

غلام حسین خاں طباطبائی نے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات اپنی تالیف سیر المتاخرین میں پوری تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بزرگوں کا اصل وطن مدینہ طیبہ تھا جہاں سے انہوں نے مشہد مقدس کی طرف ہجرت کی اور وہاں چند سال قیام کیا۔ بعد میں دہلی چلے آئے۔

دہلی میں ۱۱۴۰ھ میں غلام حسین طباطبائی کی ولادت ہوئی، ان کے دو سال بعد ان کے بھائی سید علی نقی پیدا ہوئے۔ ابھی ان دونوں بھائیوں کی عمر پانچ اور تین سال کی تھی کہ ان کے خاندان کا ستارہ گردش میں آگیا ان کی دادی ناظم بنگالہ صہابت جنگ کی چچی تھیں۔ انہوں نے اپنے آبائی مکان کو فروخت کر دیا، اپنے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کو لے کر فرید آباد چلی گئیں جہاں نواب صہابت جنگ نے ان کی پرورش اور دیکھ بھال کا انتظام کیا۔ اس طرح غلام حسین خاں طباطبائی اور سید علی نقی کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت شاہانہ طریقہ پر ہوئی۔ بعد میں غلام حسین خاں طباطبائی نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کرلی۔ سید علی نقی کے مزید حالات کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ اکبر علی خاں طباطبائی ان ہی علی نقی کے صاحبزادے تھے۔

سید علی نقی ایک مذہبی آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے قیام بنگالہ کے دوران ہوگلی بندر کے قریب ایک امام باڑہ تعمیر کروایا تھا جہاں ہر سال پابندی کے ساتھ مراسم عزا ادا ہوتے تھے سید علی نقی کے انتقال پر اکبر علی خاں طباطبائی اس کے متولی تسلیم کئے گئے۔ جن دنوں

غالب باندہ کے راستہ کلکتہ آرہے تھے۔ مولوی محمد علی خاں صدر امین نے ان کے نام غالب کو ایک تعارفی خط دیا تھا۔ غالب کلکتہ پہنچنے کے دو روز بعد ہوگلی گئے اور اکبر خاں طباطبائی سے ملاقات کی۔ انہوں نے بڑی ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا۔ غالب ان سے حد درجہ متاثر ہوئے اور یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے کہ ایسا عالی پایہ اور صاحبِ دل امیر بنگال میں دوسرا نہیں ہوگا۔

اس زمانے میں اکبر علی خاں طباطبائی کو غالب کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ اپنے امام باڑہ کے مقدمہ میں الجھے ہوئے تھے۔ غالب نے لکھا ہے۔

"ان دنوں نواب اکبر علی خاں کو ہوگلی بندر کے حکام کے ساتھ امام باڑہ کی وقف شدہ زمینوں کے سلسلہ میں معارضہ نہیں مجادلہ درپیش ہے۔"

اس کے باوجود غالب نے دہلی کے رزیڈنٹ سر ایڈورڈ کولبروک کے میر منشی التفات حسین خاں کے نام نواب اکبر علی خاں کا سفارتی خط حاصل کیا اور اسے اپنے وکیل ہیرالال کو دہلی بھیجا جس پر کولبروک نے ان کے حق میں رپورٹ کلکتہ بھیج دی، جس میں ان کے دعوے کی تائید کی گئی تھی۔

(کلیات نثر ص۱۹۶، ص۱۰۰، ص۱۴۳، ص۱۹۸

سیر المتاخرین ص۱۰۵، ص۱۰۶)

مفتی محمد اکرام الدین

مولوی محمد اکرام الدین کا سلسلۂ نسب شیخ عبدالحق محدث دہلوی تک پہنچتا ہے، جن کے آباؤ اجداد میں سے آغا محمد نے بخارا سے ہجرت کی تھی اور علاء الدین خلجی کے عہدِ حکومت میں واردِ ہندوستان ہوئے تھے۔

مولوی محمد اکرام الدین کو اکبر شاہ ثانی کے عہد میں دہلی کا صدر امین مقرر کیا گیا تھا۔

وہ آخر وقت تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے۔ ان کی تاریخ انتقال ۲۲ر دسمبر ۴۸ ۱۸ء مطابق ۲۵ر محرم ۱۲۶۵ھ ہے۔ ان کا انتقال ہوا تو غالب نے میر احمد حسین میکش کو ان الفاظ میں اس کی اطلاع دی :

"مولوی محمد اکرام الدین کل بروز جمعہ ۲۵ر محرم ۱۲۶۵ھ مطابق ۲۲ر دسمبر ۱۸۴۸ء کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور حسرتوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لے گئے۔"

مولوی اکرام الدین جس علاقہ میں رہتے تھے، اس کو محلہ مفتیاں کہا جاتا ہے، انکے انتقال کے چند سال بعد ۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو شہزادہ ابوبکر نے بحالت نشہ اس کو لوٹ لیا اور ان کے صاحبزادے مفتی احسان الحق کے گھر کا تمام ساز و سامان اور زیورات چھین لئے۔ ان ہی مفتی احسان الحق کے صاحبزادے سیف الحق ادیب غالب کے شاگرد تھے

(۱۸۵۷ء کے اخبارات اور دستاویزیں صفحہ ۹۳ ،
سید باغ دودر صفحہ ۱۸۴ ، علمائے ہند صفحہ ۱۰۹ ،
تلامذہ غالب صفحہ ۲۹)

الگزینڈر اسکنر

غالب کو انگریزی شراب میں اولڈ ٹام اور کاس ٹیلین زیادہ پسند تھی۔ ۱۸۵۹ء میں اس کا حصول ناممکن ہوگیا اور وہ چور بازار میں فروخت ہونے لگی تو غالب کے لیے یہی طریقہ کار رہ گیا کہ وہ اپنے دوست اور شاگرد گوبند سہائے کو لکھیں اور آگرہ سے ان کے ذریعہ منگوائیں۔ آگرہ میں بھی اولڈ ٹام اور کاس ٹیلین مہنگی تھی۔ گوبند سہائے اس کے بھجوانے میں ناکام رہے جس پر الگزینڈر اسکنر نے غالب کے لئے نہ صرف اولڈ ٹام اور کاس ٹیلین کی فراہمی کا انتظام کیا بلکہ اس کی کئی بوتلیں بھی بطور تحفہ بھیجیں۔ غالب نے اس

سے شکریہ کے طور پر ان کی تعریف میں ایک طویل قطعہ لکھا ہے اس کے چند شعر یہ ہیں :

از دوست بہر بندہ رہی شیشہ ہائے مے !

از بندہ سوئے دوست بہر شیشہ یک سلام

سلطان شکوہ مسٹر الگزینڈر اسکنر

آں آسمان عز و شرف را مرتمام

از نام اوست جان ستم دیدہ را نشاط

در مدح اوست کلک ہنر پیشہ را خرام ۔

الگزینڈر اسکنر کے والد کرنل جیمس اسکنر نے کشمیری دروازہ کے اندرونی علاقہ میں اپنی کوٹھی تعمیر کرائی تھی، ۱۸۴۱ء میں بہ مقام ہانسی ان کا انتقال ہوگیا تو الگزینڈر اسکنر دہلی آکر اسی کوٹھی میں رہنے لگے ۔ اسی دوران ان کی نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر سے دوستی ہوگئی اور وہ ان کی وساطت سے غالب سے متعارف ہوئے ، جس کے نتیجہ میں ان کو اردو اور فارسی میں شعر کہنے کا شوق ہوا اور سکندر تخلص کرنے لگے ۱۸۶۹ء میں وہ دہلی سوسائٹی کے رکن بھی منتخب ہوگئے تھے ۔

مولوی بشیر الدین دہلوی نے لکھا ہے کہ الگزینڈر اسکنر کے خاندان کی اکثر عورتیں اسلام کی پابند تھیں ۔ ۱۸۸۱ء میں الگزینڈر اسکنر کی بیوی ایلس عرف سردار بہو کا ۴۲ سال کی عمر میں انتقال ہوا اور کرنل جیمس اسکنر کے تعمیر کردہ گرجا میں دفن ہوئیں تو ضیاء الدین احمد خاں نیر نے تین تین شعر کے دو قطعات رحلت فارسی اور اردو میں کہے جنھیں ان کی قبر پر کتبے کی صورت میں لگایا گیا ۔

(واقعات دار الحکومت دہلی جلد اول

صفحہ ۲۸۳ تا ۱۲۶ ، سید باغ دودر صفحہ ۲۳

خطوط غالب صفحہ ۶۹۲ صفحہ ۶۹۳)

مرزا الٰہی بخش

مرزا الٰہی بخش کا اصل نام مرزا ہدایت افزا تھا۔ وہ شاہ عالم بہادر شاہ اول کی چھٹی پشت میں تھے۔ کسی بھی مورخ نے ان کی تعریف نہیں کی ہے۔ لارڈ لارنس کے سوانح نگار نے ان کو دہلی کا ٹریٹر لکھا ہے۔ سانڈرس کے الفاظ میں "وہ فاتحوں کی ادنیٰ سی خوشنودی کے لیے اپنے باپ کو گرفتار کروا سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی حاتم زمانی بیگم کا نکاح شاہزادہ فخرالملک عرف مرزا فخرو سے کر دیا تھا۔ اس اعتبار سے وہ بہادر شاہ ظفر کے سمدھی ہو گئے تھے اور ان کو شاہی محل میں آمد و رفت کی اجازت مل گئی تھی۔ علاوہ ازیں ان کا اثر و رسوخ بھی بڑھ گیا تھا۔

۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا دارا بخت کا انتقال ہوا۔ زینت محل اپنے لڑکے جواں بخت کو ولی عہد دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس کے برعکس مرزا الٰہی بخش کی کوششوں سے انگریزوں نے ان کے داماد مرزا فخرو کو ولی عہد تسلیم کر لیا۔ مرزا فخرو ۱۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو انتقال کر گئے۔ اس دوران مرزا الٰہی بخش نے انگریزوں میں اعتماد پیدا کر لیا اور ان کو قلعہ میں ہونے والی ہر نئی تبدیلی کی اطلاع دینے لگے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کو ناکام بنانے میں انہوں نے جس وطن دشمنی اور خاندان فروشی سے کام لیا۔ اس کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ انہوں نے انگریزوں کی ایما پر بہادر شاہ ظفر اور ان کے شہزادوں کو گرفتار کروایا۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر کے قتل کی اصل ذمہ داری ان ہی پر عاید ہوتی ہے۔

انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے بعد مغلوں کا نام و نشان مٹا دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ قلعہ کے خاندان کا کوئی فرد بھی باقی رہے انہوں

نے مرزا الٰہی بخش جیسے خاندان فروش اور وطن دشمن کو دہلی میں دیکھنا نہیں چاہا۔ اور ان کو ہدایت کی کہ وہ دہلی سے کراچی بندر چلے جائیں۔ غالب نے لکھا ہے۔

"مرزا الٰہی بخش جو شہزادوں میں ہیں ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ وہ انکار کر رہے ہیں، دیکھئے کیا ہو۔"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"مرزا الٰہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پکڑی ہے، سلطان جی میں رہتے ہیں، عذر کر رہے ہیں، دیکھئے یہ جبر اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔"

کچھ دنوں کی کاسہ لیسی اور خوشامد کے بعد انگریزوں نے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کی اور ان کے کراچی بندر جانے کا حکم منسوخ کیا۔ وہ خاندانِ مغلیہ کے سربراہ تسلیم کئے گئے اور ان کی ذلیل خدمات کے صلہ میں یکم مئی ۱۸۵۷ء سے ان کو اور ان کے اہلِ خاندان کو بائیس ہزار آٹھ سو بتیس روپے کی سالانہ پنشن نسل در نسل عطا کی گئی۔ ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ نے شہنشاہِ ہند کا خطاب اختیار کرنے کے بعد اس پنشن میں اضافہ کر دیا۔ اس کے چند ہی دنوں بعد مرزا الٰہی بخش نے مرزا کوڑا کا بنایا ہوا رنگ محل خرید لیا اور اس میں رہنے لگے۔ ایک مرتبہ عید کے موقع پر انہوں نے چاہا کہ چار گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر عیدگاہ جائیں۔ ڈپٹی کمشنر کو معلوم ہوا تو اس نے چوب دار کو بھیج کر ممانعت کر دی اور کہا کہ یہ امتیاز قلعہ کے شاہزادوں کے ساتھ ختم ہو گیا ہے۔

مرزا الٰہی بخش نے ۱۸۷۵ء میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادہ سلیمان شکوہ ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ ۱۸۹۰ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا تو ثریا جاہ مغلوں کے بزرگ خاندان تسلیم کئے گئے، جن کے اہلِ خاندان میں

سے کچھ لوگ قیام پاکستان کے بعد لاہور آکر آباد ہو گئے ہیں۔

(واقعات دارالحکومت دہلی دوم ص۱۴۹، غالب ص۲۹۱

خطوط غالب ص۱۴۳،۱۸۱، نقش آزاد ص۳۰)

حکیم الٰہی بخش

حکیم الٰہی بخش سکندرہ کے ایک ایسے علم دوست خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو معاشی پریشانیوں اور بے سروسامانیوں سے دوچار تھا۔ جب سکندرہ میں معاش کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تو انھوں نے قدم گھر سے باہر نکالا اور مارہرہ جا پہنچے، مارہرہ میں ان کی ملاقات حضرت صاحب عالم مارہروی سے ہوئی۔ حکیم صاحب کو ان کے اخلاق وعادات نے حد درجہ متاثر کیا اور وہ ان کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے۔ حکیم صاحب کو مارہرہ میں بھی ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا، وہ حصول ملازمت میں ناکام ہونے کے بعد دہلی کی جانب روانہ ہوئے۔ صاحب عالم مارہروی غالبؔ کے لائق احترام شاگردوں میں سے تھے، حکیم صاحب دہلی جانے لگے تو انھوں نے غالبؔ کے نام ان سے متعلق ایک تعارفی خط بھی دیدیا۔

حکیم الٰہی بخش نے دہلی پہنچ کر غالباً غالبؔ کے مشورے سے حکیم امام الدین سے معزج القلوب پڑھنا شروع کی اور کچھ دنوں بعد طب میں بھی ملکہ حاصل کر لیا۔ اس کے باوجود ان کو ملازمت نہ ملنا تھی نہ ملی، ناچار انھوں نے سکندرہ لوٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ جس پر غالبؔ نے ان سے کہا کہ وہ علی گڑھ کول کے راستے لوٹیں، شاید وہاں ملازمت کی کوئی سبیل نکل آئے۔ دریں اثنا منشی نبی بخش حقیر سے بھی ان کی سفارش کی اور لکھ بھیجا:

"حکیم الٰہی بخش بہت خوب آدمی اور مہذب ہیں۔ حسن طبع بھی رکھتے ہیں یہاں ان کی نوکری کا کہیں اسلوب نہ ہوا اور زمانے نے مساعدت نہ کی، اب اپنے گھر جاتے ہیں، کول میں پہنچ کر آپ سے ملیں گے۔ ان کی توقیر کیجیے گا اور

اِن کو اپنا دوستِ دیرینہ تصوّر فرمایئے گا اور اس کا خیال آپ کو رہے کہ اس ضلع میں ٹھیکیدار اور مال گزار بہت ہیں اگر کسی کو خواہش طبیب کی ہو تو اِن کو اس سے بخوبی ملوا دیجئے گا۔"

(نادرات غالب ص۲۲ ،
حاشیہ نادرات غالب ص۹۳)

میر امام الدین

سر سید احمد خاں نے میر امام الدین کے خطِ نسخ کی تعریف کی ہے۔ وہ خطِ نسخ میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ ان کو بہادر شاہ کی بیگم امراؤ محل کی سرکار سے بھی وظیفہ ملتا تھا جس سے ان کے خاندان کی گذر بسر ہوتی تھی۔

جن دنوں میر احمد حسین میکش صدر امین اول کچہری کے دفتر میں وکیل تھے، میر امام الدین نے اپنی لڑکی اظفری بیگم کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا تھا۔ اس کے چند دنوں بعد امراؤ محل نے ان کو نوکری سے الگ کر دیا اور میر احمد حسین میکش بھی تلاشِ معاش میں بریلی، رام پور اور لکھنؤ کی طرف نکل گئے تو میر امام الدین پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ میر امام الدین نے اس دوران غالب سے رابطہ قائم کیا تاکہ وہ میر احمد حسین میکش کو اپنی بیوی بچوں کی خبرگیری کی جانب توجہ دلائیں۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امام الدین نے ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے بہرام پور میں سکونت اختیار کر لی تھی اور میر احمد حسین میکش نے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے دوران اپنی بیوی بچوں کو وہیں بھیج دیا تھا۔

(سبد باغ دو در ص۱۸۲ ، ۱۱۶-۱۲۵
مجاہد شعراء ص۲۶۳ ، تذکرہ اہل دہلی ص۲۵۳)

حکیم امام الدین

حکیم امام الدین پاک پٹن کے رہنے والے تھے جن کو اکبر شاہ ثانی نے اپنا طبیب مقرر کیا تھا۔ جب حکیم احسن اللہ بھی شاہی طبیبوں میں شامل کیے گئے تو حکیم امام الدین نے شاہی ملازمت ترک کر دی اور ۱۲۵۷ھ میں کپورتھلہ جا کر وہاں کے مہاراجہ رندھیر سنگھ کے مصاحبوں اور طبیبوں میں شامل ہو گئے۔ ۱۲۵۳ھ میں رندھیر سنگھ نے وفات پائی تو ایکبار پھر حکیم امام الدین کو دہلی آنا پڑا، انھوں نے دہلی میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد فرخ آباد کی راہ لی اور دربار فرخ آباد سے وابستہ ہو گئے۔

سرسید احمد خاں نے تذکرۂ اہل دہلی میں حکیم امام الدین کے فضل و کمال اور علم و حکمت کی بڑی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے بزرگوں کو سرکار بادشاہی سے مناصب ارجمند اور مراتب بلند عطا ہوتے رہے ہیں۔ جب ۱۸۴۶ء میں ملکہ زینت محل بیمار ہوئیں اور دہلی کے حکیموں نے ان کے مرض کو لاعلاج اور تشویش ناک قرار دے کر علاج و معالجہ سے ہاتھ اٹھا لیا تو گورنر جنرل نے حکیم امام الدین کو ہدایت کی کہ وہ دہلی پہنچ کر ملکہ زینت محل کا علاج کریں۔ گورنر جنرل کی ہدایت کے مطابق یکم مئی کو حکیم امام الدین قلعہ معلیٰ میں داخل ہوئے، ابھی ملکہ زینت محل کا علاج جاری تھا کہ ادھر نواب فرخ آباد پر بیماری نے حملہ کر دیا جس پر انھوں نے بہادر شاہ ظفر سے درخواست کی کہ وہ حکیم امام الدین کو رخصت کر دیں۔ بہادر شاہ ظفر نے اس درخواست کو مسترد کر دیا اور اطلاع دی کہ حکیم امام الدین ان دنوں ملکہ زینت محل کا علاج کر رہے ہیں، اس لیے ممکن نہیں ہے کہ ان کو رخصت کی اجازت دی جائے۔ ۲۲ر مئی تک ملکہ زینت محل صحت یاب ہو گئیں، اس کے چند روز بعد حکیم امام الدین کو رخصت کر دیا گیا۔ نادرات غالب کے مؤلف نے یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی ہے کہ حکیم امام الدین کو شاہی طبیبوں میں شامل کر لیا گیا تھا

لیکن سرسید احمد خاں کے مطابق وہ حضرت جہاں بانی کی طرف سے عہدۂ طبابت پر مامور ہوئے تھے۔

غالب نے اپنے بعض خطوط میں حکیم امام الدین کا ذکر کیا ہے، وہ ان کے عقیدتمند ہونے کے علاوہ ان کی قوت تشخیص کے بھی قائل تھے۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ابتدا میں غالب نے علاج معالجہ کے سلسلہ میں ان ہی سے رجوع کیا، لیکن قلعۂ معلی سے تعلق ہونے کے بعد حکیم احسن اللہ خاں سے مشورہ کرنے لگے۔

حکیم امام الدین ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران فرخ آباد میں تھے، جب وہاں کے نوابوں پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹا اور وہ یکے بعد دیگرے قتل کر دئے گئے یا جلاوطن ہو گئے تو حکیم امام الدین نے ٹونک کا قصد کیا اور ۱۸۶۲ء سے لے کر ۱۸۸۱ء تک وہیں رہے نواب ضیاء الدین خاں نیر نے ان کے انتقال پر قطعۂ تاریخ کہا جس کے اس شعر سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے۔

در جنت چوں امام الدین حسان!

تاریخ وفات ہم ازاں گشت عیاں

(تذکرہ اہل دہلی ص۶۶، حواشی نادرات غالب ص۹۳ ص۹۵
ابنائے عہد مغلیہ ص۳۴ ص۵۵)

خواجہ امان

خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان بوستان خیال کے مترجم کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں ان کے والد خواجہ حاجی کو اچھے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق خواجہ حاجی کا باپ ان کے دادا مرزا قوقان بیگ کا ساتھیس تھا جس کو پانچ روپے ماہانہ معاوضہ کے طور پر دیئے جاتے تھے۔

خواجہ امان کا سال ولادت ۱۸۱۷ء ہے۔ ترکی، فارسی اور اردو ان کے گھر کی زبان تھی، اس لئے ان کو اس سلسلے میں کسی کا دست نگر نہیں ہونا پڑا۔ جو کمی رہ گئی تھی وہ حکیم مومن خاں مومن اور غالب کی صحبتوں سے پوری ہو گئی۔

خواجہ امان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کی جانب سے ملنے والے وظیفہ پر عیش و عشرت اور آرام کی زندگی گزار سکیں، انھوں نے تلاش روزگار میں دہلی سے باہر قدم نکالا اور الور پہنچ کر راجہ شیودھان سنگھ کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ راجہ شیودھان سنگھ نے ان کی بڑی قدر دانی کی اور ان کو بوستان خیال کے ترجمے کا کام پر مامور کیا۔ خواجہ امان بوستان خیال کی پندرہ جلدوں کا ترجمہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ترجمہ کا آغاز کب کیا۔ لیکن اغلب ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ترجمہ کا کام شروع کر چکے تھے۔

بوستان خیال کی پہلی جلد حدائق انظار کے نام سے دہلی کے اکمل المطابع سے ۱۲۹۲ھ میں شائع ہوئی تو اس کا دیباچہ غالب نے لکھا۔ اس میں خواجہ امان کو "بھتیجا اور پیارا بھتیجا" ظاہر کرتے ہوئے ان کی بڑی تعریف کی۔ اس دیباچہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ امان نے موسیقی اور مصوری میں کمال حاصل کیا اور ان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ غالب نے اس دیباچہ کی اطلاع غلام غوث خاں بے خبر کو ان الفاظ میں دی ہے:

> "میرے ایک رشتہ کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورق بہ صورت پارسل بلکہ بہ حیثیت خط بھیجتا ہوں"

بوستان خیال کی دوسری جلد بدر الدجیٰ پریس سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے اس کی پانچ جلدیں ۱۸۷۶ء تک شائع ہوئیں۔ چھٹی جلد چھپنے کے لیے پریس جا رہی تھی کہ خواجہ امان کو اس بات کا علم ہوا کہ ساتویں جلد کے ترجمہ کا مسودہ کسی نے چرا

لیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے ساتویں جلد کے ترجمہ کا کام ازسرِ نو شروع کر دیا۔ ابھی اس پر نظرِ ثانی بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ان کا وقت آگیا اور وہ ۱۸۷۹ء میں راہیِ عالم ہوئے۔

(سید المصنفین صفحہ ۲۷، داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۶۵

تلامذۂ غالب صفحہ ۱۱۲، خود ہندی صفحہ ۴۳۵ تا ۴۳۸)

امجد علی شاہ

امجد علی شاہ، نواب سعادت علی خاں کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوئے تھے ان کا سالِ ولادت ۱۲۱۵ھ ہے غازی الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں نواب حسین الدین خاں کی صاحبزادی تاج آرا بیگم سے ان کا نکاح انتہائی شان و شوکت کے ساتھ کیا گیا۔ ان کے والد محمد علی شاہ نے ان کو اپنا ولی عہد مقرر کرتے وقت نجم الدولہ ابوالمظفر ثریا جاہ سپہر شکوہ صاحب عالم ولی عہد مرزا امجد علی شاہ بہادر" خطاب دیا تھا۔ وہ محمد علی شاہ کے انتقال کے بعد ۵ ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ کو ۴۳ سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے تھے۔

امجد علی شاہ مذہبی قسم کے حکمراں تھے۔ انہوں نے مجتہد کی تحریک پر شراب نوشی پر مکمل پابندی عائد کر دی تھی، عدالت کے تمام فرائض سلطان العلماً اور سید العلماً انجام دینے لگے تھے۔ ان ہی کی تجاویز اور تحقیقات کے مطابق مقدمات کا فیصلہ ہوتا اور اس پر عملدرآمد ہوتا تھا۔ کلیاتِ نظم غالب فارسی میں "در مدح جہاں پناہ امجد علی شاہ اورنگ نشین اودھ دام ملکہ" کے عنوان سے ۶۵ شعروں کا ایک قصیدہ شامل ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اسے غالب نے امجد علی شاہ کے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے ایک دوست نوروز علی خاں کی وساطت سے ان کی خدمت میں روانہ کیا تھا، اس کے چند شعر یہ ہیں:

شادم کہ گردشی بہ سزا کرد روزگار　　　بے بادہ کام عیش روا کرد روزگار

تارِ بساطِ ریخت انبساط را | چوں تار ساز نغمہ سرا کرد روزگار
زاں او زعنق مست تراز مست باشراب | مارا مجل زمشرب ماکرد روزگار
ایں از ہجوم لالہ وآں دیگر از شفق | رنگیں بساط ارض وسما کرد روزگار
در برگ ریز تشنہ لبانِ نبات را | شاداب فیض نشو ونما کرد روزگار

امجد علی شاہ کو زیادہ دنوں حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا۔ آخر عمر میں وہ سرطان کا شکار ہو گئے تھے۔ اسی میں کئی دنوں تک مبتلا رہنے کے بعد انہوں نے ۲۹ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو انتقال کیا۔ اپنے انتقال سے پہلے انہوں نے نیٹڈ دخاں رسالدار کی چھاؤنی میں دفن کئے جانے کی وصیت کی تھی چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین عمل میں آئی۔ بعد ازاں واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپے کے خرچ سے ان کا مقبرہ اور امام باڑہ تعمیر کرادیا جسے اب سبطین آباد کہتے ہیں۔

غالب کو امجد علی شاہ سے قصیدہ کا صلہ ملنے کی توقع تھی اور وہ خیال کرتے تھے کہ ان کے دوست نوروز علی خاں اس سلسلہ میں ضرور سلسلہ جنبانی کریں گے لیکن جب غالب کو امجد علی شاہ کے انتقال کا حال معلوم ہوا تو انہیں بڑی ناامیدی ہوئی انہوں نے اسی ناامیدی کے عالم میں منشی جواہر سنگھ جوہر کو ایک خط لکھا اور اس واقعہ کی اطلاع ان الفاظ میں دی۔

"لکھنؤ کا اب اور عالم ہے جس بادشاہ یعنی امجد علی شاہ کی میں مدح گوئی کرتا تھا اور میرے ایک دوست اعتقاد الدولہ نوروز علی خاں کو ان تک رسائی تھی۔ اس کی اچانک وفات ہو گئی۔ ان کا بیٹا واجد علی شاہ جو اب تخت نشین ہوا ہے بدحواس اور بے تدبیر ہے۔"

(سبد باغ دودر صفحہ ۱۱۳، کلیاتِ غالب صفحہ ۱۲۳
تاریخ اودھ جلد ۲، صفحہ ۲۳، صفحہ ۱۰۲)

امراؤ بیگم

امراؤ بیگم، نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی اور نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کی بھتیجی تھیں، ابھی ان کی عمر گیارہ سال کی تھی کہ ان کو ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو غالب کے عقد میں دیدیا گیا۔ غالب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام ایک خط میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا، ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا"

امراؤ بیگم کے سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہ سکا جس پر امراؤ بیگم نے اپنے حقیقی بھانجے نواب زین العابدین خاں عارف کو اور ان کے انتقال کے بعد ان کے دو کمسن بیٹوں باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں کو متبنیٰ بنا لیا اور ان ہی سے اپنی بھیپن ماںتا کو تسکین دیتی رہیں۔

غالب آٹھ سو روپے کا قرض چھوڑ کر مرے تھے۔ ان کے مرتے ہی امراؤ بیگم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بیوگی کا غم، قرض خواہوں کے تقاضے، بچوں کی پریشانی، آمدنی کی مسدودی، یہ سب باتیں ایسی تھیں جن سے امراؤ بیگم کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ انھوں نے کمشنر دہلی کو درخواست دی کہ ان کے شوہر کی پنشن ان کے اور پسرِ متبنیٰ حسین علی خاں شاداں کے نام منتقل کر دی جائے، کمشنر نے ڈپٹی کمشنر کی ہمدردانہ رپورٹ کے باوجود اس درخواست کو مسترد کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ پسرِ متبنیٰ کو پنشن نہیں مل سکتی البتہ درخواست گذارہ کچہری میں حاضر ہو تو دس روپے تجویز کیے جا سکتے ہیں۔ امراؤ بیگم ایک معزز گھرانے کی باعزت خاتون تھیں، انھوں نے اپنے والد، چچا اور شوہر کے مرتبہ کا خیال کیا اور کچہری میں حاضر ہو کر پنشن

اس کی تجویز ٹھکرادی اور یکم اگست ۱۸۶۹ء کو نواب کلب علی خاں والی رام پور کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ آٹھ سو روپے شوہر کا قرض باقی ہے اس کی ادائگی کیلئے مالی امداد دی جائے۔ نواب کلب علی خاں کو اپنی عیش سامانیوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ اپنے استاد کی بیوہ کی درخواست پر ہمدردانہ غور کرتے۔ امراؤ بیگم نے ۲ر ستمبر ۱۸۶۹ء کو ایک اور عریضہ کے ذریعہ ان کی توجہ اپنی پریشانی کی طرف مبذول کرائی تو انھوں نے کسی قسم کی مالی امداد کرنے کی بجائے نواب مرزا داغ کو امراؤ بیگم کے حالات و واقعات کی تحقیق کا حکم دیا ——— یہ تحقیقات غالباً ۲۰ر اکتوبر ۱۸۶۹ء تک جاری رہی۔ اس کے بعد کہیں اس عریضہ پر حکم صادر ہوا کہ امراؤ بیگم کو چھ سو روپے کی ہنڈی بھیجی جائے۔ کتب خانہ رضائیہ میں ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ امراؤ بیگم کو چھ سو روپے کی ہنڈوی موصول ہوئی تھی ——— اس بنا پر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ کارروائی محض کاغذی تھی ——— امتیاز علی عرشی کا یہ کہنا محض قیاس آرائی پر مبنی ہے کہ "چھ سو روپے کی ہنڈوی رام کشن کی دکان سے حکیم غلام نجف خاں کی معرفت مرزا صاحب کی بیوی کو بھیجی گئی تھی" ——— مالک رام نے درست لکھا ہے کہ "یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ جب قرض آٹھ سو روپے کا تھا۔ مرزا غالب بھی اپنی زندگی میں اسی قسم کی درخواست کرتے رہے اور امراؤ بیگم نے بھی یہی رقم طلب کی گئی تو چھ سو روپے کیوں بھیجے گئے"

امراؤ بیگم نے نواب کلب علی خاں والی رام پور کو دوسری مرتبہ جو عریضہ ارسال کیا تھا اس میں اپنے بارے میں یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ میری زندگی اسی میعاد میں پوری ہوجائگی ان کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ معظم زمانی بیگم کے بیان کے مطابق امراؤ بیگم نے غالب کے برسی کے دن ۲ر ذیقعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۴ر فروری ۱۸۷۰ء کو دن کے گیارہ بجے انتقال کیا۔ ابھی ان کی تجہیز و تکفین کی تیاریاں کی جارہی تھیں کہ کچہری کے ملازم نے پنشن کا حکم لاکر دیا ——— جس کی آرزو لئے وہ دنیا سے رخصت ہوگئیں

(ذکر غالب ص ۱۴۳ ، مکاتیب غالب ص ۹۰ تا ۹۰

خطوط غالب ص ۶۹)

اموجان

امین اللہ خاں، اموجان کے نام سے مشہور تھے۔ غالب نے اپنے کئی خطوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے علوم درسیہ کی تکمیل کے بعد رزیڈنٹ دہلی کے دفتر میں ملازمت کرلی اور اس کے میر منشی ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ان کے انتظام و انصرام کا شہرہ دہلی سے نکل کر ریاست الور پہنچا تو وہاں کے مہاراجہ راؤ بنے سنگھ نے ان کو اپنے یہاں بلالیا اور سات سو روپیہ ماہوار پر عہدۂ دیوان پر ان کی تعیناتی عمل میں آئی

امین اللہ خاں نے ریاست الور کا دیوان مقرر ہونے کے بعد اپنے منجھلے بھائی منشی فضل اللہ خاں اور چھوٹے بھائی انعام اللہ خاں کو بھی بلالیا جو نائب دیوان اور میر بخشی بنائے گئے۔ مہاراجہ راؤ بنے سنگھ نے ۱۸۵۸ء میں جس وقت انتقال کیا اس کے لڑکے راجہ شیو دھان سنگھ کی عمر ایسی نہیں تھی کہ وہ ریاست کا نظم ونسق سنبھال سکے۔ مہاراجہ راؤ بنے سنگھ نے امین اللہ خاں کو بلا کر راجہ شیو دھان سنگھ کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور وصیت کی کہ وہ اس کے سن بلوغ تک ریاست کے مختار کار رہیں ۔ مہاراجہ راؤ بنے کے انتقال پر بعض ٹھاکروں کو اندیشہ پیدا ہو گیا کہ راجہ شیو دھان سنگھ، امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں کے زیر تربیت رہ کر مسلمان ہو جائے گا۔ اس بنا پر انہوں نے اپنی کثیر جمعیت کے ساتھ رات کے وقت امین اللہ خاں کے مکان پر چڑھائی کر دی اور دس افراد کو قتل کر دیا جن میں امین الدولہ کا بیٹا اور ایک خدمت گار بھی شامل تھا۔ امین اللہ خاں نے اصطبل کی دیوار سے کود کر اپنی جان بچائی۔ مہارانی اور راجہ شیو دھان سنگھ کو اس فساد کا علم ہوا تو انہوں نے ٹھاکریں

سے کہا کہ اگر امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں کا بال بھی بیکا ہوا تو ہم زہر کھا کر خود کو ہلاک کر لیں گے۔ جس پر ٹھاکروں نے قتل سے ہاتھ روک لیا اور امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں سے کہا کہ وہ اپنا مال واسباب لے کر ریاست الور سے نکل جائیں۔ غالب نے اس واقعہ پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے حکیم غلام نجف خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

"بعد قتل ہونے دس آدمیوں کے کہ وہ اس میں عزیز بھی تھے۔ یہ سب وہاں سے نکالے گئے مگر صورت نہیں معلوم کہ کیونکر نکلے، پیادہ یا سوار، تہی دست یا مال دار، مستورات کو تو رتھیں دے دی تھیں، ذکور کا حال کیا ہوا، پھر وہاں سے نکلنے کے بعد کیا ہوا، کہاں رہے اور کہاں رہیں گے"

کارنامہ سروری کے مولف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ شیودھان سنگھ کے حقیقی چچا راؤ سنگھ نے امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں کو بہ حفاظت تمام رخصت کیا اور ان کے ساتھ ہاتھی، اونٹ، پالکیاں اور بار برداری کے لئے چھکڑے بھی کر دیئے تاکہ ان کو سفر میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں نے ریاست الور سے نکلنے کے بعد دہلی کے ایک پہاڑی قصبہ شیدی پور میں قیام کیا۔

(خطوط غالب صـ ۲۸۳، کارنامہ سروری صـ ۱۴، صـ ۱۵، صـ ۱۶)

امیر احمد مینائی

امیر احمد مینائی ۱۶ شعبان ۱۲۴۴ھ کو نصیر الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی کرم احمد مینائی کو اکابرینِ شہر میں ایک ممتاز عالم اور پاک باطن صوفی خیال کیا جاتا تھا۔ وہ حضرت مخدوم شاہ مینائی کی اولاد میں سے تھے، امیر احمد مینائی نے ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی، پھر مفتی سعد اللہ اور ان کے ہمعصر علمائے فرنگی محل سے رجوع ہوئے۔ اسی زمانے میں شاعری کا بھی شوق ہوا لیکن اپنے والد کی نصیحت

پر اسے تحصیل علمی کے زمانے تک ملتوی کر دیا - بعد ازاں مظفر علی خاں اسیر کے تلامذہ میں شامل ہو کر واجد علی شاہ کے دربار تک پہنچے اور ۱۲۶۹ھ میں ارشاد السلطان اور ہدایت السلطان کے نام سے دو کتابیں لکھیں اور ان کو واجد علی شاہ کے حضور میں پیش کر کے خلعت فاخرہ اور انعام حاصل کیا۔

۱۲۷۱ھ میں واجد علی شاہ معزول ہو کر مٹیا برج چلے گئے - اس کے ایک ڈیڑھ سال بعد سعیِ انقلاب ناکامی پر منتج ہوئی اور لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کا شیرازہ بکھر گیا جس پر امیر احمد مینائی عارضی طور پر کاکوری چلے گئے اور کچھ عرصہ مشہور نعت گو محسن کاکوروی کے ساتھ گزارا - اس کے کچھ دنوں بعد دوستوں کے مجبور کرنے پر انگریزی سرکار میں ملازمت کا ارادہ کیا لیکن بعد میں رائے بدل دی اور ملتی ہوئی صدر امینی کو چھوڑ دیا۔

اس واقعہ سے کچھ عرصہ پہلے امیر احمد مینائی کے استاد مظفر علی خاں اسیر رام پور پہنچ چکے تھے - ان کی خواہش پر نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور نے ان کو بلا لیا - وہ رام پور پہنچنے کے بعد عدالت عالیہ کے منصب پر فائز کیے گئے - اسی زمانے میں وحید الزماں لکھنوی کی صاحبزادی ان کے نکاح میں آئیں۔

نواب یوسف علی خاں نے ۱۲۸۱ھ میں انتقال کیا - ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے، انھوں نے امیر احمد مینائی کی خاطر خواہ قدردانی کی اور ان کو اپنا استاد مقرر کیا اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کے ۴۲ سال رام پور میں گزارے

۱۹۰۰ء میں جب نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کلکتہ سے حیدر آباد واپس ہو رہے تھے، ان کا قیام بنارس میں بھی ہوا جہاں امیر احمد مینائی نے ان کی طلبی پر پہنچ کر ایک قصیدہ پیش کیا - وہ قصیدہ میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم نے نہ صرف پسند کیا بلکہ امیر احمد مینائی سے دکن آنے کی بھی خواہش کی، امیر احمد مینائی رام پور کی درباری ریشہ دوانیوں اور ملاقاتی سازشوں سے تنگ آ چکے تھے - انھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ۱۰ ار

جمادی الاول ۱۳۱۸ھ کو حیدرآباد پہنچے۔
ابھی سفر کی کسل مندی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ بیماری نے آن گھیرا۔ علالت کے زمانے میں داغ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مہاراجہ سرکشن پرشاد سب ہی ان کی عیادت کو جاتے اور اپنی نگرانی میں علاج کراتے رہے، لیکن مرض بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۲۰ر جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ کو خالق حقیقی سے جا ملے۔ امیر احمد مینائی کے انتقال کا سب سے زیادہ صدمہ داغ کو ہوا۔ انھوں نے ان کے انتقال پر تین تاریخیں نظم کیں:

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی   قصرِ عالی پائے جنت میں امیر

آج اس غم کی کہی تاریخ یہ   اب ہوا آہ دل پر داغِ امیر

مل گئی تاریخ دل سے داغ کے   آہ لطف شاعری جاتا رہا

امیر احمد مینائی کی تصانیف میں انتخاب یادگار، محامد خاتم النبیین، مراۃ الغیب، صنم خانۂ عشق اور امیر اللغات عام طور پر مل جاتی ہیں، البتہ ارشاد السلطان، ہدایت السلطان اور غیرتِ بہارستان کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ غالباً یہ زمانۂ غدر میں تلف ہو گئے۔
غالب اور امیر مینائی میں دوستانہ تعلقات تھے، ان کا آغاز رامپور میں ہوا ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غالب کے ایک شاگرد منشی شیونارائن آرام ایک رسالہ معیار الشعرا کے نام سے نکالتے تھے۔ امیر احمد مینائی نے بھی اپنا کلام اس میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس زمانے میں ان کی خاص شہرت نہیں تھی۔ منشی شیونارائن نے معیار الشعرا میں اعلان چھاپ دیا کہ جب تک ان کا پورا نام و نشان اور پتہ نہیں معلوم ہوگا، ان کے کلام کی اشاعت نہیں ہو سکے گی۔ غالب نے معیار الشعرا میں یہ اعلان دیکھتے ہی منشی شیونارائن آرام کو لکھا:——

"یہ میرے دوست ہیں، امیر احمد ان کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے پادشاہوں کے روشناس رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ میں ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے تمہارے پاس بھیجیں اور اس کے لکھنے میں ان کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا۔ اس کو معیار الشعرا میں چھاپ کر ایک دو ورق یا چار ورق رام پور ان کے پاس بھیجو اور سرنامہ پر لکھو کہ در رام پور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد برسد اور مجھ کو اس کی اطلاع دو۔"

اس خط کی موجودگی میں یہ بات ناقابلِ تردید ہو جاتی ہے کہ غالب نے امیر احمد مینائی کو روشناس کرانے میں عملی حصہ لیا تھا۔ امیر احمد مینائی کا نمونۂ کلام یہ ہے:

نوجوان لوگ کیا نہیں کرتے — دل لگایا تو کیا گناہ کیا

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا — امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

میں جاگ رہا ہوں ہجر کی شب — پر میرے نصیب سو رہے ہیں

مجھ کو دیکھا تو غیر سے بولے — آپ بھی مجھ کو پیار کرتے ہیں

ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کے بولتا ہے بہت — ملے وہ آب کے تو ناصح کو سامنے کر دیں

عمر کو سارا زمانہ گذران کہتا ہے — دن جدائی کا مگر عمر میں محسوب نہیں

زخم سلوانے کی یارو ابھی جلدی کیا ہے　　پہلے کچھ میرے تڑپنے کی تو تدبیر کرو

جو کچھ سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے　　میں روتا ہوں اُن کو ہنسی سوجھتی ہے

تم کو آتا ہے پیار پہ غصہ　　مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

میں نے کہا کہ پھیر دو دل کیا کرو گی تم؟　　بولے ہم اپنے تیر کا پیکاں بنائیں گے

کیا جانیے وحشت میں کہا کیا انھیں میں نے　　ہمدم بھی مرے آج تسلی نہیں کرتے

باقی نہ کوئی دل میں الٰہی ہوس رہی　　چودہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہی

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش　　مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

(دبدبۂ امیری ص ، انتخاب یادگار ص
تاریخ ادب اردو ص ، عروس ہندی ص
خم خانۂ جاوید ص

نواب سید امیر علی خاں

نواب سید امیر علی خاں ضلع پٹنہ کے ایک قصبہ باڑھ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے تحصیل علوم کے بعد کلکتہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہاں وکالت کرنے لگے تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران ان کو پٹنہ کے کمشنر کا اسسٹنٹ مقرر کیا گیا۔ واجد علی شاہ

اپنی معزولی کے بعد کلکتہ پہنچ کر مٹیا برج میں مقیم ہوئے تو یہ ان کے وزیر ہوئے۔

میاں دادخاں سیاح جن دنوں کلکتہ میں مقیم تھے، ان کی ملاقات نواب سید امیر علی خاں سے ہوئی تھی، انھوں نے اس ملاقات کا تفصیلی حال غالب کو لکھ بھیجا تھا۔ غالب نے اس کے جواب میں ان کو اطلاع دی تھی:

"جناب منشی میر امیر علی صاحب سے مجھ سے ملاقات نہیں، لیکن انکے محامد و مکارم سنتا ہوں"

نواب سید امیر علی خاں نے ۱۸۶۴ء کے اوائل میں کلکتہ کی سکونت ترک کی تھی اور شملہ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ غالباً شملہ ہی سے انھوں نے دہلی کا قصد کیا اور وہاں پہنچ کر مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے اپنی ایک تصنیف امیر نامہ میں جو ۱۸۷۰ء میں دوسری مرتبہ طبع ہوئی تھی۔ غالب سے اپنی ملاقات کا تفصیلی حال لکھا ہے، لکھتے ہیں:—

"دریں معمورہ از ملاقات عملۂ خرسندی ہائے فرادل دارم واز اخلاق جہاں نوازی ہائے ہر یکے گلہائے مسرت دامن دامن برچیدم علی الخصوص از لطف محبت برگزیدۂ روزگار، یگانۂ دور مرزا غالب۔"

(امیر نامہ ص۳۰ ، خطوط غالب ص۱۵۴
نقش آزاد)

مولوی امین الدین

مولوی امین الدین، مولوی زین الدین کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے دہلی کے علمی اور ادبی ماحول میں آنکھ کھولی اور قادر بخش صابر کے بیان کے مطابق مولوی عبداللہ خاں علوی سے فنون متداولہ اور علوم متعارفہ نہایت تدقیق کے ساتھ تحصیل کئے اور پایۂ تحقیق

کو عرشِ افتخار تک پہنچایا۔

مولوی امین الدین ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد پٹیالہ جا کر راجہ نریندر سنگھ والیٔ پٹیالہ کے ایک مدرسہ میں مدرس ہو گئے۔ ایک اندازہ کے مطابق پٹیالہ میں ان کا قیام ۱۸۶۷ء کے اواخر تک رہا۔ اس سے چند سال پہلے ۱۸۶۲ء میں غالب نے برہانِ قاطع کی اغلاط جمع کر کے ان کو قاطع برہان کے نام سے شائع کیا، جس پر ہندستان کے فارسی دانوں میں بھونچال آ گیا اور برہان قاطع کو سند ماننے والے برچھیاں اور تلواریں بچو پچھلا کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کے ساتھ ہی مولوی امین الدین نے بھی قاطع القاطع کے عنوان سے دو سو اڑسٹھ صفحوں کی ایک کتاب لکھی اور اسے مطبع مصطفائی دہلی سے ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں شائع کرایا۔ اس کا لہجہ اس قدر سخت اور ناروا اور زبان ایسی فحش اور پوچ تھی کہ غالب کے لئے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا تھا کہ وہ اس پر توجہ نہ کریں، چنانچہ تیغِ تیز کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"میاں امین الدین کہ اب پٹیالے میں ملقب بہ مدرس ہیں، انھوں نے ایک قاطع القاطع چھپوایا، استعدادِ علمی ہیں سے بعد صرف مقاصد نحو و صرف فارسیت کی اس قدر رعایت منظور رکھی کہ فقیر کے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں، باقی سوائے عربی، قشری اور فارسی مسروقہ کے وہ مغلظ گالیاں دی ہیں جو کنجڑے بھٹیارے استعمال کرتے رہتے ہیں۔ کمال یہ کہ ان کا منطق ہندی اور حضرت کی عبارت فارسی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی جلا ہے۔ ان دنوں میں علم تحصیل کر کے مہذب ہو گئے ہیں، عمامہ باندھے ہوئے پڑے پھرتے ہیں، فحش نہیں بولتے، حضرت اپنی قوم کے صاحب و قبلہ ان کا روزمرہ ہے، یا رب میاں امین الدین کس بری قوم کے اور کس پاجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے

مدرس بنے، مگر الفاظ مستطاب قوم نہ چھوڑے، اگر میری طرف سے ازالۂ حیثیت کی نالش دائر کی جاتی تو میاں پر کیسی بنتی، مگر میرے کبر نفس نے ازالۂ حیثیت کے لفظ کو گوارا نہ کیا، ان کی تحریر ان کے پاجی پن پر دلیل ہے ــــــ"

اس کے باوجود کچھ لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ غالب مولوی امین الدین کی قاطع القاطع کا جواب لکھیں لیکن بقولِ حالی یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات مارو گے؟" لیکن رائے عامہ اتنی بڑھی کہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس مقدمہ کی سماعت کے دوران مولوی امین الدین کے گواہ مولوی ضیاء الدین کو جب کہ وہ گواہی دے رہے تھے۔ محرر منشی کے کہنے پر مجسٹریٹ نے کرسی منگا کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔ یہ رعایت غالب کے ساتھ بے انصافی کے مترادف تھی جس پر بعض مقامی روسا بیچ میں پڑ گئے اور انھوں نے فریقین میں راضی نامہ کرا دیا۔ اس طرح دسمبر ۱۸۶۷ء کے اوائل میں شروع ہونے والا مقدمہ ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کے اواخر میں ختم ہو گیا اور اسکے کاغذات داخل دفتر کر دیے گئے۔

مولوی امین الدین نے فروری ۱۸۶۸ء کے اواخر میں جو عدالتی بیان دیا تھا، اس میں انھوں نے اپنی عمر ۵۹ سال بتائی ہے اور خود کو باشندۂ پٹیالہ اور قوم شیخ سے ظاہر کیا ہے۔ قاضی عبدالودود کے بیان کے مطابق جس وقت ان کا ترجمہ تذکرۂ نساخ میں لکھا گیا ظاہر ہوا زندہ تھے۔ تذکرۂ نساخ میں ان کا ترجمہ موجود نہیں ہے۔ نساخ نے امین الدین خاں فرزند قاضی وحید الدین خاں، خواجہ امین الدین باشندۂ بنارس، محمد اسماعیل امین اور امیر محمد امین باشندۂ بنارس کا ترجمہ لکھا ہے۔ غالباً قاضی صاحب نے ان ہی میں سے کسی ایک پر مولوی امین الدین کا التباس کر لیا ہے۔ قادر بخش صابر کے بیانات سے اندازہ ہوتا

ہے کہ مولوی امین الدین کو فارسی میں کامل استعداد تھی۔ وہ اشعارِ فارسی نہایت متانت اور سنجیدگی سے کہتے تھے۔ علاوہ ازیں جملہ اصنافِ سخن پر ان کو عبور تھا۔ نمونۂ کلام کے طور پر ان کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں:

بدستِ غیر دیدم شب بہ خواب آں زلفِ پیچاں را
نمی دانم چہ تعبیر است ایں خوابِ پریشاں را

غیر در بزمت مے و جام و رباب و چنگ داشت
دل تپیدن ہائے ما ہم جوشِ صد آہنگ داشت

در شکستن ہا نشد منت کشِ سنگیں دلاں
تیشۂ ما در بغل نے جنبشِ خود سنگ داشت

راہ آمد شد فرد بست است بر تارِ نفس
کثرتِ داغ تو جا در سینۂ ما تنگ است

از خودی خود گذر، محو رخِ یار باش
صورتِ تصویرِ شعر، پشت بہ دیوار باش

خرقۂ سالوس را، ترک بگو زاہدہ
بیعتِ خمار کن، رند قدح خوار باش

(مجموعۂ نثرِ غالب ص ۱۸۰، گلستانِ سخن اول ص ۳۲۵، ص ۳۲۶، یادگارِ غالب ص ۵۹، آثارِ غالب ص ۳۳، سخن شعرا ص ۳۹، غالب نمبر علی گڑھ میگزین ص ۲۹)

نواب امین الدین احمد خاں

نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب احمد بخش

کی ہم کفو بیاہتا بیوی بیگم جان کی اولاد تھے۔ بیگم جان نیاز محمد بیگ کی صاحبزادی تھیں۔ جن کے بھائی نذر محمد بیگ لوہارو میں فوج کے کپتان تھے۔ اس لئے ان کے خاندان کو "کپتان فیملی" کا نام دیا گیا تھا۔ بیگم جان ۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو انتقال کر گئیں۔

نواب امین الدین خاں کا سالِ ولادت ۱۲۲۹ھ ہے۔ وہ فیروز پور جھرکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی ریاست فیروز پور جھرکہ کا علاقہ اپنے حرم زادہ نواب شمس الدین خاں کو اور لوہارو کا علاقہ نواب امین الدین خاں اور نواب ضیاء الدین خاں کو دے دیا تھا۔ نواب شمس الدین خاں کو یہ تقسیم پسند نہیں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے بھائیوں کا حق بھی ان ہی کو مل جائے بالآخر انہوں نے ۱۸۳۳ء میں لوہارو کا علاقہ اپنے نام منتقل کروالیا۔ اس وقت ولیم فریزر دہلی کے رزیڈنٹ تھے۔ انہوں نے دونوں بھائیوں نواب امین الدین خاں اور نواب ضیاء الدین خاں کا حق ان کو واپس دلانے کی سعی کی اور اس سلسلہ میں نواب امین الدین خاں کو مشورہ دیا کہ وہ کلکتہ جائیں۔ ۱۸۳۴ء میں نواب امین الدین خاں نے کلکتہ کا قصد کیا اور وہاں جاکر اپیل دائر کی جس پر لوہارو کا علاقہ واگذاشت ہوگیا۔

غالب نواب امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں سے بے انتہا خلوص رکھتے تھے۔ انہوں نے مقدور بھر ان دونوں بھائیوں کی مدد کی، نواب امین الدین خاں لوہارو کی بازیافت کے لئے کلکتہ کو روانہ ہوئے تو غالب نے متعدد دوستوں کے نام تعارفی خط اور سفارشی عرضیاں لکھ کر دیں۔ نواب امین الدین خاں کو بھی غالب سے اسی درجہ محبت اور خلوص تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک انگریز شراب فروش میکفرسن نے ۱۸۴۰ء میں اپنے قرض کی وصولی کے لئے دوسو پچاس روپے کی نالش کردی۔ جس وقت غالب اپنے بھائی یوسف خاں کی ملاقات کے لئے جارہے تھے۔ عدالت کے چپراسی نے اس قرض کی وصولی کے لئے ان کو گرفتار کرلیا۔

اور ناظر کے مکان پر لے جاکر قید کرادیا۔ نواب امین الدین خاں کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے ڈھائی سو روپے اصل اور ڈیڑھ سو روپے سود دے کر ان کو چھڑایا۔

آخر عمر میں نواب امین الدین خاں بیمار رہنے لگے تھے۔ دماغ میں بھی کچھ خلل پیدا ہو گیا تھا۔ اس بنا پر ان کے صاحبزادے نواب علاء الدین خاں علائی کو مسند نشین کر دیا گیا تھا۔ نواب امین الدین خاں نے ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۸۶ھ کو وفات پائی اور دہلی میں اپنے موروثی قبرستان میں دفن ہوئے۔ ان کے لوح مزار پر "مدفن امین الدین خاں بہادر" کندہ ہے جس سے ۱۲۸۶ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں۔

جام جہاں نما جون ۱۹۳۰ء، اردوئے معلیٰ صـــ۲۸۹

ادبی خطوط غالب صـــ۲۰۰، ذکر غالب صـــ۲۸۴

واقعات دارالحکومت دہلی صـــ

میجر اے آر فلرؔ

میجر اے آر فلر کا ذکر گارساں دتاسی کے خطبات میں بڑی تفصیل کے ساتھ ملتا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق میجر اے آر فلر کو ہندوستانی زبان سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے ہندوستانی کی متعدد قدیم و نایاب کتابوں کو طبع کرایا تھا اور خود بھی نئی کتابیں لکھی تھیں۔ وہ اپنی نگرانی میں ایک ماہوار رسالہ بھی شائع کراتے تھے۔

میجر اے آر فلر کو پنجاب میں ناظم تعلیمات مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اپنی نظامت کے زمانے میں ہر سال پنجاب میں تعلیمی ترقی کے بارے میں تفصیلی رپورٹ مرتب کرتے اور اسے شائع کراتے تھے۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۸۶۱ء تک پنجاب میں تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں جو کام ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ انہوں نے گارساں دتاسی کو بھی ارسال کی تھی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انجمن اشاعت علوم کا قیام عمل میں آیا تو وہی اس کے

سرپرست بنائے گئے۔

اس واقعہ کے چند سال بعد غالب نے پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر سر ڈانلڈ میکلوڈ کو نذر کرنے کے لئے قواعد صرف فارسی سے متعلق اُردو زبان میں ایک رسالہ مرتب کیا۔ اس کے ساتھ پنج آہنگ کے خطوط شامل کر کے اسے نکاتِ و رقعاتِ غالب کے نام سے موسوم کیا اور اس کی ضرورت اور اہمیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی۔

"فقیر کو اس تحریر سے ان صاحبانِ انگریز کی خدمت گذاری مُراد ہے جو ولایت سے تشریف لائے اور فارسی اور اُردو کو اچھی طرح نہ جانتے ہوں"

یہ رسالہ پیارے لال آشوب کی وساطت سے میجر اے آر فلر کی نظر سے گذرا تو انہوں نے اسے بہت پسند کیا اور ہدایت کی کہ اسے مدارس میں رائج کرنے کے لئے شائع کیا جائے چنانچہ اس رسالہ کو پیارے لال آشوب کی التماس کے ساتھ مولوی سعادت علی خاں کے مطبع سراجی سے فروری ۱۸۶۷ء میں پانچسو کی تعداد میں شائع کیا گیا

اس کی اشاعت کے چند ماہ بعد میجر اے آر فلر نے کچھ دنوں کی چھٹی لی اور اپنی بیوی اور بچوں سے ملنے اور ان کو ساتھ لے کر آنے کے لئے انگلستان روانہ ہو گئے۔ ہندوستان واپس ہونے کے چند ہی دنوں بعد ان کو تعلیمی سرگرمیوں کی رپورٹ مرتب کرنے کے لئے چند دیہی علاقوں کا دورہ کرنا پڑا۔ وہ راولپنڈی کے ایک نواحی قصبہ سے گذر رہے تھے کہ شدید بارش ہو گئی اور راستے جھیلوں اور تالابوں میں تبدیل ہو گئے۔ میجر اے فلر کو بھی سیلابی تھپیڑوں نے پوری قوت کے ساتھ بہا دیا کئی گھنٹوں تک ان کو تلاش کیا جاتا رہا، بالآخر ایک نشیبی مقام سے ان کی نعش برآمد ہوئی۔

(گارساں دتاسی ص۱۰۹ تا ص۱۱۱

مجموعہ نثر غالب ص۱ تا ص۲)

فلپ ہنری ایجرٹن

فلپ ہنری ایجرٹن انگلستان میں پیدا ہوئے تھے' ان کا سال ولادت ۱۸۲۴ء ہے انھوں نے ۱۸۴۳ء میں انگلستان سے ہندوستان آکر آئی سی ایس کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۵۵ء میں دہلی کے مجسٹریٹ کلکٹر بنائے گئے۔

جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا اور تحریک آزادی کے شعلوں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، فلپ ہنری ایجرٹن چھٹی پر دہلی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ انگریزوں کے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لینے کے بعد انھوں نے اپنا سابقہ عہدہ سنبھالا، اور اس پر ۱۸۵۹ء تک کام کرتے رہے۔ ۲۴ر فروری ۱۸۵۹ء کو دہلی کے کمشنر مسٹر چارلس سانڈرس نے غالب کو اپنے دفتر میں بلا کر ہدایت کی کہ وہ پنشن کی بحالی کے سلسلے میں فلپ ہنری ایجرٹن سے ملاقات کریں کیونکہ پنشن کے متعلقہ کاغذات ان کے پاس منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ غالب نے ۷ر اگست ۱۸۵۹ء کو فلپ ہنری ایجرٹن سے ملاقات کی۔ ایک خط میں اس ملاقات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کل ہفتہ کا دن ساتویں اگست کی' مجھ کو ایجرٹن صاحب نے بلایا، کچھ سہل سوالات مجھ سے کئے گئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس میں ہے کہ پندرہ مہینے پچھلے بھی ملتے ہیں یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے"

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد فلپ ہنری ایجرٹن کو ترقی دے دی گئی اور وہ امرتسر اور راولپنڈی کے کمشنر ہو کر دہلی سے چلے گئے۔ فلپ ہنری ایجرٹن کا انتقال ۱۸۹۳ء میں ہوا ——— !

(خطوط غالب ص ۲۸۳، عود ہندی ص ۲۰۱)

سر جارج فریڈرک ایڈمنسٹن

غالب نے اپنے کئی خطوط میں سر جارج فریڈرک ایڈمنسٹن کا ذکر کیا ہے۔ وہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی ان کی عمر انیس سال ہی کی تھی کہ ان کو ملازمت کرلینا پڑی اس طرح ۱۸۳۱ء میں ان کا پہلا تقرر اضلاع شمال و مغرب میں ہوا۔

جب انگریزوں نے پنجاب پر چڑھائی کی اور وہاں کی ریاستوں کو زیر کر لیا تو انھیں ان کا نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے کسی مدبر اور منظم شخص کی تلاش ہوئی۔ انھوں نے ایڈمنسٹن کو ان کا کمشنر بنا دیا۔ یہ کمشنری ایڈمنسٹن کی ترقی کا پہلا زینہ تھی، اس کے بعد ۱۸۵۳ء میں وہ پنجاب کے مالیاتی کمشنر اور ۱۸۵۷ء میں حکومت ہند کے فارن سیکرٹری بنائے گئے ۱۸۵۹ء میں ان کو مزید ترقی دی گئی اور ممالک مغربی و شمالی کا گورنر مقرر کیا گیا۔ غالب کو ایڈمنسٹن کے گورنر ہونے کی اطلاع ایک اخبار کے ذریعہ ملی جسے ان کے شاگرد شیو نراین آرام نے آگرہ سے ان کو بھیجا تھا۔ چنانچہ وہ شیو نراین آرام کو لکھتے ہیں:

"وہ عبر اخبار کا جو تم نے مجھ کو بھیجا تھا، اس میں ایڈمنسٹن صاحب کے لیفٹیننٹ گورنر ہونے اور بہت جلد آگرہ آنے کی خبر لکھی تھی"

اس کے بعد انھوں نے ۱۲ر نومبر ۱۸۵۹ء کو حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں لکھا: ——

"از روئے اخبار مفید خلائق کے ذہن یوں لڑا ہے کہ اس ہفتہ میں جناب ایڈمنسٹن صاحب بہادر آگرہ آئیں گے اور مسند لیفٹیننٹ پر اجلاس فرمائیں گے ...... جب تک ایڈمنسٹن صاحب بہادر چیف سکرٹر تھے تو یہ خیال تھا کہ ان کی نذر اور نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر یعنی دو کتابیں مع اپنے خط کے ان کے پاس بھیجوں گا۔ اب حیران ہوں کہ کیا کروں"

جب ایلفنسٹن نے آگرہ میں اجلاس کیا تو غالب نے ان کی خدمت میں اپنی کتاب دستنبو بھجوائی اور اسی کے ساتھ ایک قصیدہ "مدح سر جارج فریڈرک ایلفنسٹن گورنر ممالک مغربی و شمالی" کے عنوان سے نذر گزارتا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

باز پیغام بہار آورد باد　　مژدہ مہر روزگار آورد باد

اس سلسلے میں وہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:

"بندے نے دستنبو جناب ایلفنسٹن صاحب لیفٹیننٹ گورنر بہادر غرب و شمال کی نذر بھیجی تھی۔ سو اُن کا فارسی خط محررۂ دہم مارچ مشتمل بر تحسین و آفرین و اظہارِ خوش نودی بہ طریق ڈاک آگیا۔ پھر میں نے تہنیت میں لیفٹیننٹ گورنری کی، قصیدہ فارسی بھیجا۔ اس کی رسید میں نظم کی تعریف اور اپنی رضامندی پر مشتمل خط فارسی بسبیل ڈاک مرقوم چہار دہم آگیا"

ایلفنسٹن کی جانب سے غالب کو دستنبو اور قصیدہ کی وصولی کی جو رسیدیں بھجوائی گئی تھیں ان میں ان کے نام کے ساتھ "خان صاحب مشفق بسیار مہرباں و مخلصاں" کے القاب لکھے گئے تھے۔ اس سے غالب کو اتنی خوشی ہوئی کہ انھوں نے احسان مندی کا ذکر کرنا ضروری سمجھا۔ ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"جناب ایلفنسٹن صاحب بہادر سے میں صورت آشنا نہیں، کبھی میں نے ان کو کہیں دیکھا نہیں، خطوں کی ان کی میری ملاقات ہے اور نامہ و پیغام کی یوں بات ہے کہ جب کوئی نواب گورنر جنرل بہادر آتے ہیں تو میری طرف سے ایک قصیدہ بہ طریق نذر جاتا ہے سو بے ذریعہ جناب صاحب بہادر ایجنٹ دہلی اور نواب لیفٹیننٹ گورنر آگرہ بھجواتا ہوں۔ ... ایلفنسٹن صاحب بہادر چیف سکرٹر کا جو مجھ کو خط آیا ہے تو انھوں نے باوجود عدم سابقہ معرفت میرا القاب بڑھایا۔ قبل ازیں "خان صاحب بسیار مہربان دوستاں"

میرا القاب تھا۔ اس قدرشناس نے ازراہِ قدردانی "خاں صاحب مشفق بسیار مہربان و مخلصان" لکھا۔ ان کو کیوں کر اپنا محسن و مربی نہ جانوں کیا کافر ہوں جو احسان نہ مانوں"

ایڈمنسٹن ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۳ء تک لیفٹیننٹ گورنری کے عہدہ پر کام کرتے رہے۔ ۱۸۶۴ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

(خطوطِ غالب، مہیش ص ۳۱۲، ص ۳۹۵، خطوط غالب ص ۲۴۹
کلیات نظم فارسی دوم ص ۱۳۸، مکاتیب غالب ص ۱۳۲)

لارڈ ایلن برا

غالب نے اپنے خطوط میں لارڈ ایلن برا کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۴۲ء میں لارڈ اک لینڈ کو گورنر جنرل کے عہدے سے الگ کیا گیا تو لارڈ ایلن برا نے انگلستان سے ہندوستان پہنچ کر ان کی جگہ سنبھالی۔ ان کے ہندوستان پہنچنے پر غالب نے چالیس شعر کا ایک قصیدہ ان کی خدمت میں پیش کیا اور اسے سید الاخبار دہلی میں شائع کرایا۔ وہ میجر جان جاکوب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں نے جو قصیدہ نواب گورنر جنرل بہادر کو اس مرتبہ پیش کیا ہے اور جس کا مطلع ہے۔

اے برتر از سپہر بلند آستانِ تو
تو پاسبانِ ملک و ملک پاسبانِ تو

اس میں تین مطلعے اور چالیس شعر ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ اس فارسی کلیات میں جو آپ کی خدمت میں بھیجا ہے یہ قصیدہ بھی قصاید میں درج ہوا ہے۔ اگر ہے تو اطلاع دیں ورنہ سید الاخبار دہلی سے

کلیات میں نقل کرلیں۔"

لارڈ ایلن برا نے ہندوستان آنے کے کچھ دنوں بعد بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا اور کہلا بھیجا کہ اگر ان کو دربار میں بیٹھنے کی اجازت دی جائے تو وہ نذر پیش کرنے کے علاوہ جملہ آداب بندگی بجا لائیں گے۔ بہادر شاہ ظفر نے اسے اپنے بزرگوں کی روایات کے منافی خیال کیا اور ان کی یہ درخواست مسترد کردی۔ اس کے نتیجہ میں لارڈ ایلن برا نے ہندوستان سے متعلق انگریزوں کے طریق کار اور پالیسی میں تبدیلی کی اور بادشاہ کو نذر پیش کرنے کی رسم کا خاتمہ کیا اور حکم دیا کہ گورنر جنرل اور رزیڈنٹ کی جانب سے بادشاہ کو نذر نہ دی جائے بلکہ نذر دی جانے والی رقم کا سالانہ پنشن میں اضافہ کیا جائے۔

لارڈ ایلن برا کو غالب کی تحریروں اور حالات نے خاصہ متاثر کیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ خاص شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان ہی کوششوں سے غالب کے اعزاز میں اضافہ ہوا تھا اور سرکار انگریزی کی جانب سے خلعت عطا ہوئی تھی۔ جس میں سات پارچہ اور تین رقم جواہر یعنی سرپیچ و جیغہ و مالائے مروارید ہوا کرتے تھے۔

لارڈ ایلن برا کو اپنی پالیسیوں کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے کا زیادہ دنوں موقع نہیں ملا۔ وہ ۱۸۴۴ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کے مشورہ سے انگلستان واپس بلالئے گئے۔

غالب کو لارڈ ایلن برا سے بڑی توقعات تھیں، ان کا خیال تھا کہ جس طرح روم اور ایران کے بادشاہ اور دوسرے ملکوں کے حکمراں اپنے مدح خوانوں کو مختلف طریقوں سے نوازتے، سونے چاندی میں تلواتے، موتیوں سے منہ بھرتے اور انعام عطا کرتے ہیں اسی طرح لارڈ ایلن برا کی کوششوں سے ان کو ملکہ معظمہ کے درباری شعرا میں جگہ ملے گی اور ان کے خلعت اور پنشن میں اضافہ ہوگا۔ اس بنا پر انہوں نے ۱۸۵۵ء میں "در مدح ملکہ معظمہ دارا دربان، فرماں روائے انگلستان مدظلال اجلالہا" کے عنوان سے ۷۰ شعروں کا ایک

قصیدہ لکھا اور اسے لارڈ ایلن برا کی خدمت میں انگلستان بھجوا کر ان سے درخواست کی کہ وہ اسے ملکہ معظمہ کی بارگاہ میں پیش کریں۔ اس قصیدے کے بھیجنے کے تین ماہ بعد غالب کو لارڈ ایلن برا کی جانب سے اطلاع ملی کہ یہ قصیدہ ملکہ معظمہ کی بارگاہ میں پیش کر دیا گیا لیکن اس کے ایک ماہ بعد ہی رزنگٹن سیکرٹری نے ایک خط کے ذریعے ان کو فہمائش کی کہ وہ آئندہ ایسی تمام چیزیں گورنر جنرل ہند کی وساطت سے بھیجا کریں جس پر انہوں نے یہی قصیدہ گورنر جنرل لارڈ کے ننگ کے توسط سے دوبارہ بھجوایا۔

(سبد باغ دو در، صفحہ ۱۳۰، کلیات نظم فارسی دوم
صفحہ ۱۰۲، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ صفحہ ۵۱،
تفصیلات کے لئے دیکھئے۔ ہندوستانی نظم و نسق
لارڈ ایلن برا کے عہد میں)

بادشاہ بیگم

بادشاہ بیگم کو تاریخ اودھ میں اس اعتبار سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے مذہبی معتقدات کو فروغ دینے کے لیے ایسی رسوم ایجاد کر رکھی تھیں کہ آج کا کوئی باشعور شخص ان پر یقین نہیں کر سکتا۔ وہ مشہور تقدیم ساز مبشر خاں کی صاحبزادی تھیں جو مشرف خاں کے بیٹے اور خیر اللہ رصد بند محمد شاہی کے شاگرد تھے۔ بادشاہ بیگم کا سال ولادت ۱۱۹۳ھ ہے۔ مبشر خاں نے ان کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی۔ ان کو علوم درسیہ کے علاوہ احکام نجوم بھی بتائے۔

غازی الدین حیدر نے اپنے ایام صاحبزادگی میں کئی بار بادشاہ بیگم کو دیکھا تھا اور چاہتے تھے کہ بادشاہ بیگم کے ساتھ ان کی شادی ہو جائے۔ ان کی خواہش کے پیش نظر نواب سعادت علی خاں نے ۱۲۰۹ھ میں بادشاہ بیگم سے ان کا عقد کرا دیا۔ بادشاہ بیگم سے

غازی الدین حیدر حد درجہ خائف رہتے تھے۔ وہ ان کے مزاج میں اس قدر دخیل ہو گئی تھیں کہ وہ جو چاہتی کرتیں، کسی میں ہمت نہیں تھی کہ ان کو روک سکے۔

نصیر الدین حیدر نے تخت نشین ہونے کے بعد بادشاہ بیگم کو مریم مکانی کے خطاب سے سرفراز کیا اور ان کے تمام جاگیری علاقے واگذاشت کر دیے۔ لیکن ان کے چند ہی سال بعد نصیر الدین حیدر اور بادشاہ بیگم میں تنازعات پیدا ہو گئے اور انھوں نے اس قدر طول کھینچا کہ انگریزوں تک کو شرم دامن گیر ہونے لگی۔ نصیر الدین حیدر کے انتقال پر بادشاہ بیگم نے رفیع الدین حیدر عرف فریدوں بخت کو تخت نشین کرانا چاہا اور اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئیں، لیکن انگریزوں نے ان کو اور فریدوں بخت کو قید کر کے چنار گڑھ بھیج دیا، جہاں وہ ۳ صفر ۱۲۶۶ھ کو ستر سال کی عمر میں انتقال کر گئیں، ان کے انتقال پر غالب نے ذیل کا قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے ۱۲۶۶ھ کے اعداد برآمد ہوتے ہیں:

دو ہزار و دو صد و شصت و شش از دنیا گذشت
بانوے شاہ اودھ مریم مکانی نام او
آں کہ چوں بالاے کاخ شستی روے خویش
آب حیواں ریختی از ناودان بام او
مردنش ہم برکمال حسن او آمد دلیل
چوں مہ کامل بہ دہر از نور پر شد جام او
در نورد رہروی شد سامرہ منزل گہش
خود اساس آں زمین بود از پے آرام او
گفت غالب سال فوتش لیکن از روے نیاز
بادبا بنت رسول ہاشمی انجام او

(سبد باغ دو در ص ۷، تاریخ اودھ ج ۳ ص ۲۱۶، ص ۱۱۶، ص ۳۲۶)

نصیرالدین حیدر بادشاہ

نصیرالدین حیدر کا اصل نام مرزا علی حیدر تھا۔ وہ ۲۲ رجمادی الاول ۱۲۱۸ھ کو نواب ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے، ان کی تمام تر پرورش ان کی سوتیلی والدہ بادشاہ بیگم نے کی غازی الدین حیدر نے ان کو اپنا ولی عہد مقرر کرتے وقت "ابوالنصر امتیاز الدولہ سلیمان جاہ صاحب عالم ولی عہد مرزا نصیرالدین حیدر بہادر اسد جنگ" خطاب دیا تھا۔

غازی الدین حیدر نے ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ راکتوبر ۱۸۲۷ء کو انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے دوسرے روز نصیرالدین حیدر کی تخت نشینی کی تقریب عمل میں آئی اور اس کے تیسرے روز جشن جلوس منعقد کیا گیا جو سات دن تک جاری رہا۔ اس موقع پر معتمد الدولہ آغا میر نے چند اشرفیوں اور رُپوں پر یہ سکہ مسکوک کراکے نذر کیا:

سکہ زد بر سیم مرزر از سایۂ فضل الٰہ
نائب مہدی نصیرالدین حیدر پادشاہ

کلیات غالب میں "در مدح شاہ جنت مکاں نصیرالدین حیدر سلیماں جاہ بادشاہ اودھ" کے عنوان سے ایک قصیدہ پایا جاتا ہے۔ مالک رام نے خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلے یہ قصیدہ غازی الدین حیدر اور آغا میر کے لئے لکھا گیا تھا، لیکن معاملۂ ملاقات طے نہ ہو سکنے پر ممدوح کے نام کر دیا گیا۔ اس قصیدہ کے اشعار کی تعداد ایک سو چار ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

نازپروردۂ خلوت گہِ آزادگیم — کافرم گر بہ سراپردۂ سلطاں رفتم
صلہ جو نیستم و شعر فروشی نہ کنم — راہِ مدح تو بسرگرمیِ ایماں رفتم
مدتی در وطن از کثرتِ سرمستیِ شوق — جادۂ مرحلۂ عمر پریشاں رفتم
آمدم بر درِ گنجورِ علی مدح سرائی — نہ بدر کوبیِ گنجینۂ خاقاں رفتم

مدحت نائب مہدی ز محبت باشد — شاد ماہم کہ بہ ہنجار محباں رفتم
از غلامان علی ساخت ولائے تو مرا — تہنیت خواہ بر بوذر و سلماں رفتم
نازش قطرہ بہ دریاست تکلف موقوف — مرد بودم بہ سجود شہ مرداں رفتم
شرف ذات من ایں بس کہ ثنا خوان توام — عزت و فخر و نسب رانہ ثنا خواں رفتم
وصف جاہت نہ بہ اندازۂ ادراک لست — عجز دانست و بدانستم و ناداں رفتم
شوکتت باد کہ شاں و کرم افروزی — شاداں باش کہ از لطف تو شاداں رفتم
کوکب بخت تو رخشندہ تر از مہر کہ من — از تو چوں مہر بر آفاق زر افشاں رفتم
ابدی باد بہار تو کہ در انجمنت — کف خاک آمدم و جوش بہاراں رفتم
لب ہر کس کہ عدوئے تو و جاہت باشد — ساز ایں زمزمہ باد اکہ من ازجاں رفتم

نصیرالدین حیدر کے تخت نشین ہونے کے بعد ان کے گرد بدخواہوں اور ارذل قسم کے لوگوں کا ہجوم لگ گیا۔ جس کے نتیجے میں امور ملکی سے ان کی دلچسپی کم ہوتی چلی گئی اور وہ شاہدان بازاری کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئے۔ اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لئے بعض بدخواہوں نے ان کو مسموم بھی کرنا چاہا، لیکن اس میں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ شراب اور برف کی کثرت استعمال پر نصیرالدین حیدر کی زندگی کا دار و مدار رہ گیا تھا، لیکن اس سے استسقا کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں سب متورم ہو گئے۔ ۳ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ تک وہ اس قابل تھے کہ چل پھر سکیں، لیکن اس کے دوسرے روز رات کا کھانا کھانے کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی اور انھوں نے ۳۵ برس کی عمر میں دس سال حکومت کرنے کے بعد انتقال کیا۔

لالہ سری رام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیرالدین حیدر کو شعر گوئی سے بھی دلچسپی تھی وہ کبھی کبھی اردو اور فارسی میں شعر کہتے اور بادشاہ تخلص کرتے تھے۔ انکی یہ اردو غزل مشہور ہے

یہ کس مست کے آنے کی آرزو مجھے ہے — کہ ساقی لئے ساغر مشک بو ہے
سمایا ہے جب سے تو نظروں میں میری — جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے

بتا دوں میں کیا اپنا حال پریشاں — عیاں زلفِ دلدار سے مو بمو ہے
چلو قبرِ فرہاد پر فاتحہ کو — مگر آبِ شیریں سے لازم وضو ہے
نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے — یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے
گلستاں میں جا کر ہر اک گُل کو دیکھا — نہ تیری سی رنگت نہ تیری سی بو ہے
ستایا ہے ناحق ہمیں تو نے ظالم — یہ انصاف اللہ کے روبرو ہے
کیا چاک وحشت نے ایسا گریباں — نہ بخیہ کے قابل نہ جائے رفو ہے
شفق بن کے ہوتا ہے گردوں پہ ظاہر — یہ کس کشتۂ بے گنہ کا لہو ہے
عبث مجھ کو ہنس ہنس کے دیتے ہو گالی — زباں کو سنبھالو یہ کیا گفتگو ہے
اگر اب کے بولا شبِ وصلِ جاناں — چھری اور مرغِ سحر کا گلو ہے
رہے سایۂ پنجتن بادشہ پر — خداوندِ عالم نگہبان تو ہے

(خم خانۂ جاوید اوّل ، کلیاتِ نظم فارسی غالب دوم ص۱۱۴

تاریخ اودھ ص۲۱۲ ، ص۲۱۲ تا ص۲۱۳)

حکیم ببر علی خاں

حکیم ببر علی خاں دہلی کے مشہور طبیب تھے ۔ ۱۸۶۵ء سے بہت پہلے ان کا انتقال ہوگیا تھا ۔ ان کے متعلق صرف یہی معلوم ہو سکا ہے عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے صاحبزادے حکیم اسد علی خاں مضطر کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ قربان علی بیگ سالک کے تلامذہ میں سے تھے ۔

نواب کلب علی خاں والیِ رام پور اپنی تخت نشینی کے کچھ دنوں بعد بیمار ہوئے تو غالب نے معجونِ طلائی تقویتِ قلب میں مجوزہ حکیم ببر علی استعمال کرنے کی ان سے درخواست کی تھی اس کے علاوہ غالب نے حکیم ببر علی خاں کی تعریف میں ایک قطعہ بھی کہا ہے جس کا

آخری شعر یہ ہے:

مسیحِ کشتۂ الفت ببر علی خاں ہے
کہ جو اسد تپشِ نبضِ آرزو جانے

(مکاتیب غالب ص۱۵۴، سخن شعرا ص۱۴۴،
دیوانِ غالب ص۹۹)

بدر الدین علی خاں

بدرالدین علی خاں مرصع رقم، دہلی کے مشہور مہرکن تھے۔ انھوں نے خط نستعلیق میر محمد امیر سے اور کرسی بندی محمد یار سے سیکھی تھی۔ ان فنون میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا سرسید احمد خاں کے بیان کے مطابق نواب گورنر جنرل بہادر کی مہریں تیار کرتے تھے۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۴۳ء کے احسن الاخبار میں لکھا ہے کہ ۱۸ دسمبر کو بدرالدین مہرکن نے زمرد کا ایک نگینہ جس پر نواب گورنر جنرل بہادر کا نام کھدا ہوا تھا۔ نذر کے طور پر پیش کیا۔ ان کو خلعت پنج پارچہ عطا کیا گیا۔

بدرالدین علی خاں سے غالب کے بھی تعلقات تھے۔ غالب کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے بعض دوستوں، شاگردوں اور ممدوحوں نے اپنی مہریں بدرالدین علی خاں ہی سے کھدوائی تھیں۔ ایک مرتبہ انورالدولہ شفق کو اپنی مہر بنوانے کا خیال آیا۔ انھوں نے کالپی سے غالب کو لکھا۔ غالب نے ان کی تحریر بدرالدین علی خاں کو پہنچا دی اور جواباً لکھا:

آج شہر میں بدرالدین علی خاں کا نظیر نہیں، پس مہر اور کون کھود سکے گا۔ ناچار میں نے آپ کا نوازش نامہ جو میرے نام تھا، وہ ان کے پاس بھیج دیا۔ انھوں نے رقعہ میرے نام کا آج بھیجا، میں نہیں سمجھتا

کو قسم دوم پکھراج کی کیا ہے - آپ اس کو سمجھ لیں گے اور نگین باحتیاط ارسال فرمائیں - روپے کے بھیجنے کی ابھی ضرورت نہیں، جب میں عرض کروں تب بھیجیے گا ۔"

غالب میر سرفراز حسین کو کبھی کبھی "مجتہد العصر" بھی کہا کرتے تھے - ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"سچ کہنا، تمہیں وہاں کوئی مجتہد العصر کہتا ہوگا، نہ کہو، تم کو کیا، میں نے کہا، تم نے مان لیا، اب کوئی کہے یا نہ کہے، میاں بدرالدین سے ایک مہر کھدوا دوں گا ۔

"جناب مجتہد العصر سرفراز حسین"

بس تم یہ مہر خطوں پر، محضروں پر، تمسکوں پر کرنی شروع کردو، سب کے سب تم کو مجتہد العصر کہنا شروع کردیں گے ۔"

تذکرہ خوش نویساں کے مولف کے بیان کے مطابق بازار دریبہ کلاں دہلی میں ان کا قیام تھا، اور وہ اپنے گھر ہی پر مہرکنی کا شغل کرتے تھے، اس کے بیان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو طغروں، کتبوں اور خطاطی کے نمونے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا - انھوں نے آقا عبدالرشید دیلمی کے نمونے زرکثیر صرف کر کے حاصل کئے تھے ۔

بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ میں جو تحریریں پیش کی گئی تھیں ان میں ایک حکم نامہ بدرالدین علی خاں کے بھی نام تھا، جس کے ذریعہ ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ بخت خاں کے لئے ایک ایسی مہر تیار کریں جو وضع قطع میں بہت عمدہ ہو۔ حکیم احسن اللہ خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بدرالدین علی خاں نے ملکہ وکٹوریہ کے لئے بھی ایک نگینہ تیار کیا تھا اور انعام پایا تھا ۔ (تذکرہ اہل دہلی ص ۲۵۵، تذکرہ خوش نویساں ص ۵، عود ہندی ص ۱۱۳، ص ۱۵۹، ص ۲۳۰، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۸۲)

بڈھے صاحب

بڈھے صاحب کا نام نواب غلام محی الدین تھا ۔ وہ نواب امیر خاں کے بیٹے اور ، نظام الدین شاہ جی کے پوتے تھے ، جنھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں شاہ جی کا تالاب اور شاہ جی کا چھتہ تعمیر کرایا تھا - ۱۸۵۷ء سے پہلے بڈھے صاحب کو کلکٹری سے ایک ہزار روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی - ریاست بھرت پور سے تین سو روپے ماہانہ آتے تھے ، دہلی میں مکانوں ، دکانوں اور باغات سے پانچسو روپے کے لگ بھگ کرایہ ' اس پر مستزاد تھا ——————

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں مرزا مغل سپہ سالار بنائے گئے اور دہلی کا تمام نظم و نسق ان کے سپرد کر دیا گیا تو نواب غلام محی الدین خاں بھی ان سے ملنے اور ان کے پاس آنے جانے لگے - جس دن انگریزی سپاہ دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد شہر میں داخل ہو گئی اور ہڈسن نے مرزا مغل کو گولی کا نشانہ بنا دیا ، انگریزی مخبروں اور جاسوسوں کی نظر سب سے پہلے نواب غلام محی الدین خاں پر پڑی اور وہ ان کی تلاش میں چاروں طرف پھرنے لگے - اس صورت حال کے پیش نظر نواب غلام محی الدین خاں کا دہلی میں رہنا ممکن نہیں تھا - وہ انگریزوں کے شہر میں داخل ہوتے ہی ' جان کے خوف سے ننگے سر ننگے پاؤں نکل کھڑے ہوئے - چند روز درگاہ قدم شریف میں اور چند روز بلم گڑھ میں قیام کیا اور وہاں سے گوالیار کی راہ لی -

غالب نے ۱۶ ر فروری ۱۸۶۲ء کو علاء الدین احمد خاں علائی کے نام جو خط لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب غلام محی الدین خاں نے اپنی املاک فروخت کر دی تھیں جس زمانے میں انگریزوں نے دہلی فتح کی تھی ، لوگوں کو نہ اپنی املاک فروخت کرنے کا یارا تھا نہ ان میں اتنی ہمت یا حیثیت تھی کہ وہ املاک خرید سکیں - اگر یہ واقعہ درست ہے تو پھر

یہ بہت بعد کا ہوگا۔ ممکن ہے کہ نواب غلام محی الدین خاں نے جنوری ۱۸۶۲ء میں اپنی املاک فروخت کر کے مستقل طور پر ترک سکونت کی ہو۔ غالب لکھتے ہیں :

"بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر، نوش جاں کر کے بیک بینی

بھرت پور چلے گئے"۔

غلام حسین خاں نے نواب غلام محی الدین خاں کی جائے انتقال گوالیار بتائی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اکثر لوگ کہتے ہیں کہ وہ میاں نظام الدین کے ساتھ حیدرآباد چلے گئے اور ابھی زندہ ہیں، نواب غلام محی الدین خاں کے حیدرآباد جانے کے واقعہ کی تصدیق نہیں ہوتی ہے، اس بنا پر اغلب یہی ہے کہ وہ گوالیار میں فوت ہوئے۔

(غدر کا نتیجہ ص۴۸ ص۶۸ ص۶۹

خطوط غالب ص۴۹ ،)

امیر حسن خاں بسمل

نواب امیر عاشق علی خاں کاکوروی کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۱۹۵ھ ہے۔ جب وہ علوم عقلی و نقلی سے فراغت پا چکے تو ان کو اودھ کی سفارت دی گئی اور وہ کلکتہ چلے گئے۔ ۱۴ رجب ۱۲۴۳ھ کو ان کی خدمات کے صلہ میں ان کو سابقہ دو خلعتوں کے علاوہ ایک خلعت، ایک جھالردار پالکی اور ایک ہاتھی بطور انعام دیا گیا۔ امیر حسن خاں ان ہی کے صاحبزادے تھے اور بسمل تخلص کرتے تھے۔ صبح گلشن کے مولف نے ان کو نصیر الدین حیدر کے عہد کی سربرآوردہ شخصیتوں میں شمار کرتے ہوئے غلام مینا ساحر کاکوروی کا شاگرد بتایا ہے۔ نورالحسن بھی اپنے تذکرہ میں ان کی تعریف کرتے ہیں۔

امیر حسن خاں بسمل کو عربی اور فارسی میں کامل استعداد حاصل تھی۔ وہ شاعری

کے علاوہ نثر نگاری پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے۔ اس سے بعد میں ان کو یہ خوش فہمی ہو گئی کہ وہ بلا شبہ غالب کے مدِ مقابل ہیں۔ اس زمانے میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہوا۔

جملہ زاغ اند شاعران جہاں
لیک یک طوطیٔ شکر خا من

یہ شعر غالب تک پہنچا تو وہ خاموش نہیں رہ سکے۔ انھوں نے جواب دیا؛

لاجرم می سزد کہ نکتہ داں
نام بسمل نہند ہیرا من

اس شعر کے بعد امیر حسن خاں بسمل اور غالب میں اگر دوری کی صاحب سلامت تھی تو وہ بھی جاتی رہی اور قریب تھا کہ کوئی مکابرہ ظہور پذیر ہو جاتا۔ غالب نے موقع کی نزاکت محسوس کرلی اور مظفر حسین خاں کو درمیان میں ڈالا اور صفائی کرلی۔ مظفر حسین خاں کے نام ایک اور امیر حسن خاں کے نام غالب کے دو خط پائے جاتے ہیں۔ غالب نے مظفر حسین خاں کے نام جو خط لکھا ہے، اس سے بھی اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے کہ غالب نے صفائی کے سلسلہ میں خود پہل کی۔

"بارے چوں کلکتہ رسیدہ اند، چوں خوش باشد کہ دل نوازی و کارسازی را اساسے استوار نہند و لاابالی خرام عرصۂ سخن وری، یوسف کنعان معنی گستری، شیوا زبان روشن دل مکرمی امیر حسن خاں بسمل را بامن آشتی دہند زنگار آئینہ گراں نشیں نیست کہ کف نبرد من تواں سود و خوش دلی درمیاں ہم روئے نتواند نمود۔ یزداں کہ آں گفت کہ ازاں سو بہ بے ہودہ لافی و ازیں سو تلافی آمدہ پسندیدہ ام۔ مہر و وفائے من بامنشی عاشق علی خاں مفقود اس می خواہد کہ تا امیر حسن خاں را از جاں دوست تر ندارم خود را از حق گذاری

نہ شمارم "

امیر حسن خاں بسمل نے ۲۷ رمضان ۱۲۶۳ھ کو کلکتہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ ان کی تصانیف میں پنج گلبن، میزان المعانی اور دیوان فارسی قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر رسالہ غالب کے پنج آہنگ کے جواب میں ۱۲۶۰ھ میں لکھا گیا تھا۔

انھوں نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ایک بے نقط قصیدہ بھی دہلی بھجوایا تھا۔ قادر بخش صابر کے بیان کے مطابق "امیر حسن خاں بسمل نے جناب استادی حضرت صہبائی کی محامد و اوصاف سن کر اخلاص غائبانہ پہنچایا اور خط و کتابت کے وسیلے سے رابطہ خلت بڑھایا۔ ایک رقعہ الفاظ بے نقط میں ان کی خدمت میں بھیجا باوجود اس قید کے بے تکلف و آمدنی نغانہ ساختہ و پرداختہ"

امیر حسن خاں بسمل کے چند شعر یہ ہیں:

سرمہ خود بہ چشم کم منگر
دیدہ ہا زیں غبار روشن گشت

شہد ریز و کلام شیرینم
بر لب او مگر لب من گشت

نہ شود اگر بہ سینہ رہ قاصد نفس گم
دو سہ حرف خوں چکانے بلب ارمغاں فرستم

خال عارض کہ تہ کاکل یار افتادہ
مہرۂ زہر بود از لب مار افتادہ

آں قدر از دل صد پارہ نماندست بجائے
کہ بہ احباب تواں رقعہ انشا کردن

لالہ را خلعت گلگوں صلۂ یک داغ است

بہر من چیست کہ داغم ز شمار افتادہ

(مشاہیر کاکوروی ص۵۱ ص۵۲ ،

گلستان سخن اول ص۳۰ ، ایگا ص۲۳ ، ص۲۳۱

کلیات نثر فارسی غالب ص۲۰۷ ص۲۱۰)

غلام بسم اللہ بسمل

شاکر علی کا تاریخی نام غلام بسم اللہ تھا اور تخلص بسمل، وہ منشی سرفراز علی کنبوہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۳۹ھ اور مولد میرٹھ ہے۔ انھوں نے زیادہ تر تعلیم مارہرہ اور دہلی میں حاصل کی۔ عربی میں مفتی محمد سلطان حسن خاں صدالصدور سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں میرٹھ اور مظفر نگر کی عدالتوں میں ناظر مقرر ہوئے۔

خیال ہوتا ہے کہ ۱۸۶۶ء سے کچھ عرصہ پہلے ان کو شاعری سے دلچسپی ہوئی تھی اور انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی رہنمائی کے لئے غالب کو منتخب کیا تھا۔ غالب سے اکثر ان کو شکایت رہتی تھی کہ وہ ان کی غزلوں پر اصلاح کم دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے استاد کی سہل انگاری پر محمول کرتے ہوئے غالب کو ایک شکایتی عریضہ بھی لکھا تھا، جس پر غالب نے ان الفاظ میں ان کی تسلی کر دی:

"اگر تمہارے کلام میں اصلاح کم ہو تو یہ کلام کی خوبی ہے۔ اس کو استاد کی سہل انگاری کیوں سمجھو"

غلام بسم اللہ بسمل کو تصوف اور اس کے سلسلوں سے بھی گہرا شغف تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے حصولِ تعلیم کے فوری بعد اپنے دور کے مشہور روحانی پیشوا حضرت عبدالرحمٰن شاہ سے بیعت کر لی تھی اور اسی تعلق سے دو مرتبہ سعادت حج سے بھی

فیضیاب ہوتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے غزل گوئی کو ترک کر دیا اور نعت گوئی کیطرف منہمک ہو گئے اور قلیل مدت میں نعتوں کا ایک مجموعہ "نازبسمل" کے نام سے مرتب کر ڈالا جو شائع ہو چکا ہے۔

غلام بسم اللہ بسمل کے بیشتر اہل خاندان بریلی میں رہتے تھے۔ انھوں نے ملازمت سے حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد بریلی میں اقامت اختیار کر لی اور وہیں ۱۳۱۵ھ میں انتقال کیا اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔ محمود بریلوی نے "ان العاقبت المتقین" سے ان کا سال وفات برآمد کیا ہے۔ انھوں نے اکثر غزلیں غالب کی زمینوں میں کہی ہیں۔

ایسی ہی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں:

شب وفور اشک سے گردوں کف سیلاب تھا — دورۂ چشم کو اک حلقۂ گرداب تھا
واں حنابندی غناں گیر خرام ناز تھی — یاں تن کا ہیدہ غرق اشک خون ناب تھا
واں رخ پر نور تھا صبح امید زندگی — یاں ہر اک داغ جگر خورشید عالم تاب تھا
حسن تمکیں آزما کو پاس خود داری ادھر — خانہ زاد شوق کو ملحوظ یاں آداب تھا
ان کو پاس ننگ دامن گیر مجھ کو پاس وضع — وہ ادھر بے تاب تھے اور میں ادھر بیتاب تھا
میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر — بستر سنجاب تھا نے بالش کم خواب تھا

(یادگار ضیغم ص۶۸، تلامذۂ غالب ص۴۹
خم خانۂ جاوید اول ص۵۹، ص۵۹۱)

باقر علی خاں

جب معتمد الدولہ آغا میر نے نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت میں وزارت سے معزول ہو کر کانپور میں اقامت اختیار کی۔ اس وقت ان کے صاحبزادے معین الدولہ نواب باقر علی خاں بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انہوں نے معتمد الدولہ آغا میر کے انتقال کے

بعد لکھنؤ واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور مستقل طور پر کان پور میں ہی آباد ہو گئے معتمد الدولہ آغا میر نے ترکہ میں جو مال و اسباب اور ساز و سامان چھوڑا تھا، وہ اتنا ضرور تھا کہ اس سے وہ انتہائی فراغت اور آسودہ حالی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

نواب باقر علی خاں کا دولت خانہ کان پور کے تمام باکمال ادیبوں اور شاعروں کا مرجع و مرکز تھا۔ مفتی سیّد محمد عباس بھی جب کان پور آتے تو ان ہی کے دولت خانہ پر قیام کرتے تھے۔ ان کا یہ قیام ہفتوں اور بعض اوقات مہینوں بھی ہوا کرتا تھا۔ غالب نے مفتی سید محمد عباس کو قاطع برہان کے مطبوعہ اجزا جس لفافہ میں لپیٹ کر بھیجے تھے اس پر یہ پتہ درج کیا تھا۔

"در کان پور بہ مکان نواب باقر علی خاں صاحب موصول و بخدمت خدام خدامی جناب مفتی میر عباس صاحب زادہ و مجدہ مقبول و در بارہ بخشیدن اطلاع رسیدن ارمغان عنایت مبذول باد۔ ۴ر اگست ۱۸۶۲ء"

اس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ غالب پہلے ہی سے نواب باقر علی خاں سے واقف تھے اور ان کو اس بات کا علم تھا کہ مفتی سیّد محمد عباس کا قیام ان ہی کے دولت خانے پر رہتا ہے۔ نواب باقر علی خاں کو بھی غالب سے ارادت تھی۔ اور وہ ان کی شاعری کو پسند کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مفتی سید محمد عباس نے ان کو غالب کا ایک شعر سنایا تو انہوں نے اس کی دل کھول کر داد دی۔ مفتی سید محمد عباس غالب سے ایک خط میں اس واقعہ کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

"نواب مستطاب معین الدولہ انتظام الملک سید باقر علی خاں بہادر ظفر جنگ کہ نکتہ رسے است یکتا و مسیحا نفسی است با ہمت بنا برایں شعر

از من بمن سلام و ہمہ از آں بمن پیام

رنج دلی مباد پیام و سلام ما

وجد کردند و مکرر خواندند ۔"

۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کے خاتمہ کے بعد انگریزوں نے بے گناہ شہریوں کو اذیتیں پہنچانے اور ہراساں کرنے کی جو مہم چلائی تھی، اس کے دوران نواب باقر علی خاں کو بھی بغاوت کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور پھانسی کی سزا تجویز کی گئی لیکن اس سے پہلے کہ انہیں پھانسی دی جاتی ۱۲۷۷ھ میں وہ رہا کر دیئے گئے۔ اس واقعہ کے بعد نواب باقر علی خاں نے کان پور میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے عراق چلے گئے جہاں ۱۸۶۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

(رسالہ آجکل اگست ۱۹۵۱ء)

(مزید تفصیلات کے لئے تجلیات دیکھئے)

مولانا باقر

مولانا باقر کے اسلاف ہمدان کے ایک ایسے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلۂ نسب اخوند محمد لاشو ابن اخوند محمد یوسف بن محمد ابراہیم سے ہوتا ہوا آنحضرت صلعم کے جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسی تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد کا نام اخوند محمد اکبر تھا جو اخوند محمد اشرف کے صاحبزادے تھے۔

مولانا باقر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اخوند محمد اکبر سے حاصل کی، جنہوں نے دہلی میں تبلیغ و تدریس کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ پھر میاں عبدالرزاق سے رجوع ہوئے اور علومِ دینیہ کی تکمیل کی، ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج میں داخلہ لیا اور وہیں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ حد درجہ دلکش اور پسندیدہ تھا۔ اس سے متاثر ہو کر گورنر جنرل نے ان کو خلعت سے سرفراز کیا۔ مولانا باقر ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۶ء تک اسی حیثیت میں کام کرتے رہے۔ بعد میں دہلی کے کلکٹر حاکس متکاف

نے ذاتی کوششوں سے کام لے کر ان کو تحصیل دار بنا دیا، جس کے بعد انھوں نے بندوبست کے ناظم کے عہدہ تک ترقی کی۔ سولہ سال تک اسی عہدہ پر کام کرنے کے بعد تنخواہ کی کمی کے پیش نظر ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔

مولانا باقر کو ابتدا ہی سے تالیف و تصنیف اور نشر و اشاعت کا شوق تھا، اس کی تکمیل کی صورت یہ ہوئی کہ دہلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر دہلی کالج کے پریس کو فروخت کرنا چاہتے تھے، مولانا باقر نے ان سے یہ پریس خرید لیا اور کچھ دنوں تک اسے مطبع جعفریہ اور مطبع اثنا عشریہ کے نام سے چلاتے رہے۔ جب انھوں نے ۱۸۳۶ء میں دہلی اخبار شائع کرنا شروع کیا تو اس کا نام دہلی اردو اخبار پریس ہو گیا

دہلی اردو اخبار میں غالب سے متعلق جتنی بھی اطلاعات شائع ہوئی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا باقر کے تعلقات غالب سے اچھے نہیں تھے۔ انھوں نے ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کی اشاعت میں غالب کی گرفتاری سے متعلق لکھا:

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گذر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے۔ مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے، جو سابق بڑی علتوں تک سپرد ہوتے تھے۔ کہتے ہیں بڑا قمار ہوتا تھا، لیکن پاس رعب اور کثرت مردماں کے یا کسی اور طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانیدار کے پاس بہت سے رئیسوں کی سعی و سفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا، سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ حسب قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، نہ ادا کریں تو چار مہینے کی قید"

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کو عام کرنے اور آگے بڑھانے میں مولانا باقر کے دہلی اردو

اخبار نے نمایاں کردار ادا کیا - خود مولانا باقر بھی اس سلسلہ میں پیش پیش تھے ۱۱ر فروری کو مجاہدوں نے دہلی کالج پر حملہ کر کے ہزاروں روپے کی کرسیاں، میزیں، تصویریں، دوائیں اور کتابیں تباہ کر دیں - اس ہنگامے کے دوران کالج کے پرنسپل مسٹر ٹیلر مولانا باقر کے گھر پہنچا دیے گئے - انھوں نے ایک رات مسٹر ٹیلر کو اپنے امام باڑہ کے تہہ خانے میں رکھا، لیکن دوسرے روز ہندوستانی لباس پہنا کر رخصت کر دیا - وہ ان کے گھر سے نکل کر بیرم خاں کی کھڑکی تک پہنچے ہی تھے کہ مجاہدوں نے ان کو پہچان لیا، اور ان پر اس قدر لٹھ برسائے کہ وہ موقع ہی پر ڈھیر ہو گئے -

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور کشمیری دروازے کے راستے شہر میں داخل ہو کر ہندوستانیوں کو گولیاں مارنا اور گرفتار کرنا شروع کر دیا - مولانا باقر بھی ۱۴ یا ۱۶ر ستمبر کو گرفتار کر لئے گئے - ان کو حاکم کے سامنے پیش کیا گیا - حاکم نے پوچھا ٹیلر کہاں ہے ؟ انھوں نے بتایا کہ جب تک وہ میرے پاس رہے زندہ تھے، مکان سے نکل کر بھاگے، لوگوں نے ان کو مار دیا - ان کے اس بیان کے بعد ان کی ساری جائیداد کی ضبطی کا حکم دیا اور پستول اٹھا کر ان کو گولی مار دی - مولانا باقر کی شہادت پر محمد اسمٰعیل ضمیر شکوہ آبادی نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ لکھا :

جناب فاضل کامل محمد باقر، سپہر علم و فضیلت کے اختر تاباں
حدیث و فقہ کلام و مناظرہ میں وحید مصنفات سے انکی ہے مثل شمس عیاں
خلیق و ناصر آل رسول و تعزیہ دار فدائے نام نبی عاشق شہ مرداں
حلیم و قابل و محتاط و مجمع حسنات جہان دانش و فضل و مروت و احساں
خدا کی راہ میں مقتول ہو کے آخر کار گئے جہان سے وہ سوئے روضۂ رضواں

لکھی ضمیر نے یہ ان کے مرگ کی تاریخ
شہید و متقی و عالم علوم نہاں

مولانا باقر نے حدیث و فقہ کے علاوہ مناظرہ اور شیعی عقاید پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کو شعر و شاعری سے بھی ایک گونہ دلچسپی تھی، وہ فارسی اور اردو، دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، محرم کی دس تاریخ کو سلام یا مرثیہ کہنا ان کے معمولات میں سے تھا۔ ان کے ایک سلام سے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:

اے سلامی صبر سبط مصطفیٰؑ پر ختم ہے
ظلم و کیں بجرائی شمر بے حیا پر ختم ہے
کیوں نہ ہو کحل البصر خاک شفا کونین کی
روشنی چشم بھی اس طوطیا پر ختم ہے
دے کے سر نانا کی امت کو چھڑایا نار سے
رحم اسے کہئے کہ اس نور خدا پر ختم ہے
سر سناں پر بھی سنا قرآن ہی پڑھتا رہا
یاد حق باللہ شہ معجز نما پر ختم ہے
زیر خنجر دیکھ شہ کو بولے سب جن و ملک
صبر و تسلیم و رضا آل عبا پر ختم ہے
کیا کہے باقر اب آگے وصف آل مصطفیٰؑ
وصف ان کا خاص ذات کبریا پر ختم ہے

(تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ہند ص ۲۳۲،
مضمون آغا محمد باقر ادبی دنیا لاہور،
دہلی اردو اخبار ۱۷ مئی ۱۸۵۷ء
تاریخ صحافت اردو جلد اول ص ۳۰۱
دہلی اردو اخبار ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء)

راجہ بلوان سنگھ

راجہ بلوان سنگھ، راجہ چیت سنگھ والئ بنارس کے بیٹے تھے۔ جب راجہ چیت سنگھ کے والد راجہ بلونت سنگھ نے انتقال کیا تو شجاع الدولہ نے ان کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدے بالائے طاق رکھ دیے اور مکروتزویر سے بنارس پر قبضہ کرلینا چاہا، لیکن انگریزوں نے قدیم معاہدوں کی پابندی کرتے ہوئے ان کو بنارس کا راجہ تسلیم کرلیا۔

۱۷۷۸ء میں وارن ہسٹنگز نے راجہ چیت سنگھ سے فوجی اور مالی مدد چاہی وہ اس سلسلہ میں قاصر رہے جس پر وارن ہسٹنگز نے فوج کشی کردی جس کے نتیجہ میں راجہ چیت سنگھ کو راہ فرار لینا پڑی۔ وہ بنارس سے نکل کر گوالیار پہنچے جہاں مہاراجہ نے پانچ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر مقرر کردی۔

چیت سنگھ کے انتقال پر ان کے صاحبزادے راجہ بلوان سنگھ اور ان کی رانی آگرہ آ گئے۔ غالب کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ راجہ بلوان سنگھ اور غالب کا بچپن ایک ساتھ گزرا ہے۔ وہ دونوں آگرہ کے ایک ہی محلہ میں ایکدوسرے کے بہت قریب رہتے تھے۔ غالب نے منشی شیونارائن آرام کے نام ایک خط میں لکھا ہے :-

"ایک کٹھرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹھرہ کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے"

راجہ بلوان سنگھ چالیس سال تک آگرہ میں قیام پذیر رہے۔ اس دوران انکو شاعری کا بھی شوق ہوا اور انھوں نے حاتم علی بیگ مہر کی شاگردی اختیار کرلی۔ انگریزوں نے ان کے لئے دو ہزار روپے سالانہ مقرر کردئے۔ غالب کو بلوان سنگھ

سے صرف اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ حاتم علی بیگ مہر کے سرپرست اور قدرداں تھے اور انھوں نے ان کے لئے پچاس روپے ماہوار کی رقم مقرر کی تھی - غالبؔ حاتم علی بیگ مہر سے اکثر ان کی خیریت دریافت کرتے رہتے تھے - ایک خط میں انھوں نے لکھا ہے :

"راجہ بلوان سنگھ کا بھی حال لکھنا ضرور ہے - کہاں ہیں ؟ اور وہ دو ہزار روپے جوان کو سرکارِ انگریزی سے ملتا تھا اب بھی ملتا ہے یا نہیں"

خم خانۂ جاوید کے مولف کو ان کی دو تصانیف کا پتہ چل سکا ہے - ان کے بیان کے مطابق دیوان گل ریاض کے نام سے عظیم الاخبار پریس آگرہ سے ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوا تھا، ایک کتاب چندر چتر بھی ان سے یادگار تھی - ان کے چند شعر ملاحظہ کیجئے :

کالا ہے ماہتاب نہ گورا ہے ماہتاب
پردہ نشیں سے پوچھیں گے کیسا ہے ماہتاب

عاشق کا رنگ زرد ہے پوشاکِ یار زرد
پھولی بسنت باغ میں آئی بہار زرد

کیسا خیال، ہجر شبِ وصل آ گیا
یا سُرخ تھا میں یا کہ ہوا ایک بار زرد

شعر چوٹی کے سُن کے کہتا ہے
میرے پیچھے پڑی بلا کیسی ؟

میں نے دشمن بغل میں پالا تھا
آہ اس دل نے کی دغا کیسی ؟

سُرخ ہاتھوں کو کر چلے خوں سے
اور پھر چاہیے حنا کیسی ؟

زلف کی یادِ حکایت آئی
اور شب بڑھ گئی، آفت آئی

اقلیم کبھی زیرِ نگیں رہتی تھی رلبہ
اب حرف بھی غالب ہے نگیں پر نہ رہینگے

(خم خانۂ جاوید سوم ص۲۹۶، ص۲۰۲،
خطوطِ غالب ص۲۳۴)

عباس علی خاں بے تاب

سیّد محمد عباس علی خاں نام اور بے تاب تخلص تھا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے حقیقی چچا زاد بھائی اور نواب کلب علی خاں کے حقیقی ماموں تھے۔ ان کے والد کا نام سیّد عبدالعلی خاں تھا جو سیّد غلام محمد خاں کے صاحبزادے تھے۔ امیر مینائی کے تذکرہ انتخاب یادگار کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۴۶ برس کی تھی۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ ان کا سالِ ولادت ۱۲۲۳ھ رہا ہوگا۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی اور وہیں ان کو شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور اردو کلام پر حکیم مومن خاں مومن سے اصلاح لینے لگے، ان کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک کسی سے مشورہ نہیں لیا۔

۱۸۴۷ء کے بعد بے تاب نے بعض وجوہ کی بنا پر دہلی کی سکونت ترک کر دی۔ اور لکھنؤ جا کر بس گئے۔ مرزا غالب نے ۱۸۶۵ء میں رام پور کا دوبارہ قصد کیا تو انہوں نے ان سے خط و کتابت کی اور ان کو اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجا۔ مالک رام کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنا دیوان غالب کے پاس اصلاح کے لئے بھیجا تھا۔ اور ان کی وفات تک ان سے مشورہ کرتے رہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی ناکام ہوئی اور انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا تو نواب یوسف علی خاں ناظم نے ان کو لکھنؤ سے بلا لیا اور وہ رام پور میں حاکم صدر بنائے گئے، اور ۲۹ رجب ۱۳۰۰ھ کو دن کے وقت انتقال کیا۔ ان کا دیوان گلدستہ باغ جناں کے نام سے ان کے انتقال کے ایک سال بعد شعبان ۱۳۰۱ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے گلزار عشق اور بہار عشق کے عنوان سے دو مثنویاں بھی لکھی تھیں، جو غیر مطبوعہ بیان کی جاتی ہیں۔

بے تاب کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

ہر بات میں برہم کوئی اتنا نہیں ہوتا
آپس میں ذرا سمجھو کیا کیا نہیں ہوتا۔

یوں کون ستاتا ہے مری جان کسی کو
خوبی پہ کسے اپنی بھروسہ نہیں ہوتا

ہمیں کرنا تھا جو وہ کر بیٹھے!
آپ باتیں بنائیں گھر بیٹھے

وفا دار ناصح مبارک تمہیں
ہمیں تو وہی بے وفا چاہیئے

مقابل میں تیرے تو اے بد گو
تجھی سا کوئی بے وفا چاہیئے

بجا ہیں تمہارے سب ارشاد پر
ذرا اور کی بھی سنا چاہیئے

ذکر اس کا ہو کچھ بھی تو مزا ہے
کاش ناصح ہی دل کو بہلائے

اور ان کا گلا ہوا الٹا !

اور شکوہ بھی کر کے پچھتائے

انتخاب یادگار ص ۴۷؛ اخبار الصنادید ص ۱۷۱؛ خم خانۂ جاوید اوّل ص ۴۳۲

مکاتیب غالب ص ۹۹؛ گلشن بے خار ص ۳۴، ۳۵؛ طبقات الشعرائے ہند ص ۳۹۶

غلام غوث خاں بے خبر

خواجہ غلام غوث خاں نام تھا اور بے خبر تخلص، ان کے والد ظہور اللہ خاں کشمیری ترک وطن کر کے لہاسہ کے راستے نیپال پہنچے اور یہیں ۱۲۴۰ھ میں بے خبر کی ولادت ہوئی، ۱۲۴۴ھ میں ظہور اللہ خاں نے نیپال سے بنارس کا قصد کیا۔ بے خبر کی تمام تر تعلیم و تربیت بنارس ہی میں ہوئی۔

بے خبر کے خالو خان بہادر مولوی سید محمد خاں لیفٹیننٹ گورنر شمالی و مغربی کے میر منشی تھے۔ انھوں نے ۱۸۴۰ء میں بے خبر کو اپنا نائب مقرر کروا دیا۔ اس کے چند سال بعد وہ اپنے خالو کی جگہ میر منشی کے عہدہ پر کام کرنے لگے۔

بے خبر نے اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامہ میں نہایت وفاداری کے ساتھ ملازمت کی اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس خیر خواہی کے صلہ میں ان کو خلعت ہفت پارچہ دی گئی۔ اس کے علاوہ ۱۸۷۷ء میں تمغۂ قیصری اور ذوالقدر خاں کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔

بے خبر ۴۵ سال تک اپنی ملازمت پر نہایت ایمانداری سے کام کرتے رہے۔ ۱۸۸۵ء میں ان کو وظیفۂ حسن کارکردگی پر سبکدوش کیا گیا تو نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور نے مدار المہامی کی پیش کش کی، لیکن انھوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور علمی و ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹ شوال ۱۳۱۲ھ کو

انتقال کیا اور دائرہ محمدی الہ آباد میں دفن ہوئے - ان کی قبر پر کتبہ لگا ہوا ہے، اس کے اس مصرعہ "گفتند حوریاں جناں خواجہ بہشت" سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے ان کی زندگی میں ان کا مجموعۂ نظم ونثر فارسی 'خونابہ جگر' اور اردو خطوط کا مجموعہ فغان بے خبر کے نام سے شائع ہوا تھا - ان کی تصانیف میں اشک لعل و گہر اور انشائے بے خبر بھی لائق ذکر ہیں - بے خبر اور غالب کی ملاقات کے زمانے کا صحیح تعین مشکل ہے - خود بے خبر کے بعض خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت ان کی غالب سے ملاقات ہوئی تھی - غالب کا سامعہ باطل ہوگیا تھا اور وہ لکھ کر باتیں کرتے اور سمجھتے تھے

جن دنوں منشی ممتاز علی خاں نے غالب کے خطوط کا مجموعہ عود ہندی چھاپنے کا قصد کیا - بے خبر نے خطوط کی فراہمی میں بڑی سرگرمی دکھائی - اسے ان کی کوشش ہی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ غالب کے خطوط بہت بڑی تعداد میں عود ہندی میں شامل ہوگئے اس سلسلہ کی تفصیل خود بے خبر کے اپنے خطوط میں ملتی ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً غالب کو لکھے ہیں - ایک خط میں لکھتے ہیں :

> "میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا، کاپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبر آباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں، خود سب کو دیکھا، جو مضامین لائق اعلاق کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا - کاتب لکھ رہا ہے - میں مقابلہ کرتا ہوں - اب تک بڑے ورقوں کے دس جزو مکمل ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں - امید ہے ادھر اگست کا آغاز ہو ادھر اس مجموعہ کا انجام ہو - اس وقت بھی مقابلے میں مصروف ہوں - پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ صاحب ذکا، میاں داد خاں صاحب سیاح ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور

ہوں گے۔ آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بہ سبیل ڈاک
میرے پاس بھیجدیں۔ رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے۔ شاید وہاں
سے بھی کچھ آجائے۔"

منشی ممتاز علی خاں نے بھی عود ہندی کے دیباچہ میں بے خبر کی کوششوں کا
اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ

"خواجہ غلام غوث خاں بہادر بے خبر تخلص جو جناب معلی القاب گورنر
بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت
غالب صاحب کے مخلص با اختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین
اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا۔"

بے خبر کی نثری تصانیف دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے نظم میں بھی بہت کچھ
کہا ہوگا۔ بدقسمتی سے ان کی اردو نظم کا مجموعہ ملتا ہے نہ فارسی نظم کا۔ بڑی مشکل سے
چند فارسی شعر دستیاب ہو سکے ہیں۔

چشم کہ باز شد زخواب فتنہ ازو بہ چارسواست
پردہ زرخ کہ برکشاد مہر زشرم زرد روست

رفت خرد بہ آب رفت عارض شرمگیں کہ شست
عرق آب حیرت است آئینہ پاکہ روبروست

جامہ کہ کرد زیب تن جیب درید پیرہن
بند قبا کہ بستہ است نکہت گل بہ بند اواست

چہرہ زمے کہ برفروخت نشۂ شوق شد بلند
زلف کہ بوئے پر فشاند موج نسیم مشکبو است

تیغ نگہ کہ آب دار گشتہ فگار سینہ ہا

نوکِ مژہ کہ تیز کرد دامنِ زخم بے رفوست

(ادبی خطوط غالب ص۲۱۵ ۲۱۶ ، عودِ ہندی ص۳
عالمگیر سالنامہ ۴۴ء ، خم خانۂ جاوید ص۲۳۷ ، ۲۳۸
آجکل فروری ۵۸ء)

پیر جی قمرالدین دہلوی

قمرالدین دہلوی کا تخلص پیرجی تھا وہ لوگوں کے گھروں پر جا کر ان کے بچوں کو پڑھاتے تھے، اس بنا پر ان کا تخلص پیرجی کے عرف سے بدل گیا اور لوگ ان کو اسی عرف سے پکارنے لگے۔ ان کو معلمی سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے اخراجات پورے کر سکیں، اس لئے انھوں نے کتابوں کی خرید و فروخت کا بھی کاروبار شروع کر رکھا تھا اور اسی سلسلے میں ان کی غالب سے ملاقات ہوئی تھی۔ میر یوسف علی خاں ناظم والیٔ رام پور غالب کے شاگرد تھے۔ جب ان کا دیوان شائع ہوا تو میر مہدی مجروح نے غالب سے اس کی ایک جلد مانگی اس پر غالب نے ان کو لکھا:

"نواب یوسف علی خاں ناظم کا دیوان میرے پاس کہاں، نواب صاحب نے بر سبیل ارمغاں مجھے ایک ورق بھی نہیں بھیجا، یہاں کچھ نسخے بکنے آگئے تھے۔ میں نے ایک مول لے کر نواب مصطفیٰ خاں کو جہانگیر آباد بھیجا تھا۔ اب محمد بخش اور پیرجی سے کہہ دوں گا۔ اگر کسی نے لا دیا تو ایک جلد سرفراز حسین کو بھیج دوں گا"

پیرجی نے ۱۲۹۸ھ میں انتقال کیا۔ وہ قربان علی بیگ سالک اور غالب دونوں سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

بیاں کیوں کر ہو مجھ سے ستم گر سوزِ پنہاں کا

کر تیرے ہجر میں کیا حال ہے میرے دل و جاں کا
رہ و رسم محبت سے خبر تم کو نہیں اصلا
ٹھکانہ زاہدو کیا ہے تمہارے دین و ایماں کا

وہ کیا غیر سے رشتۂ مہر توڑیں کہ یہ بھی نزاکت کے شایاں نہیں

(خطوطِ غالب صفحہ ۲۱۳ ، تلامذۂ غالب صفحہ ۔
خمخانۂ جاوید دوم صفحہ ۱۳ ۔)

نواب تجمّل حسین خاں

نواب تجمّل حسین خاں جن کا خطاب ظفر جنگ تھا - نواب خادم حسین خاں شوکت جنگ والی فرخ آباد کے بیٹے تھے - ان کی تاریخ پیدائش یکم جمادی الثانی ۱۲۳۷ھ مطابق ۱۸۲۲ء ہے - ابھی ان کی عمر دو سال سے بھی کم تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا - انگریزی حکام کی تجویز کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت اور متعلقین کی خدمت کے لئے ممتاز العمارت قاضی سعیدالدین خاں کو مقرر کیا گیا - تین سال تک وہ اس خدمت پر مامور رہے - ان کے معزول ہونے پر قاضی ابوالحسن خاں کی تقرری عمل میں آئی - ان کے بعد ان کی خدمت احمد یار خاں فرزند ذوالفقار خاں مرحوم کے سپرد کی گئی ۔

نواب تجمّل حسین کے ساتھ غالب کے تعلقات بہت اچھے تھے - غالب نے ایک غزل میں ان کی مدح میں ایک قطعہ شامل کر کے ان کو بقائے دوام دیدی ہے قطعہ یہ ہے:

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کیلئے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے
نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کیلئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش　　بنیں گے اور ستارے اب آسماں کیلئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے　　سفینہ چاہیئے اس بحر بیکراں کیلئے

نواب تجمل حسین خاں نے ایک مرتبہ غالب کو فرخ آباد آنے کی دعوت بھی دی تھی اس کی تصدیق خود غالب کے ایک فارسی خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے احمد حسین میکش کو لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

"امیر سلطان شکوہ نصیر الدولہ معین الملک تجمل حسین خاں بہادر حشمت جنگ فرخ آباد بلا رہے ہیں، میں نے ان کے محبت کے تقاضے سے جانا منظور کر لیا ہے اور تمہیں بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں لہذا پاٹوڈی سے اسی ہفتہ دہلی پہنچ جاؤ"

لیکن غالب کسی وجہ سے فرخ آباد نہیں جا سکے۔

نواب تجمل حسین خاں نے بہت مختصر عمر پائی، صرف پچیس سال زندہ رہے۔ ۱۸ ذی قعد ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۸۴۶ء کو انتقال کیا۔ عبدالغفور نساخ کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب تجمل حسین خاں کو شاعری کا بھی شوق تھا اور وہ ظفر تخلص کرتے تھے۔ نساخ نے ان کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

اچھا نہیں ہے دامنِ محشر کا چھیننا
چھوڑو نہ پائنچہ دم رفتار ہاتھ سے

(سخن شعرا صفحہ ۳۰۱، عہد بنگش صفحہ ۲۰۵

دیوان غالب صفحہ ۱۳۳، کلیات نثر فارسی صفحہ ۲۱۶)

محمد حسین خاں تحسین

محمد حسین خاں نام تھا اور تحسین تخلص، دہلی کے کوچۂ رحمان میں مصوروں کی حویلی میں

رہتے تھے۔ قادر بخش صابر نے اپنا تذکرہ ۱۲۷۰ھ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ ان کو جوان سعادت مند، کان حیا اور معدن علم لکھتے ہیں۔ ان ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تحسین نے کتابیں چھاپنے کا کارخانہ اپنے کاشانۂ دولت میں مقرر کیا اور اس کا نام مطبع مصطفائی رکھا۔ تحسین نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد میرٹھ میں مطبع احمدی جاری کیا اور دہلی سے وہاں چلے گئے۔

تحسین اور غالب میں بڑی دوستی تھی۔ غالب نے اپنے دیوان کے تیسرے ایڈیشن کی طباعت کی اجازت تحسین کو دی تھی۔ انھوں نے تیسرا ایڈیشن ۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء کو شائع کیا۔ یہ ایڈیشن اتنا غلط چھپا کہ غالب نے خود ایک نسخہ کی تصحیح کر کے ان کو پھر چھاپنے کے لئے دیا۔ وہ اسے کہیں اور سے چھپوا دینا چاہتے تھے۔ اس لئے غالب نے اسی تصحیح شدہ نسخے کے حاشیہ پر ان کے نام اپنے قلم سے یہ عبارت لکھ دی۔

"جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات دن کی محنت سے مَیں نے اس نسخہ کو صحیح کیا ہے۔ غلط نامہ بھی اس میں درج کر دیا گیا ہے گویا اب غلط نامہ بیکار محض ہو گیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت کیا، میرا بیان کیا، میر فخر الدین کا اعتبار اب ضروری نہیں۔ کس واسطے کہ اب یہ کتاب اور مطبع میں چھاپی جائے گی۔ یہ مجلد گویا مسودہ ہے۔ اسی کو بھیج دیجئے۔

غالب ۱۲"

تحسین نے یہ نسخہ مطبع نظامی کانپور کو بھیج دیا۔ جہاں سے وہ جون ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ تحسین کی منشی نبی بخش حقیر سے بھی دوستی تھی۔ وہ اکثر مومن علی صدر امین کول علیگڑھ سے ملنے کے لئے علیگڑھ جاتے آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ منشی نبی بخش حقیر نے اپنی غزل اصلاح کے لئے تحسین کے ہاتھ سے غالب کے پاس بھجوائی جس کی غالب نے بہت تعریف کی اور اس شعر کو پسند کیا:

بڑھ گئی تعظیم میری امتناعِ دخل سے
اٹھ کھڑے ہوتے ہیں مجھ کو اس کے درباں دیکھ کر

تحسینؔ کا ذکر بہت کم تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ ان کے صرف یہی شعر دستیاب ہو سکے ہیں:

آزار ہوا اس کو گر عشقِ بتاں کا
بے طور ہے نقشہ دلِ بیتاب و تواں کا

جب بت سے نہ راضی ہوں تو بت خانے سے کیا کام
تحسینؔ چلو کعبہ کو جھگڑا ہے کہاں کا

اے دل تو عشق کیجو مگر دیکھ بھال کر
عاقل کو چاہیے کہ کرے فکر دور کا

لب کی خوبی میں کیا سخن ہے پر
فتنۂ روزگار ہیں آنکھیں

نہ کیوں کر بچائے جاں ہمدم
ایک خنجر گذار ہیں آنکھیں

صیاد اس طرح نہ جو گرم عتاب ہو
کیوں آشیاں چمن میں ہمارا خراب ہو

تحسینؔ ان کو دیکھنے جاتے تو ہو مگر
ایسا نہ ہو کہ جاں کو وہی پھر عذاب ہو

خیالِ بتاں دل میں رکھتے ہو تحسینؔ
مگر تم بھی رسوا ہوا چاہتے ہو

ہوئے ذلیل تو عزت کی جستجو کیا ہے

کیا جو عشق تو پھر پاسِ آبرو کیا ہے

اگر نہیں ہے تجھے ذوقِ میکشی تحسین

تو تیرے ہاتھ میں یہ ساغر و سبو کیا ہے

(گلستانِ سخن اول ص۳۳۴، ص۳۳۵،

نادرات غالب ص۱۳۸، خم خانہ جاوید دوم ص۳۵

ہندوستانی ۱۹۲۶ ص۹۷، ص۹۸)

میر تراب علی خاں

سالار جنگ اور ان کے اہل خاندان کو حیدر آباد دکن کی تاریخ میں جو سیاسی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کا ذکر بے محل ہوگا۔ غالب کے ممدوح میر تراب علی خاں سالارِ جنگ میر محمد علی خاں شجاع الدولہ کے بیٹے، نواب منیر الملک ثانی کے پوتے اور میر عالم بہادر کے نواسے تھے، ان کی والدہ کا نام زینت النساء بیگم تھا۔ وہ ۲ رجنوری ۱۸۲۹ء مطابق ۲۵ رجمادی الثانی ۱۲۴۴ھ کو پیدا ہوئے، ابھی ان کی عمر تین سال کی تھی کہ ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا جس پر ان کے جد بزرگوار نے ان کو اپنی پرورش میں لے لیا لیکن وہ بھی اپنے بیٹے کے غم میں ایک سال سے زائد عرصہ زندہ نہیں رہ سکے۔ جس کے نتیجہ میں میر تراب علی خاں کی تعلیم و تربیت کا بوجھ ان کے چچا میر عالم علیخاں کے سر آ پڑا۔

۱۷ رشعبان ۱۲۶۱ھ کو میر عالم علی خاں نے انتقال کیا۔ جس پر آصف جاہ چہارم ناصر الدولہ نے میر تراب علی خاں کو طلب کر کے بلا درخواست مدار المہامی کی خدمت سپرد کی اور سالار جنگ کے آبائی خطاب سے سرفراز کیا۔ اس وقت انکی عمر ۲۴ سال تھی۔

میر تراب علی خاں نے مدار المہامی کے منصب پر فائز ہونے کے بعد تمام انتظامی

شعبوں میں اصلاحیں کیں اور مالی امور کو درست کر کے چند ہی سال میں ریاست کو اس قابل کیا کہ وہ مقروض ہونے کی بجائے اپنے اخراجات آپ پورے کرنے لگی جس کے نتیجہ میں پہلی مرتبہ اس کی تہذیبی، سماجی اور معاشرتی سرگرمیوں نے ترقی کی جانب قدم بڑھایا ـــــــــ

ناصر الدولہ نے ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا، ان کے صاحبزادے افضل الدولہ مسند نشین ہوئے' ان کی مسند نشینی کے چند ہی روز بعد غدر کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے اکثر علاقے اس کی لپیٹ میں آ گئے جس کے نتیجہ میں اورنگ آباد میں بھی چند لوگوں نے انگریزوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کر دیا۔ تراب علی خاں نے انکو نہ صرف گرفتار کروایا بلکہ جب وہ گرفتار ہو کر ان کے سامنے پیش کئے گئے تو ان کو سرکار انگریزی کے حوالے کرنے کی بھی ہدایت کی ۔ اس واقعہ سے حیدرآباد کے رہنے والوں میں سعیٔ انقلاب کی آتش تیز تر ہو گئی اور ان کی طرف سے خبردار کیا گیا کہ اگر انگریزوں کے خلاف اس وقت جہاد نہیں کیا گیا تو وہ شاہ اور وزیر دونوں کی جان کا لحاظ ہرگز نہیں کریں گے ۔ اس دھمکی کے بعد تراب علی خاں نے شہر کے اطراف سپاہیوں کو متعین کر دیا اور ہدایت کی کہ وہ جس ہنگامہ آرا کو دیکھیں گولی ماردیں۔ اس کے باوجود طرۂ باز خاں، مولوی علاءالدین اور ان کے پانچ ہزار ساتھیوں نے مسلح ہو کر ریذیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ کچھ دنوں بعد طرۂ باز خاں اور مولوی علاءالدین گرفتار ہو گئے۔ اوّل الذکر کو گولی ماردی گئی، دوسرے کو عبور دریائے شور کا حکم سنایا گیا۔

میر تراب علی خاں نے حیدرآباد میں سعی انقلاب کو ناکام بنایا تھا۔ اس کے صلہ میں انگریزوں نے اظہار خوشنودی کے طور پر تیس ہزار روپے کے تحفے ارسال کئے ۱۸۶۶ء میں دوسرے والیانِ ریاست اور امرائے ہند کی طرح سر اور ستارۂ ہند کا خطاب بھی دیا۔ ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر اکیس توپوں کی سلامی ان کا اعزاز

رکھی گئی

افضل الدولہ نے ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا جس پر ان کے ڈھائی سالہ صاحبزادہ میر محبوب علی خاں کی مسند نشینی عمل میں آئی - اس دوران میر تراب علی خاں نے دوہری خدمات انجام دیں - ایک طرف میر محبوب علی خاں کی شاہانہ تربیت' دوسری طرف ریاست کے انتظامی امور کی دیکھ بھال -

میر تراب علی خاں نے ۸ رمئی ۱۸۸۳ء کو انتقال کیا - ان کے انتقال کے وقت کی پوری تفصیل ان کی فرانسیسی نرس نے اپنی خود گزشت میں درج کی ہے اسے کارنامہ سروری کے مولف نے بھی نقل کیا ہے - نرس لکھتی ہے -

"میر تراب علی خاں نے انتقال سے ایک روز پہلے شنبہ کو ریذیڈنسی کے ظہرانے میں شرکت کی - چہارشنبہ کو تالاب میر عالم سے سے واپس آکر رات کو علیل ہوئے - جمعرات کو صبح سوا سات بجے انتقال کیا - ان کو بلاشبہ زہر دیا گیا - کوئی علامت مرض ہیضہ کی موجود نہیں تھی - بجز اس کے کہ انھوں نے خود انگلی حلق میں ڈال کر قے کرنا چاہی تھی - وہ شدت پیاس کے ساتھ حلق اور منہ کی سوزش کی بھی شکایت کرتے تھے - ڈاکٹر اس وقت طلب ہوئے جب زندگی کی کوئی امید نہیں رہی - ان کے انتقال کی خبر زنانے میں پہنچی تو وہاں موجود آٹھ سو عورتوں نے شدت غم میں زمین پر لوٹنا شروع کر دیا ' اپنے جسم کے کپڑے پھاڑ ڈالے ' چوڑیاں توڑ دیں اور ایک ہفتہ تک ماتم کیا -"

میر تراب علی خاں کے انتقال پر متعدد لوگوں نے مرثیہ لکھے - ان کی وفات کی تاریخیں نکالیں - جنازہ وزیر اعظم سے بھی ان کے سال انتقال کے اعداد برآمد ہوتے ہیں -

غالب نے شروع ہی میں یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ریاستوں اور درباروں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر کے ہی کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے نظم کی مشہور صنف قصیدہ کا سہارا لیا، جہاں انھوں نے متعدد امیروں اور نوابوں کے قصیدے لکھے، وہیں سالار جنگ کا بھی قصیدہ لکھا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اس قصیدہ کی تحریک کسی اور شخص نے کی تھی۔ غالب کی افتاد طبع سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے از خود یہ قصیدہ لکھ کر سالار جنگ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی توقعات پوری نہیں ہوئیں تو انھوں نے اس کا شکوہ ان الفاظ میں کیا۔ ۱۰ ر ربیع الاول ۱۲۸۰ھ کو حبیب اللہ ذکا کو لکھتے ہیں:

"مختار الملک (سالار جنگ) کو قصیدہ بھیجا، کچھ قدر دانی نہ فرمائی۔"

اس سلسلہ میں غالب نے میر تراب علی خاں کے منشی انشا مولوی موید الدین خاں سے بھی مدد چاہی اور ان سے دور دراز کا تعلق ڈھونڈ نکالا۔ ان کی کوششوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو انھوں نے ایک عرضداشت لکھی جو ان کے کلیات نثر فارسی میں شامل ہے۔ اس کے بعد انھوں نے یکے بعد دیگرے دو خط میر تراب علی خاں کی خدمت میں مولوی موید الدین خاں کی وساطت سے ارسال کئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے صفر ۱۲۸۰ھ میں اپنے دیوان اردو کا ایک نسخہ بھی میر تراب علی خاں کی خدمت میں ارسال کیا۔

قصیدہ جس تمہید نامہ کے ساتھ بھیجا گیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:

"یارب در حضرت فلک رفعت دانش خدیو، خدادان خدا بوئے، دانا داور دادرس حق شناس، حق گوئی، بہرام رزم، بیرد یزبزم، جناب ہمایوں القاب نواب مختار الملک بہادر دام اقبالہ،

عذر تنہا رواں داشتن چگامہ رنگاشتن، نیایشنامہ مقبول داور فراق
صحیفہ طراز بہ بخشیدن آگہی از رسیدن صحیفہ راز منظور باد۔ ۱۲"

اس تہنیت نامہ کے بعد اصل قصیدہ شروع ہوتا ہے، جس کے ۶۳ شعروں میں چند اشعار درج کئے جاتے ہیں:

در مدح سخن چساں نگویم
شرط است کہ داستاں نگویم

از زہد و ورع سخن نرانم
از مسجد و طیلساں نگویم

صرف نمد و پلاس دارم
حرف خز و پرنیاں نگویم

مختار الملک را دریں عصر
جز آصف جم نشاں نگویم

چوں پرچم رایت تو بینم
جز اختر کاویاں نگویم

آئین شنوم گر از سروشاں
با مردم ایں جہاں نگویم

(آجکل فروری ۱۹۵۶ء، کلیات نظم غالب جلد دوم ص۹۳
کلیات نثر غالب ص۲۳۴، ص۲۳۹
ریاض مختاریہ ص۱۹۶ تا ص۲۰۰، ص۲۲۴،
کارنامہ سروری ص۲۰۶، ص۲۰۵، خطوط غالب ص۱۹۰)

مرزا ہرگوپال تفتہ

ضلع بلند شہر کے ایک قصبہ سکندر آباد کو سکندر لودھی نے آباد کیا تھا۔ اسی کے زمانے میں یہاں کا ئستھوں کے ایک مشہور خاندان نے سکونت اختیار کر لی تھی اور اپنی خدمات کے صلہ میں موروثی عہدہ "قانون گوئی" سے سرفراز ہوا تھا۔ منشی ہرگوپال تفتہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

منشی ہرگوپال تفتہ کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ ہے۔ ان کے والد موتی لال نے ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست گھر ہی پر کیا۔ ان کو فارسی سے حد درجہ دلچسپی تھی انھوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے نہ صرف فارسی سیکھی بلکہ مختلف شاعروں کے دیوان بھی پڑھے۔ نشترِ عشق کے مولف کے بیان کے مطابق نورالعین واقف بٹالوی کے دیوان کے مطالعہ نے تفتہ میں شعر گوئی کا ذوق پیدا کیا اور وہ تھوڑی سی مشق کے بعد اچھی خاصی غزلیں کہنے لگے۔ نشترِ عشق ہی کے مولف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتدا میں رامی تخلص کرتے تھے۔ جب غالب کی شاگردی اختیار کی تو اپنا تخلص بدل کر ہرگوپال تفتہ ہو گئے، لیکن غالب نے اسے پیار میں مرزا ہرگوپال تفتہ بنا دیا۔

تفتہ نے کچھ دنوں انگریزی محکمہ بندوبست میں قانون گو کی حیثیت سے کام کیا لیکن شاعری کا شوق ایسا تھا کہ وہ اس کی خاطر اس سے دستبردار ہو گئے۔ اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد ان کو ریاست جے پور کی جانب سے ملازمت کی پیش کش کی گئی لیکن یہ تعلق بھی جلد ہی منقطع کر لیا۔ ان کو غالب سے دلی خلوص تھا۔ ۱۸۶۷ء میں غالب بیمار ہوئے اور تفتہ کو خط و کتابت کے ذریعہ ان کی کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے مالی استطاعت نہ ہونے کے باوجود سکندر آباد سے دہلی کا قصد کیا اور جب تک غالب کی کیفیت اپنی آنکھوں سے خود نہ دیکھ لی، مطمئن نہیں ہوئے۔

تفتہ کا چھوٹا لڑکا بیجر سنگھ ۱۲۷۲ھ میں بیمار ہو کر انتقال کر گیا اور اس کے تھوڑے عرصہ بعد لڑکی بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ یہ صدمہ تفتہ کے لئے انتہائی صبر آزما اور حوصلہ شکن تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے صبر و ہمت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور شعر کہہ کر خود کو بہلاوہ دیتے رہے۔

۱۵ رمضان ۱۲۹۶ھ کو انتہائی کسمپرسی کے عالم میں سکندر آباد میں انتقال کیا۔ ممتاز احمد تھانوی نے اس شعر سے ان کی تاریخ وفات برآمد کی ہے ؎

سال نقلش بادل زار از خرد　　من شنیدم بے سر و پا شد سخن

تفتہ کو اردو شاعری سے دلچسپی نہیں تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا، فارسی ہی میں لکھا، ان کا صرف ایک قطعہ اردو میں ملتا ہے جو انھوں نے غالب کے انتقال پر لکھا تھا بعض لوگوں کے بیان کے مطابق انھوں نے چار دیوان یادگار چھوڑے۔ اس کے علاوہ سعدی کی گلستاں کی تضمین بھی لکھی اور بوستان کے جواب میں سنبلستان لکھا۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے :——

تیغ افتاد از کفِ قاتل　　زندگانی وبالِ گردن کیست
می دَود چار سو نمی دانم　　برقِ گرمِ تلاشِ خرمن کیست

اے اگر گویم کرا آید یقیں　　قصدِ جانم ، یار جانی میکند
دل کہ با مرگ آشنائی داشتہ　　زندگانی جاودانی میکند

اے تماشہ گاہ ایں دل روئے تو　　عالمے در دل تماشہ کردہ ایم
ما نہ تنہا دیدہ پرنم کردہ ایم　　آنچہ نتواں کرد آں ہم کردہ ایم
وارد از خود رفتگی ہا عالمے　　رفتہ ایم و سیرِ عالم کردہ ایم

(صبح گلشن ص ۸۹، روز روشن ص ۲۳۶،

خم خانۂ جاوید دوم ص ۱۱۵، تلامذۂ غالب ص ۶۵

ادبی خطوط ص ۲۱۷)

نواب تفضّل حسین خاں

نواب تفضّل حسین خاں، عنایت حسین خاں نصرت جنگ کے صاحبزادے اور والیٔ فرخ آباد نواب تجمّل حسین کے بھتیجے تھے۔ تجمّل حسین کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی اس لئے ان کے بعد ان ہی کو والیٔ ریاست تسلیم کیا گیا۔ ان کی تاریخ ولادت ۲۶ اکتوبر ۱۸۲۷ء ہے۔ انیس سال کی عمر میں ۳ دسمبر ۱۸۴۶ء کو مسند نشین ہوتے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے والد کے حوالے سے بتایا ہے کہ نواب تفضّل حسین خاں بہت شوقین اور خوش پوشاک رئیس تھے۔ کشمیر کے تاجر پہلے ان کے پاس جاتے پھر لکھنؤ کا رُخ کرتے تھے۔ نواب تفضّل حسین خاں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے دوران انگریزوں کے خلاف نمایاں جدوجہد کی۔ برجیس قدر اور نانا صاحب کے سپاہیوں کا ساتھ دیا۔ اس وقت انقلابیوں کا اصل مرکز دہلی ہوگیا تھا۔ غالب کے الفاظ میں:

"فوجیں ہر طرف سے آآ کر جمع ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کا نام لگا ہوا تھا۔ اس وجہ سے دُور دُور کے سردارانِ فوج اٹھ کھڑے ہوتے۔ فرخ آباد کے نامور امیر تفضّل حسین کو کبھی بادشاہ سے علاقۂ نیازمندی نہیں تھا۔ انھوں نے بھی دور ہی سے آستانِ شاہی کو سجدہ کیا اور خط میں اپنے آپ کو نیازمندِ قدیم لکھا۔"

جب قوم فروش اور وطن دشمن عناصر نے پے در پے دھوکے دئے، اور

انقلابیوں کی جدوجہد ناکام ہونے لگی تو تفضل حسین خاں نے جان بخشی کے وعدے پر خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۹ء میں ان پر مقدمہ چلا کر ان کو ان کی خواہش کے مطابق مکہ معظمہ بھیجدیا۔

نواب صدیق حسن خاں دسمبر ۱۸۶۸ء میں حج کے لئے گئے تو ان کی ملاقات تفضل حسین خاں سے بھی ہوئی، وہ ان کی شکستہ حالی، فقر اور تہدستی سے حد درجہ متاثر ہوئے اور ایک بیش قیمت پوشاک بہ کمال اصرار ان کی نذر کی۔

بعدازاں نواب شاہ جہاں بیگم والیٔ بھوپال نے ان کے لئے ایک رقم مقرر کی، جو مقررہ وقت پر ان کو ملتی رہی۔ انھوں نے ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

(نقش آزاد ص ۲۲۸، ص ۲۲۹، مشاہیر جنگ آزادی ص ۲۲۵

ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۸۹، ماثر صدیقی ص ۱۰۶

ترجمہ دستبو مشمولہ اردوئے معلیٰ میگزین دوم ص ۱۹۳)

نواب تفضل حسین خاں

نواب تفضل حسین خاں، محفوظ علی خاں کے بیٹے اور برکت علی خاں کے بھانجے تھے جن کا مولد خیر آباد تھا۔ نواب تفضل حسین خاں نے علوم درسیہ کی تکمیل دہلی میں کی اور ٹونک جاکر نواب وزیرالدولہ والیٔ ٹونک کے ملازم ہوگئے جس پر ان کو بہ عہدۂ سفارت اجمیر میں سر اختر لونی کے پاس متعین کیا گیا۔

مولوی عبدالقادر رام پوری نے اپنے روزنامچہ میں تفضل حسین خاں کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے:۔

"تفضل حسین خاں ذہن روشن اور طبع رسا رکھتے ہیں اور اسی کے زور میں ہر جگہ راستہ نکال لیتے ہیں۔ تحریر و تقریر اور سخن فہمی کا بھی ان کو ملکہ ہے۔ چونکہ وہ

عاقبت اندیش نہیں ہیں۔ اس لئے جتنا کچھ پاتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ خرچ کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں کینہ، رشک، فریب اور مردم آزاری سے ان کو سخت نفرت ہے۔ یہی نفرت بعض اوقات ان کے لئے بُری اور دوسروں کے لئے اچھی ہو جاتی ہے۔"

تفضل حسین خاں اور غالب میں دہلی ہی سے اتحاد و یگانگت تھی۔ وہ جب نواب وزیرالدولہ والیٔ ٹونک کے سفیر مقرر ہوئے تو غالب کو ان سے اُمید بندھی کہ ان کے ذریعے دربارِ ٹونک میں ان کا اعزاز بڑھ جائے گا۔ اس بنا پر انہوں نے ۱۲۶۱ھ میں عرفی کی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر نواب وزیرالدولہ کی خدمت میں ارسال کیا۔ نواب نے اس قصیدہ پر کوئی توجہ نہیں کی۔ غالب نے کچھ دنوں تو انتظار کیا۔ لیکن جب ۱۸۴۵ء میں مطبع دارالسلام دہلی میں ان کے دیوانِ فارسی کی طباعت شروع ہوئی، تو تفضل حسین خاں کو لکھا۔

"نواب ٹونک نے مجھ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور میری مدح گوئی کو نگاہ میں نہیں لائے، اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ میں بھی بے حوصلگی سے کام لوں اور اس قصیدہ

اے ذات تو جامع صفت عدل و کرم را
وے بر شرف ذاتِ تو اجماع امم را

کو قلم زد کر دوں، دیوان میں درج نہ کروں، نواب نے میرا نام اپنے دربار میں پسند نہیں کیا، میں بھی نواب کا نام اپنے دیوان میں درج کرنا پسند نہیں کروں گا۔"

تفضل حسین خاں کی خواہش تھی کہ ریاست کے خزانے سے غالب کو قصیدہ کے صلہ کے طور پر پانچ چھ سو روپے دیئے جائیں لیکن وہ جیتے جی اس خواہش میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ یہ سعی رائگاں ہو گئی۔ البتہ جب ۱۲۷۰ھ میں ان کا انتقال ہو گیا تو

نواب وزیرالدولہ والیٔ ٹونک نے غالب کو قصیدہ کے صلہ میں پانچ سو روپے سکۂ مادھوری مرحمت کر کے ان کی خواہش پوری کر دی اور ان کے صاحبزادے احمد حسین خاں کو ان کی جگہ سفارت پر مامور کیا۔ جو اُردو کے مشہور شاعر سید افتخار حسین مضطر خیر آبادی کے والد تھے۔

(سبد باغ دو در ص ۱۴۲، ص ۱۴۰، آجکل جون ۵۵ء)

ہدایت علی تمکین

مولوی ہدایت علی نام اور تمکین تخلص تھا۔ مراد آباد کے ایک قصبہ کندرکی کے رہنے والے تھے اور وہاں کے خاندان سادات سے تعلق تھا۔ لالہ سری رام نے ان کو عربی کا استاد اور فارسی نظم ونثر کا ماہر بتایا ہے۔ ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے ہیں سر رضا علی خاں نے اعمال نامہ میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اسی کو حرفِ آخر سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے لکھا ہے:

مولوی ہدایت علی تمکین خوش گو شاعر تھے۔ شعر فارسی میں کہتے تھے۔ ان کا فارسی دیوان موجود ہے۔ وہ عرصہ تک منصف رہے۔ پنشن لینے کے بعد کندرکی میں رہتے تھے۔ علمی اور ادبی مشاغل میں وقت گذرتا تھا۔ فارسی شعرا کے کلام کا انتخاب چار جلدوں میں ہدایت الشعرا کے نام سے مرتب کیا تھا۔

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی ہدایت علی تمکین نے قاطع برہان کے معرکہ میں ان کے خلاف حصہ لیا تھا اور ان کے بعض الفاظ پر اعتراضات بھی وارد کئے تھے۔ غالب نے لکھا ہے:

"مولوی ہدایت علی تمکین کا آج تک میں نے نام نہیں سنا تھا۔ چھپے ہوئے رستم ہیں۔ صائب اگرچہ اصفہانی نژاد تھا مگر وارد شاہجہاں آباد

تھا۔ "انتقام کشیدن" "و انتقام گرفتن" دونوں بول گیا' مولوی صاحب
لچ فارسی بولتے ہیں "لاحول ولا قوت الا باللہ"

لالہ سری رام ہی کے بیان کے مطابق مولوی ہدایت علی تمکین بارھویں صدی کے آخر تک زندہ تھے۔ ان کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

بر زمین از دود آہم آسمانِ دیگر است
از غبارِ خاطرِ من سائبانِ دیگر است

قاصدش پیغامِ صلح آورد و من بوسم لبش
زاں کہ ایں پیغامِ شیریں از زبانِ دیگر است

اں صید خلق گردد ما صید چشمِ تو
نسبت چساں دہیم بہ چشمِ غزالہ راہ

(اعمال نامہ ص ۲۳ تا ص ۲۶
خمخانہ جلد دوم ص ۱۲۵
عود ہندی ص ۱۱۱)

شہزادہ بشیر الدین توفیق

۷ مئی ۱۷۹۹ء کو انگریزوں نے والی دکن نظام علی خاں کی مدد سے ٹیپو سلطان کو شکست دی اور اس کے لڑکوں کو گرفتار کر کے قلعہ ویلور بھیج دیا جہاں ان کو ایک اندازہ کے مطابق سات لاکھ روپے سالانہ پنشن دی جانے لگی۔ اسی زمانے میں بعض لوگوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی اور ٹیپو سلطان کے بارہ لڑکوں میں سے ایک لڑکے شکر اللہ کو برسرِ اقتدار لانا چاہا۔ انگریزوں نے یہ بغاوت پوری طاقت سے کچل دی۔ شکر اللہ اور ان کے بھائی، قافلے کی صورت میں کلکتہ روانہ کر دیئے گئے۔

یہی شکر اللہ شہزادہ بشیر الدین کے والد تھے۔

شہزادہ بشیر الدین نے عربی اور فارسی کی تعلیم مولوی عبدالرحیم گورکھپوری سے حاصل کی۔ ان کو عربی اور فارسی کے علاوہ اردو نظم و نثر پر بھی عبور تھا۔ اس کے باوجود وہ غالب سے زبان و بیان اور الفاظ کی صحت و درستی کے بارے میں مشورہ کرتے تھے۔ اُردوئے معلّٰی میں غالبؔ کے کئی خط ان کے نام ملتے ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔

شہزادہ بشیر الدین کا تخلص توفیق تھا۔ انہوں نے واجد علی شاہ اختر کے صاحبزادے جرنیل فریدوں قدر مرزا محمد علی بہرہ کے دیوان کی تاریخ و تقریظ بھی لکھی تھی۔ ان کا سالِ وفات ۱۳۰۲ھ ہے۔ نساخ نے ان کی وفات پر ذیل کا قطعہ کہا تھا اور اس کے آخری مصرع سے تاریخ نکالی تھی :

رفت شہزادہ بشیر الدین توفیق از جہاں سوئے خلد و داغِ ہجر خویش در دل ہا سپرد
زود رقم سالِ رحیلش کلکِ نساخِ حزیں وائے حیف آہ شہزادہ بشیر الدین بمرد

۱۳۰۲ھ

شہزادہ بشیر الدین کا کلام دستبرد زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہا ہے۔ اس لئے یہ کہنا قدرے مشکل ہے کہ انہوں نے کیا کچھ کہا اور کتنا کچھ کہا ہے۔ بعض تذکروں میں ان کے یہ اشعار ملتے ہیں :-

دمے آزردہ داری، ازیں خوشتر چہ می خواہی
در مُنے سادہ داری ازیں خوشتر چہ می خواہی
ترا اے عاشق زاشک سرخ در پیمانۂ چشمت
مصفا بادہ داری ازیں خوشتر چہ می خواہی

ندیدہ است کس از شاخ خشک میوۂ تر
بجز قلم کہ دہد میوہ، تر و شیریں

(غم خانۂ جاوید ص ۱۵۲، ص ۱۵۳، خطوط غالب جلد ۵ ص ۵۰۶
نگارستان سخن ص ۱۹، ص ۲۰)

افضل الدولہ تہنیت علی خاں

ریاست حیدر آباد کی بنیاد نواب قمر الدین خاں آصف جاہ اول نے رکھی تھی۔ ان کے انتقال پر ان کے بیٹوں اور نواسوں میں قتل و غارت کا زنجیرہ کھل گیا اور وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے، جس کے نتیجہ میں یکے بعد دیگرے تین حکومتیں بدلیں۔ جن کے خاتمے پر قمر الدین خاں کے چوتھے لڑکے نظام علی خاں نے آصف جاہ ثانی کے لقب سے اپنی مسند نشینی کا اعلان کیا۔ نظام علی خاں کے انتقال پر ان کے میر اکبر علی خاں، ۷ اگست ۱۸۰۳ء کو آصف جاہ سوم کے لقب سے سریر آرا ہوتے اور ۲۶ سال تک حکومت کی۔ ان کا انتقال ۲۱ مئی ۱۸۲۹ء کو ہوا۔ ان کے بیٹے میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے حکومت پائی۔

غالب کے ممدوح میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ ان ہی کے صاحبزادہ تھے وہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ناصر الدولہ کی بڑی بیگم دلاور النسا بیگم کے بطن سے پیدا ہوتے تھے۔ نواب سالار جنگ اور امیر کبیر شمس الامرا کو ان کا اتالیق مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی مسند نشینی سے ایک ہفتہ پہلے میرٹھ کی فوجوں میں بغاوت پھیل گئی تھی اور اس کے شعلے ہندوستان گیر ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن ان کی اور سالار جنگ کی جانب سے انگریزوں کو یقین دلایا گیا کہ دکن میں ان کے خلاف کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اور اگر ایسا ہو بھی تو اسے سختی سے کچل دیا جائے گا۔

جولائی ۱۸۶۱ء میں ملکہ وکٹوریہ نے غدر کے زمانے میں انگریزوں کا ساتھ دینے والے ہندوستانی نوابوں اور والیانِ ریاست کو خطابات دئے۔ افضل الدولہ کو بھی جی سی ایس آئی کا خطاب ملا۔

افضل الدولہ بڑے متقی اور خدا دوست تھے۔ ان کی فیاضی اور ادب پروری کا چرچا ہندوستان بھر میں عام تھا۔ انھوں نے بیالیس سال کی عمر میں ۲۶ رفروری ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا اور حیدرآباد کی تاریخی مسجد "مکہ مسجد" میں دفن ہوئے میر عثمان علی خاں نظام سابع کے والد میر محبوب علی خاں آصف ان ہی کے صاحبزادے تھے ان کی عمر اس وقت صرف ڈھائی سال تھی۔

غالب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں "سبد باغ دو در" کے نام سے اپنا مجموعۂ نظم ونثر مرتب کروایا تھا۔ اس میں والیِ حیدرآباد دکن نواب افضل الدولہ بہادر کی مدح میں بھی ایک قصیدہ شامل ہے۔ یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کب لکھا گیا، تاہم اس کا زمانۂ تصنیف ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۹ء سے باہر نہیں ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:——

حیدرآباد دکن روضۂ رضواں شدہ است
ساز و برگ طرب و عیشِ فراواں شدہ است

افضل الدولہ بہادر کہ زفرِ رخِ او
بارگہ مطلعِ خورشیدِ درخشاں شدہ است

مردہ را زندہ کند جنبشِ کلکش گوئی،
کلکِ او موجۂ سرچشمۂ حیواں شدہ است

غالبِ غم زدہ درویش و تو درویش نواز
بجلش باد اگر طالبِ احساں شدہ است

صلہ گرمیِ نہ فرستی بہ ستائش بہ نواز
کایں کلامے ست کہ داغِ دل حسّاں شدہ است

ایں کہن پیر بہ آوازہ شیئاً للہ
گدیہ گر بردرِ آں قبلۂ گیہاں شدہ است

باد جاوید گلستانِ ترا فصلِ بہار
اے کہ از فیضِ تو آفاق گلستاں شدہ است

(کلیاتِ غالب فارسی نظم صفحہ ۳۹۹ ، باغِ دو در صفحہ ۹۸)

نواب افضل الدولہ (مراد علی طالع)

نواب شہاب الدین خاں ثاقب

نواب شہاب الدین خاں ثاقب، نواب ضیاء الدین خاں نیّر کے بڑے بیٹے تھے ان کا سالِ ولادت ۱۸۴۰ء ہے۔ ان کی تمام تعلیم و تربیت ان کے والد کی نگرانی میں ہوئی جس کے نتیجے میں انہوں نے بہت جلد تمام علوم مروجہ پر عبور حاصل کر لیا اور دہلی کے سربرآوردہ افراد میں شمار کیے جانے لگے۔ ان کی ذاتی صلاحیتوں اور علمی استعداد کے اعتراف کے طور پر ان کو عین جوانی کے زمانے میں دہلی کے آنریری مجسٹریٹ کا عہدہ دیا گیا۔

غالب ثاقب کو اپنے بچوں کی طرح چاہتے اور بے انتہا پیار کرتے تھے۔ ثاقب کو ابتدائے عمر ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ وہ اپنے کلام پر غالب سے اصلاح لینے کے علاوہ ان کے کلام کی بھی نقلیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ غالب نے ان سے اپنا دیوان مانگا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اس میں اتفاق سے کچھ غلطیاں تھیں اور کسی نامعلوم شخص کے کچھ شعر غالب کے نام سے درج کر دیئے گئے تھے۔ غالب کو یہ دیوان

دیکھ کر بے حد غصّہ آیا۔ انہوں نے اسی حالت میں یہ خط لکھ بھیجا :-

"بھائی شہاب الدین خاں واسطے خدا کے تم نے اور حکیم غلام رضا خان نے میرے دیوان کا کیا حال کر دیا ہے۔ یہ اشعار جو تم نے بھیجے ہیں، خدا جانے کس ولدالزنا نے داخل کر دیئے ہیں۔ دیوان تو چھاپے کا ہے۔ متن میں اگر یہ شعر ہوں تو میرے ہیں۔ اگر حاشیہ پر ہوں تو میرے نہیں۔ بالفرض اگر یہ شعر متن میں بھی پائے جائیں تو یوں سمجھنا ملعون زن جلب نے اصل کلام کو چھیل کر یہ خرافات لکھ دیئے ہیں۔ مختصر یہ کہ جس مفسد کے یہ شعر ہیں اس کے باپ پر اور دادا پر لعنت اور وہ ہفتاد پشت تک ولدالحرام۔ اس کے سوا اور کیا لکھوں۔"

ثاقب کو نوجوانی ہی میں تپ دق لاحق ہو گیا تھا۔ ہر طرح کا علاج معالجہ کیا گیا لیکن بے سود، روز بروز طبیعت میں گراوٹ آتی گئی۔ موت سے چند روز پہلے اسہال کا حملہ ہوا جس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ غالب کے انتقال کے دو مہینہ کے اندر اندر ۶ محرم ۱۲۸۶ھ کو انتقال کیا اور حسبِ وصیت اپنے چچا نواب شمس الدین خاں کے پہلو میں دفن ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر مشکل ہی سے ۲۹ برس کی تھی

قربان علی بیگ سالک نے ان کی تاریخِ وفات اس شعر سے نکالی ہے ؎

تاریخِ وفاتِ او چنیں سالک گفت
روزِ ششم مہ محرم صد آہ!

عبدالغفور نساخ نے لکھا ؎

سال لکھا خامے نے وائے
حیف شہابِ ثاقب خیرہ

ثاقب شاعری میں غالب کا اتّباع کرتے تھے درد، اثر، صفائی زبان اور معانی آفرینی ان کے کلام کا خاصہ تھی۔ ان کے کلام کا انتخاب یہ ہے :-

کیا چیر کے سینہ دل دکھائیں
کچھ حال سنو تو ہم سنائیں
ہم سینہ سپر کئے کھڑے ہیں
وہ شوق سے خنجر آزمائیں
جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دلربا ادائیں
اے بخت کہاں تلک برائی
اے چرخ کہاں تلک جفائیں

نہیں عقل سے عشق خالی کہ اس میں
بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں
غلط فہم ہیں عاشقانِ مجازی
کہ محوِ تماشائے محمل ہوئے ہیں
رہیں گے گرفتارِ صورت پرستی
اگر حسن حقی سے غافل ہوئے ہیں
نہ پیٹیں نہوں قتل انصاف یہ ہے
کہ ہم خود بد آموزِ قاتل ہوئے ہیں

فکرِ وصال و ہجر کا صدمہ اٹھایئے ۔۔۔ اس چند روزہ زیست میں کیا کیا اٹھایئے
بیٹھے ہیں ہم تو اب دلِ بے آرزو لئے ۔۔۔ وہ دن گئے کہ داغِ تمنا اٹھایئے
ثاقب وہ خطِ اشک کو سمجھے ہیں بے غمی ۔۔۔ یوں رو دیئے کہ شورشِ دریا اٹھایئے

(ادبی خطوط ص۲۳۲ ، تلامذۂ غالب ص۱۴۲

خطوط غالب ص۴۵۵ ، خمخانۂ جاوید ص۳۶۴ تا ص۱۰۱)

قاضی عبدالجمیل جنون

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے آباؤ اجداد مغلوں کے عہد میں مصر سے ہندوستان آئے اور اپنی خداداد صلاحیت کی بنا پر اتنی ترقی کی کہ ان کو بانس بریلی کا عہدۂ قضا پیش کیا گیا۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی، قاضی عبدالجلیل بریلوی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۵۱ھ ہے۔ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں مفتی عنایت اللہ سے علوم درسیہ کی تحصیل کی۔ اسی زمانے میں ان کو شاعری کا بھی شوق پیدا ہوا۔ کچھ دنوں کی مشق کے بعد غالب کو کثرت آلام نے گھیر رکھا تھا اور بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی، انھوں نے غزلیں یہ لکھ کر واپس کر دیں۔

"فقیر کا قاعدہ ہے کہ اگر کلام میں استقام و اغلاط دیکھتا ہوں تو رفع کر دیتا ہوں اور اگر سقم سے خالی پاتا ہوں تو تصرف نہیں کرتا، پس قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان غزلوں میں کہیں اصلاح کی جگہ نہیں"

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کی خواجہ غلام غوث خاں بے خبر سے بھی دوستی تھی، ان کے سامنے دوران گفتگو غالب کی بیماری کا ذکر آیا تو انھوں نے اس کی پرزور تردید کی اور بتایا کہ غالب اچھے خاصے تندرست ہیں، ان کو کسی قسم کا عارضہ لاحق نہیں، جنون بریلوی نے اس ملاقات کی تفصیل اور تندرستی کا حال معلوم ہونے کی اطلاع غالب کو دی جس پر انھوں نے جواب دیا۔

"مکرمی غلام غوث خاں صاحب بہادر میر منشی کا قول سچ ہے۔ اب میں تندرست ہوں، برس دن صاحب فراش رہا ہوں، ستر برس کی عمر

جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا"

قاضی صاحب نے غالب کی خدمت میں انواع و اقسام کے تحائف روانہ کرنے کو اپنا معمول بنا رکھا تھا، وہ ہر سال بڑی پابندی کے ساتھ آم بھجواتے تھے، یوسف علی خاں ناظم کا انتقال ہوا اور ان کی جگہ نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوتے اور مسند نشینی کی تقریب میں غالب کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تو قاضی صاحب نے ایک خط کے ذریعے ان سے التماس کی۔

" رام پور سے بریلی کچھ دُور نہیں ہے۔ نمائش گاہ کا زمانہ ہے، تشریف لا کر مشتاق دید کو ممنون فرمایئے"

اس التماس کے جواب میں غالب نے معذرت چاہی اور لکھ بھیجا:

"مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا ہوں، بشرط حیات آخر دسمبر تک دلی جاؤں گا۔ نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں، خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا ہے۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔"

قاضی صاحب نے غالب کو کبھی دیکھا تھا نہ ان سے ملاقات کی تھی۔ غالب کی اس معذرت کے بعد ان کی توقعات پر اوس پڑ گئی اور وہ غالب کی ملاقات سے نا امید ہو گئے۔ قاضی صاحب کے چچا، دادا اور پر دادا مختلف مناصب جلیلہ پر فائز رہے تھے، اسلئے حکومت نے ان کے ساتھ بھی خاص مراعات برتیں اور ان کو بھی، ان کے بزرگوں کیطرح عہدۂ قضا پر فائز کیا۔ ۱۸۹۸ء میں حکومت کی جانب سے ان کو خان بہادر کا خطاب بھی مرحمت ہوا۔ لیکن اس خطاب کے دو ہی سال بعد ۲۰ مئی ۱۹۰۰ء کو، مختصر سی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ غالب کی دستنبو کا دوسرا ایڈیشن ان ہی کی نگرانی میں بریلی سے شائع ہوا تھا۔

قاضی صاحب کو اواخر عمر میں شاعری سے دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ اسے شوقِ فضول سے تعبیر کرتے تھے۔ مرزا عسکری کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنا تمام کلام تلف کر دیا تھا۔ ان کے صاحبزادے قاضی محمد جلیل نے لالہ سری رام کی خواہش پر خمخانۂ جاوید کے لئے کچھ شعر ادھر ادھر سے جمع کئے تھے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

جو حسیں ہم کو ملا کافر و بے دیں ہی ملا
جس کو دیکھا اُسے غارت گرِ ایماں دیکھا
نہ ہوا خندۂ بے وجہ گوارا گل کا
ہم نہ کہتے تھے نہ کر سیرِ گلستاں، دیکھا

کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے — کہ اک نگہ میں دگرگوں ہے حال محفل کا

دیکھ کر اس بت کو کیا کہئے کہ کیا یاد آ گیا — ہم کو اس کی بے نیازی سے خدا یاد آ گیا
میں جو رخصت ہو کے ان سے پھر گیا تو یوں کہا — کیوں گئے کیوں آئے کیا بھولے کیا یاد آ گیا

سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ — ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں

نہ سہی لطف و عنایت ستم و جور سہی — غم تو یہ ہے کہ نہیں حال کا پرساں کوئی

گرم کیوں ہوتے ہو اغیار کے آگے مجھ پر — آگ میں ڈالیے پر یوں نہ جلایا کیجیے
تاب و طاقت نے دیا فرقتِ جاناں میں جواب — بارِ غم ناز نہیں ہے کہ اٹھایا کیجیے

گالیاں کھا کے رہوں چپ یہی بات اچھی ہے کہ بگڑتا ہوں تو وہ اور بنا تا ہے مجھے

(خم خانۂ جاوید جلد دوم ص۲۷۶ ص۲۷۷

ماہنامہ کمال دہلی جنوری ۱۹۱۲ء ،

ادبی خطوط ص۲۲۳ ، خطوط غالب ص۲۵۶)

جواہر سنگھ جوہر

جواہر سنگھ جوہر، غالب کے دوست رائے چھج مل کھتری کے بڑے صاحبزادہ تھے۔ غالب نے ان کو شاعری ترک کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اس سے دنیا کا حصول ممکن ہے نہ دین کا۔ بہتر ہے کہ تم آہنگ نوکری بلند کرو اور کسی ریاست و دولت کے متوسل ہو جاؤ ـــــ غالب شادی کے بعد جواہر سنگھ جوہر کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنے والدین پر بوجھ بنے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی اور بیوی بچوں کو اپنے والد کے پاس دہلی میں چھوڑ کر اکبر آباد چلے گئے۔ وہ جس وقت اکبر آباد پہنچے غالب کے دیرینہ دوست مولوی سراج الدین احمد قیام رہیں تھا۔ غالب نے جواہر سنگھ جوہر کو لکھا کہ وہ ان کو بجائے غالب تصور کریں اور ان سے ملتے رہیں تاکہ کسی قسم کی آسودگی ممکن ہو۔ جواہر سنگھ جوہر نے غالب کی نصیحت کو زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھا جس کے نتیجے میں وہاں ان کو کسی قسم کا روزگار میسر نہ آسکا۔ اس پر غالب نے یک بار پھر ان کو لکھا کہ تمہارا وجود تمہارے والد پر گراں نہ ہو گا، دہلی چلے آؤ۔ جس کے جواب میں انہوں نے غالب کو بتایا کہ وہ سوداگری کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی اطلاع انہوں نے اپنے والد کو بھی دی، انہوں نے ان کو اس سے باز رکھا۔ غالب نے بھی ان کے والد کے خیالات کی تائید کی اور بتایا کہ وافر سرمایہ کے بغیر سوداگری سے فائدہ ممکن نہیں، بلکہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سمندر میں جہاز رانی کرے۔ اس کے کچھ

عرصہ بعد جواہر سنگھ جوہر پشاور چلے گئے۔

پشاور میں ان کو کاروبار بھی مل گیا اور صحت بھی درست ہو گئی۔ لیکن وہ اس کو برقرار نہیں رکھ سکے۔ اس صورت حال کی بنا پر رائے چھج مل کھتری نے غالب سے خواہش کی کہ جواہر سنگھ جوہر کو الور میں ملازم کرا دیں۔ اس وقت الور کے دیوان منشی فضل اللہ خاں تھے۔ غالب نے ایک سفارتی خط دے کر جواہر سنگھ جوہر کو ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ اور لکھا کہ میں اس کو اپنے لڑکے کی طرح چاہتا ہوں۔ خواہش ہے کہ یہ ملازم ہو جائے اس لئے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔

جواہر سنگھ جوہر کے سلسلہ میں غالب کی یہ کوشش سودمند ہوئی یا نہیں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مالک رام کے بیان کے مطابق جواہر سنگھ جوہر انگریزی عمل داری میں، تحصیل دار تھے۔ مرزا عسکری نے بھی ۱۸۶۴ء میں ان کو بلب گڑھ کا تحصیل دار بتایا ہے۔ تذکرہ گلستان سخن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف فارسی میں غزلیں کہتے تھے۔ ان کی ایک غزل اردوئے معلیٰ میں بھی ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں۔

بہ حیرتم کہ ز دوزخ کسان دوزخ را — کجا برند چو آہم شرارہ بار افتد
نہ گبرم و نہ مسلمان بہ حیرتم کہ مرا — سوائے دوزخ منیر کجا گزر افتد
قرار در وطن افسردہ می کند دل را — خوشا غریب کہ دور از دیار یار افتد

انہوں نے اردوئے معلیٰ کی تاریخ طبع بھی کہی ہے۔

چو اردوئے معلیٰ گشت تالیف — مہان یک جہاں گردید طالب
پئے سال مسیحائی طبعش — بگو جوہر نفسے اردوے غالب

ان کے علاوہ انہوں نے قاطع برہان کی بھی تاریخ کہی۔

ایں نسخہ کہ غالب چو او دیگر نیست — تالیف حریف غالب دوران ہست
جوہر ایں گفت سال طبعش طبعم — زیبا فرہنگ قاطع برہان ہست

جواہر سنگھ جوہر کے چند شعر مختلف تذکروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام کا نمونہ مندرج ہے۔

تو و زراہ کرم بر سرم گزار غلط — من و دیرہ نہ نشستن بہ انتظار غلط
بردبہ زہد بد آموزیم مکن زاہد — من و زشاہد و مے توبہ در بہار غلط
بہ عہد در خور پرسش نیم مگر وقتے — شود بہ کلبۂ من راہ آں نگار غلط
براں سرم کہ دگر باکسے نیامیزم — امید لطف زیادہ ان روزگار غلط

(قاطع برہان ص۹۔ تلامذہ غالب ص۹۰
ادبی خطوط ص۲۲۔ گلستان سخن اول ص۳۸
سبد باغ دو در ص۱۳۲)

جواں بخت

بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا محمد دارا بخت ۱۱ جنوری ۱۸۴۹ء کو انتقال کر گئے تو گورنر جنرل ڈلہوزی نے نئے ولی عہد کا مسئلہ اٹھایا۔ ملکہ زینت محل کی خواہش تھی کہ ان کا اکلوتا لڑکا جواں بخت ولی عہد تسلیم کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کے نام ایک عرضی بھی ارسال کی لیکن نتیجہ برعکس نکلا اور مرزا فخرو ولی عہد بنا دیئے گئے۔

اس کے چند سال بعد قلعہ معلیٰ میں جواں بخت کی شادی کا جشن انتہائی شان و شوکت سے منایا گیا۔ اس سلسلہ میں پوری دہلی دس بارہ روز تک بقعۂ نور و گہوارۂ سرور بنی رہی۔ اس موقع پر ملکہ زینت محل کی ایما پر غالب نے ایک سہرا لکھا اور اسے زرنگار کاغذ پر لکھوانے کے بعد سونے کی کشتی میں سجا کر نذر گزارا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پر بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک
کیوں نہ کھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تاب گراں باری گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھ کر سہرا

جب انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا اور انکو جلا وطنی کی سزا دی، جواں بخت سے کہا گیا تھا کہ وہ اگر چاہیں تو کلکتہ میں نظر بندی کے ایام گزار سکتے ہیں، لیکن انھوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے کی بجائے بہادر شاہ ظفر کے ساتھ رنگون جانا اپنے لئے پسند کیا۔ ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا تو ان کے پاس اس وقت زینت بخت اور جواں بخت کے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا، انھوں نے حکام کی اجازت سے بعد تجہیز و تکفین بہادر شاہ ظفر کو اسی مکان کے احاطہ میں دفن کر دیا جس میں وہ رہتے تھے۔ اس کے پانچ سال بعد تک انگریزوں نے جواں بخت کی کسی بھی قسم کی خبر گیری نہ کی، وہ جلا وطنی میں نہایت عسرت و افلاس کی زندگی گزارتے رہے، ۱۸۶۷ء میں انگریزوں نے زینت محل کے لئے پانچسو روپے ماہوار کی پنشن منظور کی اور اسی قدر وظیفہ جواں بخت کے لئے بھی مقرر کر دیا۔ جواں بخت نے برما کے ایک قصبہ مولمین میں ۱۸۸۴ء میں انتہائی گمنامی میں انتقال کیا۔ اب

یہ کسی کو بھی نہیں معلوم کہ ان کی قبر کہاں ہے اور وہ کس علاقہ میں دفن کیے گئے۔

(بہادر شاہ ظفر ص ۱۶۳، دیوان غالب عرشی ص ۲۰۲)

خواجہ حاجی

مرزا فرحت اللہ بیگ نے خواجہ حاجی کو غالب کے جدِ اعلیٰ ترسم خاں کے چھوٹے بھائی رستم خاں کی اولاد میں سے بتایا ہے اور کہا ہے کہ چار پشت اوپر غالب اور خواجہ حاجی کا سلسلۂ نسب مل جاتا ہے۔ یہ بات حد درجہ غلط اور مشکوک ہے۔ غالب کے بیانات اس کے برعکس ہیں۔ انھوں نے خواجہ حاجی کے باپ کو اپنے دادا قوقان بیگ خاں کا سائیس بتایا ہے۔

خواجہ حاجی مرزا قوقان بیگ خاں کے سواروں کے دستے میں سائیس کا کام کرتا تھا، جس کے معاوضہ میں اس کو پانچ روپے ماہوار ملتے تھے۔ قوقان بیگ خاں نے اس کی خدمات اور دیانتداری کے اعتراف کے طور پر اپنی بیوی کی بیوہ بہن کی لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ خواجہ حاجی کا ذکر غالب نے اپنی بعض تحریروں میں انتہائی حقارت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ اسی خواجہ مرزا کی اولاد میں قطب الدین کے بیٹے تھے، جن کو قوقان بیگ کی بیوی نے اپنے بچوں کی طرح ناز و نعم سے پرورش کیا تھا۔

جب مرزا نصر اللہ بیگ خاں کا ہاتھی پر سے گرنے کی وجہ سے انتقال ہو گیا تو خواجہ حاجی نے ان کے تمام ساز و سامان پر قبضہ کر لیا اور ان کی چھولداریوں، خیموں، ہاتھیوں، اونٹوں، پالکیوں اور ستر اسی سواروں کو لے کر نواب احمد بخش خاں، والیِ فیروزپور جھرکہ کی خدمت میں پہنچے۔ نواب احمد بخش خاں پہلے سے ہی خواجہ حاجی سے واقف تھے۔ ان کو اس بات کا علم تھا کہ خواجہ حاجی ان کے بہنوئی مرزا نصر اللہ بیگ خاں کا ملازم اور لے پالک ہے۔ انھوں نے اس کو اپنے ملازموں میں شامل کر لیا اور انگریزوں کی جانب

سے مرزا نصراللہ بیگ خاں کے پسماندگان کے لئے ان کی وساطت سے پانچ ہزار روپے کی جو پنشن مقرر ہوئی تھی اس میں سے دو ہزار روپے مرزا حاجی اور اس کے لواحقین کو دیئے گئے ۔

جب غالب سن شعور کو پہنچے تو انھیں محسوس ہوا کہ نواب احمد بخش خاں نے ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کی پنشن میں بددیانتی کی ہے اور انھیں اور ان کے اہل خاندان کو دھوکے میں رکھا ہے ۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں متعدد مرتبہ تحریری اور زبانی احتجاج کیا جس پر نواب احمد بخش خاں اپنی مجبوریاں اور معذوریاں بیان کرتے اور انھیں ٹالتے رہے ۔ ان کا کہنا تھا :

" مجھ سے غلطی ہو گئی ، میں لارڈ لیک کے سامنے حاجی مرزا کو مرزا نصراللہ بیگ کا رشتہ دار کہہ چکا ہوں اور اگر اب میں کچھ اس کے خلاف کہوں تو یہ میری بے عزتی کا باعث ہوگا ۔ چند دن اور صبر کرو خواجہ حاجی کے مرنے کے بعد میں اس کے دو ہزار روپے بھی تم دونوں بھائیوں کو دینے لگوں گا "

نواب احمد بخش کی اس وضاحت کے بعد غالب نے خاموشی اختیار کر لی اور یہ جان کر مطمئن ہو گئے کہ خواجہ حاجی کے بعد اُن کی پنشن ان کے نام منتقل ہو جائے گی ۔ لیکن جب ۱۸ء میں خواجہ حاجی جذام میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا تو نواب احمد بخش خاں نے اس کے بیٹوں خواجہ جان اور خواجہ امان کو دو ہزار روپے سالانہ دینا شروع کئے ۔ جس پر غالب کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ وہ کلکتہ جا کر گورنر جنرل ہند کو اپنے استحقاق اور مطالبات کے سلسلہ میں درخواست دیں ۔ چنانچہ انھوں نے کلکتہ جا کر ۲۸ را پریل ۱۸ء کو گورنر جنرل ہند کو جو درخواست پیش کی اس میں پہلا مطالبہ یہی کیا کہ " ان کے خاندان کے ایک ملازم خواجہ حاجی کو ان کی پنشن میں برابر کا حصہ دار کیوں کیا گیا ۔ حکومت اس معاملہ کی تحقیق کرے "

(آجکل فروری ۶۳ء ، ذکر غالب ص۴۲
احوالِ غالب ص۴۲ ، حیات غالب ص۴
متفرقات غالب ص۶)

نواب حامد علی خاں

نواب حامد علی خاں پانی پت کی ایک بستی برست کے رہنے والے تھے جہاں ان کے آباؤ اجداد نے کھیتی باڑی کر رکھی تھی اور برسوں سے آباد چلے آرہے تھے ایک مرتبہ نواب حامد علی خاں کو کھیتوں پر جانے میں دیر ہوئی جس پر ان کے والد نے ان کو سخت سست کہا۔ وہ ناراض ہو کر پا پیادہ لکھنؤ کی طرف چل پڑے۔ دریں اثنا حالات نے ان کے حقیقی ماموں میر فضل علی خاں کو نصیر الدین حیدر والیٔ اودھ کی وزارت کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ انھوں نے اپنے بھانجے کو محل میں ٹھہرایا ہی نہیں بلکہ ان کی ۱۸۲۸ء سے ۱۸۳۱ء تک ذہنی اور فکری تربیت بھی کی اور بعد ازاں اپنی بیٹی حاجی بیگم کا نکاح ان کے ساتھ کر دیا۔

۱۸۳۱ء میں میر فضل علی خاں کے مرنے پر ان کی لڑکی حاجی بیگم کو ترکہ میں نو لاکھ روپے ملے۔ نواب حامد علی خاں یہ روپے لے کر دہلی چلے آئے۔ جن کا سود ساڑھے چار سو روپے ماہانہ ان کو شاہی خزانے سے ملنے لگا۔

جہاں ۱۸۵۷ء کی سعیٔ انقلاب ناکام ہونے پر مسلمانوں پر مصیبت آئی، وہاں نواب حامد علی خاں بھی انگریزوں کی چیرہ دستی سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ ۹ صفر ۱۲۷۴ھ کو کرنال کے کلکٹر رچرڈ نے دو سو سواروں کے ساتھ ان کے مکان کا محاصرہ کر کے نو لاکھ روپے کی مالیت کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ بعد ازاں وہ اور ان کے ۲۲ ملازم گرفتار کر لئے گئے جن کو کرنال سے دہلی پہنچایا گیا۔

چودہ مہینہ کی قید و بند کے بعد مولوی رجب علی اور خلیفہ محمد حسین پٹیالہ کی کوششوں کے نتیجہ میں رہائی پائی - غالب نے ایک خط میں ان کی حالت زار کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے :

"یہاں کا یہ حال ہے کہ مسلمان امیروں میں تین آدمی نواب حسن علیخاں نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خاں سوان کا حال یہ ہے کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں، یہاں کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے کہاں جائیں، کہاں رہیں "

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"نواب حامد علی خاں کے مکانات سب ضبط ہو گئے - وہ قاضی کے حوض پر کرائے کے مکان میں رہتے ہیں - باہر جانے کا حکم نہیں ملا "

نواب حامد علی خاں کے لکھنؤ سے دہلی منتقل ہونے کے چند دن بعد ان میں اور غالب میں روابط پیدا ہو گئے تھے - غالب نے ۱۸۴۲ء میں ان کے عزا خانہ کی تعمیر پر قطعہ لکھا - جس کے اس شعر

برائے سال بنائش بگریہ ہاتف گفت
مکانِ ماتم آلِ عبا متین بنا

سے سنہ تعمیر برآمد ہوتا ہے - اس کے علاوہ غالب نے اس مسجد کی بھی تاریخ کہی جس کو نواب حامد علی خاں نے دہلی میں کشمیری دروازہ کے باہر ۱۲۵۷ھ میں تعمیر کروایا تھا - غالب کا تاریخی مصرعہ ہے -

سال تعمیرش بود "کعبہ نظیر"

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی اس مسجد میں جاتے اور قرآن سنتے تھے - انھوں نے اس سلسلہ میں لکھا ہے -

"ہر صبح کو حامد علی کی مسجد میں قرآن جا کر سنتا ہوں، شام کو مسجد میں تراویح پڑھتا ہوں اور کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقت صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا اور سادہ پانی پیتا ہوں۔"

(قیصر التواریخ ص۱۱، غالب تاریخ کے آئینہ میں ص۱ تا ص۱۱

خطوط غالب ص۳۰۰، کلیات غالب فارسی اول ص۲۳۲

ادبی دنیا ستمبر ۱۹۶۵ء عود ہندی ص۶۹، ص۲۰۶، ص۲۴۸)

حسین مرزا

حسین مرزا، نواب حسام الدین حیدر خاں کے چھوٹے صاحبزادہ تھے۔ ان کا سالِ ولادت ۱۲۲۳ھ ہے۔ ان کی شادی شاہی ناظر افتخار الامرا احمد حسین نظارت خاں مستقیم جنگ کی صاحبزادی حسینی بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے انتقال پر وہ شاہی نظارت کے منصب پر فائز کئے گئے اور سید ذوالفقار الدین حیدر نظارت خاں بہادر ذوالفقار جنگ کے خطاب سے مخاطب کیا گیا۔

۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب ناکام ہوئی اور انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا تو شہر کے وضیعوں، شریفوں اور نجیبوں پر قیامت گذر گئی۔ حسین مرزا بہادر شاہ ظفر کے ناظر تھے۔ ان کا بچنا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ جب بہادر شاہ ظفر نے الٰہی بخش کی سازش کا شکار ہو کر ہمایوں کے مقبرہ کی راہ لی تو حسین مرزا نے یہی غنیمت سمجھا کر اپنا بھرا گھر چھوڑ کر زن و فرزند سمیت باہر نکل جائیں۔ پہلے صفدر جنگ کے مقبرہ میں پناہ لی اور چار پانچ میل کا فاصلہ طے کرنے کے لئے دس ہزار روپے لیٹروں اور ڈاکوؤں کے حوالے کئے۔ پھر نواب حامد علی خاں نے رازدارانہ طریقہ پر بندوبست کر کے ان کو اپنے آبائی گاؤں برست پہنچا دیا۔ اس اثنا میں انگریزوں نے ان کے گھر کا بیش بہا سامان لوٹ لیا اور بعد ازاں

اس کو آگ لگا دی۔ جب مخبروں نے انگریزوں کو اطلاع دی کہ حسین مرزا برست میں ہیں تو حسین مرزا نے پانی پت کا قصد کیا اور وہاں سے بھیس بدل کر لکھنؤ پہنچ گئے اور روپوشی اختیار کرلی۔

جب عام معافی کا اعلان ہوا تو حسین مرزا نے لکھنؤ میں انگریزی حکام سے پنشن وغیرہ کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہے۔ پھر کلکتہ کا قصد کیا تاکہ واجد علی شاہ سے مل کر وظیفہ کا بندوبست کرائیں۔ غالباً اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ حسین مرزا کے والد نواب حسام الدین حیدر خاں مرزا الٰہی بخش معروف کے ہم محلہ اور دوست تھے جس کی بنا پر حسین مرزا کی زندگی کا بڑا حصہ غالب کے ساتھ گزرا۔ غالب ان کو اپنے حقیقی بھائی کی طرح چاہتے تھے۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد حسین مرزا اچانک بیمار ہو گئے اور اس بیماری کی اطلاع غالب کو ہوئی تو انھوں نے لکھا:

"حسین مرزا صاحب کیوں بیمار ہوئے، خدایا ان آوارگان دشت غربت کو استقامت تو جب چاہے عطا کر، مگر بصدیق مرتضیٰ علی کا تندرست رکھ۔ اللہ اللہ حسین مرزا کی داڑھی سفید ہو گئی۔ یہ شدت غم و رنج کی خوبیاں ہیں"

اسی زمانے میں حسین مرزا نے ایک خط کے ذریعہ اپنے بھانجے یوسف مرزا کو اپنی پریشانی کی اطلاع دی تھی اور لکھا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ میں کیا کروں کہاں جاؤں" غالب نے یوسف مرزا کو لکھا:

"ہے ہے حسین مرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کم بخت سے اس کا سرانجام نہ ہو سکے۔ بہت بڑا آسرا تھا۔ اور سرکار کی خدمت نہ سہی، عہدہ نہ سہی، علاقہ نہ سہی، سو ڈیڑھ سو روپے درماہہ مقرر ہو جانا کیا مشکل تھا۔ دلی کے آدمی خصوصاً امرائے شاہی ہر شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ مرشدآباد بھی ایک سرکار

تھی، حیدر آباد بہت بہتر گھر ہے، مگر بے ذریعہ و واسطہ، کیونکر جاتے اور جائے تو کس سے ملتے ناچار وہیں رہو۔ کسی طرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جاتے۔"

خیال ہوتا ہے کہ حسین مرزا کلکتہ سے دہلی واپس آ گئے تھے اور کچھ مدت کے لئے بیکانیر میں تحصیلداری اختیار کر لی تھی، جس وقت سر سالار جنگ دہلی پہنچے تو حسین مرزا نے ان سے ملاقات کی جس پر انھوں نے حسین مرزا کو تاکید کی کہ وہ فوری حیدر آباد آ جائیں۔ لیکن اس وقت تک وہ اتنے ذہنی صدمے اٹھا چکے تھے کہ ان کا دماغی توازن درست نہ رہ سکا اور ۶، رمضان، ۱۲۰۷ھ کو انتقال کر گئے۔ غالب کے شاگرد میر مہدی مجروح نے "بیا بہ کاخ جناں اے امیر ابن امیر" سے ان کا سال وفات نکالا ہے۔

(خطوط غالب جلد دوم صفحہ ۸۲، ذکر غالب صفحہ ۲۷۳ صفحہ ۳۱۹
عود ہندی کا صفحہ ۹۹ صفحہ ۲۰۷ صفحہ ۲۷۸)

نواب حسن علی خاں

حسن علی خاں، نجابت علی خاں والیٔ جھجر کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ ان کے بڑے بھائی فیض محمد خاں نے اپنے عہد حکومت میں ان کو اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ فیض محمد خاں کے انتقال پر ان کے صاحبزادے فیض علی خاں مسند نشین ہوتے تو حسن علی خاں نے ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں ان سے شدید اختلاف ہو گیا اور مقدمہ تک نوبت پہنچ گئی۔

انگریزوں نے درمیان میں پڑ کر حسن علی خاں اور فیض علی خاں میں مصالحت کروائی اور حسن علی خاں کو مجبور کیا کہ وہ تین ہزار روپے ماہوار پنشن لے کر دہلی میں سکونت اختیار کر لیں۔ حسن علی خاں نے ایسا ہی کیا اور ریذیڈنسی کی معرفت پنشن وصول

کرتے رہے۔

اس واقعہ کے چند ہی دنوں بعد فیض علی خاں کی بجائے عبدالرحمٰن خاں نے ریاست سنبھالی۔ ان کے مسند نشین ہونے کے چند ہی دن بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اس دوران دہلی کے اخبارات ان کے نام کے ساتھ اسدالدولہ اور ہزبر جنگ کے خطابات لکھنے لگے۔ عبدالرحمان خاں نے انگریزوں کے خلاف بہادر شاہ ظفر کی مدد کی۔ حسن علی خاں بھی قلعہ میں جانے اور بہادر شاہ ظفر سے ملکی نظم و نسق کے بارے میں مشورہ کرنے لگے۔

جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور شدتِ انتقام سے بستیاں کی بستیاں تلپٹ کر دیں۔ شریفوں اور وضیعوں کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں رہا، لوگ بلا امتیاز قتل کیے جانے لگے۔ ۱۹ یا ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں نے جھجر پہنچ کر عبدالرحمٰن خاں کو گرفتار کرنا چاہا۔ عبدالرحمان خاں نے کسی شرط کے بغیر خود کو ان کے حوالے کر دیا انگریز ان کو مجرموں کی طرح گرفتار کر کے دہلی لے آئے، جہاں تین دن تک قلعہ کے دیوانِ عام میں ان کو بھوکا پیاسا رکھا گیا، بعد ازاں پھانسی دیدی گئی۔

عبدالرحمان والی جھجر کی گرفتاری اور موت حسن علی خاں کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھی۔ وہ ریاست جھجر ہی کے وظیفہ خوار تھے، اپنا تمام مال و اسباب چھوڑ کر دہلی سے نکل بھاگے اور کسی قصبہ میں جا کر روپوشی اختیار کر لی۔

جب ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستانیوں کی خطائیں معاف کیں اور عام معافی کا اعلان ہوا تو لوگوں کی جان میں جان آئی تو وہ دوبارہ دہلی آ کر آباد ہونے لگے۔ دوسرے شہریوں کی طرح حسن علی خاں بھی دہلی آ گئے۔ لیکن ان کی جو حالت تھی، اس کا اندازہ غالب کے ان جملوں سے ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مسلمان امیروں میں تین آدمی حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں اور حکیم

احسن اللہ خاں، سوان کا یہ حال کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں ہے۔ یہاں
کی اقامت میں تذبذب، خدا جانے کہاں جائیں کہاں رہیں "

اس دور میں حسن علی خاں کا وظیفہ تین ہزار روپے سے گھٹ کر ایک سو روپے ماہوار ہو گیا۔ غالب کے بقول وہ آخر وقت تک صرف سو روپے ماہوار پاتے رہے، غالباً اسی صدمے نے ان کی جان بھی لی۔ غالب نے ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کے مرقومہ خط میں ان کی موت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے:

" حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپے روز کا پنشن دار
سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ "
(تاریخ انگلشیہ ص۹، خطوطِ غالب ص۳۹
غالب ص۲۶۶)

سیّد العلما سیّد حسین علی

سید حسین علی، غفراں مآب سید دلدار علی کے صاحبزادہ اور سلطان العلما سید محمد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۳ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ ہے۔ ان کا نام سید حسین کیوں رکھا گیا؟ تذکرۂ بے بہا کے مؤلف نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:——

" غفراں مآب نے خواب دیکھا کہ سید امام حسین فرماتے ہیں کہ تم نے اپنی اولاد ذرینہ کے نام رکھنے میں سلسلۂ پنجتن پاک کا کیوں موقوف کر دیا تو آپ نے عرض کیا کہ اب میں ضعیف ہو گیا ہوں اور اولاد کی امید نہیں اس وجہ سے امام آخر کے نام پر نام رکھا۔ حضرت نے فرمایا کہ ابھی اور ایک فرزند ہو گا اور اس کا نام ہمارے نام پر رکھنا۔ "

سید حسین علی نے اپنے والد غفران مآب اور بھائی سلطان العلما سے تکمیل علوم کی اور سترہ سال کی عمر میں درجہ اجتہاد کو پہنچ گئے۔ فقہ، مناظرہ اور حدیث میں انکا کوئی ثانی نہ تھا۔ ہند و اطرافِ ہند کے بیشتر نامور علما ان سے رجوع کرتے اور مسائل پوچھتے تھے۔ ان کا واحد مشغلہ درس و عبادت تھا۔ ان کی بے نیازی اور راست گفتاری نے عوام و خواص سب کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ سوکھی روٹی اور آستین پھٹے کرتے عموماً پہنتے تھے۔ سلاطین اور امرا کی صحبت سے سخت نفرت تھی۔ شمس آباد کے رئیس نواب دولھا نے مرغوب دل میں لکھا ہے کہ اگر میرے مذہب میں پیری مریدی ہوتی تو میں سید حسین علی کا مرید ہوتا۔

سید حسین علی نے ۱۸ صفر ۱۲۷۳ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ منیر شکوہ آبادی نے اس شعر میں ان کی تاریخ وفات نظم کی ہے:

عرض کر سالِ وفات مجتہد تو اے منیر
روضۃ الاحکام دیں کا آہ توبی کیا ہوا

غالب اور سید حسین علی میں مراسلت تھی، بہادر شاہ کے شیفتہ ہونے اور شاہ اودھ سے وظیفہ حاصل کرنے کے سلسلے میں غالب نے ان سے مدد لی تھی۔ ۲ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ کو غالب نے عبد الغفور سرور کو سید حسین علی کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ کو معلوم ہے میرن صاحب نے انتقال کیا۔ یہ چھوٹے بھائی تھے مجتہد العصر لکھنؤ کے، نام ان کا سید حسین اور خطاب سید العلما، نقش نگیں میر حسین ابن علی، میں نے ان کی رحلت کی ایک تاریخ پائی، اس میں پانچ بڑھتے ہیں، یعنی ۱۲۷۸ھ ہوتے تھے۔ تخرجہ نئی روش کا میرے خیال میں آیا، میں تو جانتا ہوں اچھا

ہے۔ دیکھوں آپ پسند فرماتے ہیں یا نہیں۔

حسین ابن علی آبروئے علم و عمل
کہ سید العلما نقش خاتمش بودے
نماند و ماندے اگر زندہ پنج سال دگر
غم حسین علی سال خاتمش بودے

سید حسین علی اپنے والد غفران مآب کے امام باڑہ میں مدفون ہوئے۔ انکی تصانیف کی تعداد پچاس سے زائد بتائی جاتی ہے۔

(تذکرۂ بے بہا ص ۱۲۴ تا ص ۱۲۵ ۔ عود ہندی ص ۱۴۷
کلیات نظم فارسی غالب ص ۵۰۳)

منشی نبی بخش حقیر

منشی نبی بخش حقیر کے آباؤ اجداد پنجاب کے ایک ایسے گھرانے سے تھے جس نے نامساعد حالات کی بنا پر ترک وطن کر کے اکبر آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ منشی نبی بخش حقیر کے والد شیخ حسین بخش یہیں پیدا ہوئے اور یہیں علوم متداول کی تحصیل کی۔ اس وقت نظیر اکبر آبادی کی شہرت کا ستارہ ترقی پر تھا۔ ان کے تلامذہ میں شامل ہوکر پہلے بخشی اور پھر عاصی تخلص کیا۔

منشی نبی بخش حقیر کے تفصیلی حالات نہیں ملتے ہیں، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی سرکاری ملازمت کا آغاز علی گڑھ کول میں عدالت فوجداری کی سررشتہ داری سے کیا۔ شاعری کا ذوق ان کو اپنے والد سے ملا تھا۔ چند ہی دنوں کی مشق کے بعد گلزار علی اسیر کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ غالب نے اپنے کئی خطوط میں ان کی سخن سنجی اور شعر فہمی کی تعریف کی ہے۔ غالباً اسی سخن سنجی اور شعر فہمی کی بنا پر غالب ان کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر کسی سرکاری کام پر ۱۸۴۷ء میں علیگڑھ سے دہلی آئے تو غالب ہی کے مکان پر قیام

کیا۔ اس دوران شعر و سخن کی محفلیں بھی منعقد ہوتیں اور علم و ادب پر مذاکرہ بھی۔ ان تمام چیزوں نے غالب کو بیحد متاثر کیا، چنانچہ انھوں نے منشی نبی بخش حقیر کے بارے میں ۱۰ فروری ۱۸۴۹ء کو ہرگوپال تفتہ کو لکھا:۔

"میں حیران ہوں کہ اس فرزانۂ یگانۂ روزگار یعنی منشی نبی بخش حقیر کو کس درجہ کی سخن سنجی اور سخن فہمی عنایت ہوتی ہے۔ حالانکہ میں شعر کہتا ہوں، اور شعر کہنا جانتا ہوں مگر جب تک میں نے ان بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں سمجھا کہ سخن سنجی کیا چیز ہے اور سخن سنج کس کو کہتے ہیں"

منشی نبی بخش حقیر کو بھی غالب سے بے حد مودت تھی۔ وہ آخر میں غالب ہی سے مشورہ کرنے لگے تھے۔ ۱۸۶۰ء سے کچھ پہلے ان کو طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر لیا اور وہ اس ہی کا شکار ہو کر [illegible] نومبر ۱۸۶۰ء میں چل بسے۔ پسماندگان میں دو لڑکے عبداللطیف اور نصیر الدین اور ایک لڑکی ذکیہ بیگم یادگار چھوڑی۔

غالب کو منشی نبی بخش حقیر کے مرنے کا سخت قلق ہوا۔ ہرگوپال تفتہ نے ان سے خواہش کی کہ وہ حقیر کے انتقال پر قطعہ تاریخ لکھیں۔ غالب نے ذیل کا قطعہ تاریخ لکھدیا اور ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کر دی کہ میں تاریخ گوئی کو دوں مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور تمہاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے۔ تاریخ وفات لکھنے سے ادائے حق محبت ہوتا ہے۔

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق　　داشت مذاق سخن و فہم تیز
مرگ ستم پیشہ امانش نہ داد　　کیست کہ با مرگ بپیچد ستیز
سال وفاتش ز پئے یادگار　　با دل زار و مژۂ دجلہ ریز
خواستم از غالب آشفتہ سر　　گفت مدہ طول و بگو رستخیز

غالب کا یہ قطعہ تاریخ اکبر آباد پہنچا تو اکثر افراد نے ناپسند کیا۔ منشی فخر الدین کو اس پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ "رستخیز" ایک لفظ ہے اور ایک لفظ سے تاریخ نکالنا

اچھی بات نہیں ہے۔ غالب کو اس اعتراض کا علم ہوا تو انھوں نے اس کو ان الفاظ کے ساتھ مسترد کیا۔

"ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں... انوری کے قصائد کو دیکھو، دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدہ کے آغاز میں لکھے ہیں، جن سے اعداد سال مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے، لفظ رستخیز کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور واقعہ کے مناسب، اگر تاریخ ولادت اور تاریخ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نامستحسن تھا"

حقیر کا کلام عام دسترس سے دور ہے۔ اس کے متعلق کسی قسم کی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ ان کا جتنا کچھ کلام ملتا ہے، اس کا انتخاب درج کیا جارہا ہے۔

سایۂ قصر ترا یاد آیا پھر ہمیں ظلِّ ہما یاد آیا
زخم کے منھ میں بھر آیا پانی جب کہ پیکاں کا مزا یاد آیا
پھر گریباں کے اڑیں گے ٹکڑے پھر وہی چاک قبا یاد آیا
ید بیضا کا جو مذکور ہوا ان کا نقش کف پا یاد آیا

مجھ خفتہ بخت کا جو سنا ذکر سو گئے احوال غم میں خواب کا افسانہ بن گیا

دنے لگا ہیں جن سے تھی مجھ کو تسلی کی امید تشنہ خوں آفت دل دشمن جاں ہو گئیں

شانے نے بل نکال دیے زلفِ یار کے موذی کو اس نے زیر کیا مار مار کے

پھر جنوں آکے ہوا دست و گریباں ہم سے نہ گریباں ہی بچے اب کے نہ داماں ہم سے

(ادبی خطوط ص ۲۲۹ - ۲۳۲ ، شمیم سخن ص ۱۱۸
خم خانۂ جاوید جلد دوم ص ۳۹۰ ، ،)

حکم چند

جن دنوں مرزا غالب محمد حسین تبریزی کی فارسی لغت کی مشہور کتاب قاطع برہان کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کو اس میں کچھ غلطیاں نظر آئیں جن کو انہوں نے " برہان قاطع " کی صورت میں جمع کیا۔ اس پر ان کی بڑی مخالفت کی گئی۔ متعدد لوگوں نے اس کے جواب میں کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں مولوی محمد امین الدین کی بھی قاطع القاطع ایسی کتاب تھی جس پر غالب سخت مشتعل ہوئے اور مولوی محمد امین الدین پر ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا اور اس سلسلہ میں گواہوں کی فہرست پیش کی۔ ان گواہوں میں حکم چند بھی شامل تھے۔

حکم چند، رام دیال کے صاحبزادے تھے۔ جن کا کائستھوں کے ایک قبیلہ ربیر سے تعلق تھا۔ انہوں نے ۲ر مارچ ۱۸۶۸ء کو گواہ کے طور پر عدالت میں حاضر ہو کر اپنی عمر ۳۶ سال بتائی تھی، ان کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۸۳۲ء کو پیدا ہوئے تھے۔

حکم چند نے دہلی کالج میں تعلیم پائی، پھر کلکتہ یونیورسٹی سے بی، اے اور ایم، اے کی ڈگری لی اور دہلی کالج میں مدرس مامور ہوئے۔ اسی زمانے میں ان کی غالب سے دوستی ہوئی اور انہوں نے اپنی ایک تصنیف پر غالب سے تصدیق لکھائی۔

دہلی کالج کی ملازمت چھوڑنے کے بعد ۱۸۶۹ء میں امرت سر میں تحصیل دار رہے اور پھر اپنی غیر معمولی قابلیت کی بنا پر اسسٹنٹ رکمشنر ڈکمشنر کے عہدہ تک ترقی کی۔ دس سال بعد حالات کی یکسانیت سے اکتا کر حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ وہاں

مختلف عہدوں پر کام کرنے کے بعد مجلس وضع قانون کے نائب مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں اڑسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حیدرآباد کے دوران قیام میں انہوں نے کئی قانونی کتابیں لکھیں اور شائع کیں جن کی وجہ سے ان کو وہاں کے قانون داں طبقہ میں قبولِ عام حاصل ہوا۔

(تاریخ ادب گارساں دتاسی جلد اول صفحہ ۶۱۴

قدیم دہلی کالج صفحہ ۱۷۶ (مقدمہ رودادِ غالب)

احوال غالب صفحہ ۱۹۸)

مرزا خضر سلطان

مرزا خضر سلطان بہادر شاہ ظفر کے بیٹے تھے۔ ان کی ولادت پر لال قلعہ میں ایک خصوصی جشن کا انتظام کیا گیا تھا اور پرتکلف محفل مشاعرہ آراستہ ہوئی تھی۔ اس میں غالب نے جو غزل سنائی اس کا ایک شعر ہے ؎

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران مرزا خضر سلطان کو بھی دوسرے شہزادوں کی طرح پلٹن ماپٹ کی کرنیلی دی گئی۔ وہ ڈھائی مہینہ مختلف محاذوں پر انگریزوں کا مقابلہ کرتے رہے — بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کے دوسرے دن منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش نے انگریزوں کو خبر دی کہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں اور پوتوں میں مرزا افضل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر مقبرۂ ہمایوں میں موجود ہیں۔ اور انہوں نے قلعہ میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ اس پر میجر ہڈسن نے جنرل ولسن سے اجازت لی اور منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کے ساتھ ان کی گرفتاری کے لئے

روانہ ہو گیا۔ اور مقبرہ ہمایوں پہنچ کر ان کو اطلاع دی کہ وہ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی مدافعت کرتے، مرزا الٰہی بخش نے نصیحتوں کا دفتر کھول دیا اور یقین دلایا کہ بادشاہ کی طرح تم کو بھی جان کی امان دے دی جائیگی

اس یقین دہانی پر مرزا افضل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر ڈولی پر سوار ہو گئے میجر ہڈسن نے کچھ دور پہنچنے کے بعد ڈولی رکوا دی۔ اور ان کو اس سے اتار کر حکم دیا کہ وہ اپنا لباس شہزادگی جسم سے علیحدہ کر دیں۔ اس کے فوری بعد اس نے ایک سوار سے بھری ہوئی خرادبین مانگی اور اسے ہاتھ میں لے کر ان پر سر کر دیا۔ گولیاں شہزادوں کے سینہ میں لگیں اور وہ ہائے دھوکہ کہکر زمین پر گرا۔ کچھ دیر تڑپے اور مر گئے۔ بعد میں ان کی لاشوں کو چاندنی چوک میں کوتوالی کے چبوترہ پر لٹکایا گیا۔ ان کی عمر اس وقت صرف ۲۶ سال کی تھی۔ ان کے پسماندگان میں ایک لڑکی اور ایک لڑکا زندہ رہ گیا۔

مرزا خضر سلطان کا کلام غدر کے ہنگامہ میں تلف ہو گیا۔ لالہ سری رام کے بیان کے مطابق وہ شعر اچھا کہتے تھے اور نشست الفاظ بھی درست تھی۔ ان کے چند شعر درج کئے جاتے ہیں۔

مانا کہ ستم تم نہیں کرتے ہو کسی پر
غیروں پہ کرم ہو یہ ستم بھی نہیں تھوڑا
کہتے ہو کہ اک روز مجھے قتل کرینگے
پر یہ بھی تو اے شوخ ستمگر نہیں ہوتا
گالی سے کون خوش ہو مگر حسن اتفاق
جو تیری خوشی وہی میرا مدعا ہوا!
تری خاک کف پا سے نہ بدلوں
کوئی دے گر مجھے اکسیر آ کر

میکشوں کے مزار پہ رکھنا!
ہوں جو بھیگے ہوئے شراب کے پھول
ظلم ہم پہ ذرا سمجھ کے کرو
اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

(خم خانۂ جاوید سوم ص۲۵ ص۲۶ ، مجاہد شعرا ص۲۱۶
خم خانۂ جاوید اول ص۳۴۳ ص۳۴۴ ، دیوان غالب ص۱۰۳)

مرزا محمد دارا بخت

مرزا محمد دارا بخت میراں شاہ عرف مرزا شبو، بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۰۸ھ مطابق ہے۔ ان کی والدہ زکیۃ النسا بیگم مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم ثانی کی صاحبزادی تھیں۔ احسن الاخبار دہلی کی اطلاع کے مطابق ۷ر فروری ۱۸۴۴ء کو مرزا محمد دارا بخت کا ۵۰واں جشن سالگرہ قلعہ دہلی میں انتہائی شان و شوکت سے منایا گیا۔ اس موقع پر بہادر شاہ ظفر نے انہیں ۲۰ اشرفیاں بطور انعام دے کر ان کی قدر افزائی کی۔ امیر احمد علوی نے خم خانۂ جاوید کے مولف کے اس بیان کی تردید کی ہے کہ مرزا محمد دارا بخت مولانا فخر الدین دہلوی کے خلیفہ اور مرید تھے اور بتایا ہے کہ مولانا فخر الدین دہلوی کی وفات کے وقت بہادر شاہ ظفر کا سن دس برس سے زیادہ نہیں تھا۔ تاریخ مشایخ چشت کے مولف نے مناقب فخریہ کے حوالے سے مرزا محمد دارا بخت کو میر محمدی کے مریدوں میں شامل کیا ہے جو مولانا فخر الدین دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے۔

زینت محل اپنے چھوٹے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ بہادر شاہ ظفر مرزا دارا بخت کو ولی عہدی سے معزول کر کے جواں بخت کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیں۔ ابھی یہ کشاکش جاری ہی تھی کہ مرزا محمد دارا بخت کا جنوری ۱۸۴۹ء میں انتقال

ہو گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۰ برس تھی۔ بہادر شاہ ظفر نے ان کے انتقال پر ذیل کا قطع تاریخ کیا۔

آں ولی عہدے کہ دارابخت بود | کرد چوں رحلت ازیں دنیائے دوں
شد درون خلق داغ از سوز غم | گشت سال رحلتش داغ دروں

غالب نے قضیہ ولی عہدی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ایک خط کے ذریعہ جواہر سنگھ جوہر کو مرزا دارابخت کے مرنے کی اطلاع دی اور لکھا۔

"تم نے سنا ہوگا، دارابخت، بہادر شاہ ظفر کا ولی عہد تھا اس کا انتقال ہو گیا ہے اور زینت محل بنت صمصام الدولہ اپنے بیٹے جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔"

(سبد باغ دو در صفحہ ۱۲۳، بہادر شاہ ظفر صفحہ ۹، صفحہ ۹۸)

نواب مرزا داغ

داغ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ کو محلہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے۔ نام ابراہیم رکھا گیا لیکن شادی کے بعد نواب مرزا کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد نواب شمس الدین خاں والی لوہارو تھے۔ لیکن ناسخ نے داغ کی ولدیت شمس الدین خاں کی بجائے چھوٹی بیگم کے نام سے ظاہر کی۔ داغ کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو عمر بھر ناسخ کی صورت نہ دیکھتا، لیکن داغ نے ان سے بھی دوستی نباہی۔

داغ کی عمر چار سال چار مہینہ نوروز کی تھی کہ ان کے والد شمس الدین خاں کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔ داغ اپنے والد شمس الدین خاں کو پھانسی دلائے جانے کی سازش میں حصہ لینے کا الزام غالب پر بھی لگاتے ہیں۔ بزم داغ کے مرتب نے ان کی زبانی نقل کیا ہے کہ "فریزر کے قتل کے سلسلہ میں نواب

شمس الدین خاں کے خلاف انگریزوں سے جو چپقلش خوریاں کی گئیں ان میں غالب کا بھی حصہ تھا "

نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد داغ کی والدہ نے ان کو اپنی بہن عمدہ بیگم کے پاس رام پور بھیج دیا جہاں داغ نے مولوی غیاث الدین رامپوری سے فارسی پڑھنا شروع کی۔ ۱۲۲۰ھ میں داغ کی والدہ نے مرزا فخرالملک مرزا فخرو ولیعہد بہادر شاہ ظفر سے نکاح کر لیا اور لال قلعہ میں پہنچ گئیں تو داغ بھی وہیں آ گئے۔ لال قلعہ میں داغ کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ مولوی احمد حسین نے ادبی کتابیں پڑھائیں، سید امیر پنجہ کش نے خطاطی، مرزا عبداللہ بیگ نے بانک، مرزا اشگل بیگ نے پھکیتی، اسجن خاں اور بندو خاں نے شہسواری سکھائی۔ خود مرزا فخرو بھی بندوق چلانے اور تیغہ کاٹنے کی مشق کرانے لگے۔

لال قلعہ ہی میں داغ نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور ذوق سے رجوع ہوئے اور دیکھتے دیکھتے اساتذہ کی صف میں جگہ پیدا کر لی۔ خود غالب ان کے شعروں کی داد دینے اور ان کی کوششوں کو سراہنے لگے۔ اس کا اندازہ خود داغ کے بیان کردہ واقعہ سے ہوتا ہے۔ داغ نے بیان کیا ہے :

"میں نے مرزا غالب کی مشہور غزل

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ۔۔۔ اب کسی بات پر نہیں آتی

پر غزل کہہ کر جب انھیں سنائی تو بڑی تعریف کی۔ بعض بعض اشعار پر تو مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے اپنی غزل کا جب یہ شعر پڑھا :

دلبروں پر طبیعت آتی ہے ۔۔۔ اس طرح اس قدر نہیں آتی

تو یہ شعر حضرت غالب نے کئی دفعہ پڑھوایا اور بے حد پسند کیا۔ اس کے بعد جب میں اس شعر پر پہنچا :

دل کے لینے کی گھات ہے کچھ اور یہ سمجھے منت بر نہیں آتی

تو غالب بے چین ہو گئے۔ زانو پر ہاتھ مار کر بولے خدا نظر بد سے بچائے۔ صاحبزادے تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ میری غزل کے اس شعر پر

حال معلوم ہے قیامت کا بات کہنے میں پر نہیں آتی

مرزا غالب کھڑے ہو گئے۔ مجھے سینے سے لگا لیا۔ دیر تک کھڑے کھڑے جھومتے رہے اور میرے شعر کو دہراتے رہے۔"

اسی طرح داغؔ نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے، بیان کرتے ہیں کہ" میں ہر دوسرے تیسرے روز غالب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، مختلف باتیں ہوا کرتی تھیں شطرنج بھی ہوتی تھی۔ میں جب ہار جاتا تھا تو مرزا صاحب فرماتے کہ اس جرمانہ میں اپنی غزل سناؤ۔ ایک دفعہ میں شطرنج کی بازی ہارا حسب معمول مرزا صاحب بولے کہ غزل سناؤ میں غزل پڑھنا ہی چاہتا تھا کہ فرمایا کہ میری کہی ہوئی زمین" نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے" میں جو غزل تم نے کہی ہے وہ سناؤ۔ میں نے تعمیل حکم کی، میرے اس شعر پر

اے فلک سامانِ محشر ہی سہی اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

مرزا غالب بولے میرے خیال کی کتنی پیاری ترجمانی کی ہے اور پھر اپنا شعر پڑھا

ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق

نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اس کے بعد میں نے اپنا یہ شعر پڑھا:

تیرے جلوے کا تو کیا کہنا مگر دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

شعر سن کر مرزا غالب اُف کر کے رہ گئے۔ میں نے فوراً یہ دوسرا شعر پڑھا

گو تری نظروں سے کل گر ہی پڑیں آج تو کوئی ٹھکانا چاہیے

میرے اس شعر پر غالب تڑپ گئے۔ بولے ٹھہرو، زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھے۔ میرے گرد

چار پانچ بار گھومے ۔ گھومنے کی حالت میں نہایت دردناک آواز میں میرا شعر پڑھتے جاتے تھے"

۱۲۷۲ھ میں مرزا فخرو کو زہر دیدیا گیا اور وہ انتقال کر گئے ، جس پر داغ اور انکی والدہ کو قلعہ سے نکلنا پڑا ۔ چند روز دہلی میں رہ کر رام پور کی راہ لی ، جہاں ظہیر دہلوی اپنے بھائی کے ساتھ موجود تھے ۔ انھوں نے صاحبزادہ رضا محمد خاں سے سفارش کی اور داغ کو ملازم کرا دیا ۔ اس کے بعد ۱۲ راپریل ۱۸۶۶ء کو داغ زمرۂ مصاحبین میں شامل کئے گئے اور کارخانہ جات کی نگرانی کا کام ان کے سپرد کیا گیا ۔ اسی دوران کسی ظریف نے ان پر ایک شعر کے ذریعہ پھبتی کسی جو بہت مشہور ہوئی ۔

شہر دہلی سے آیا اک مشکی　　آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کا کہنا ہے کہ انھوں نے لوگوں سے اس شعر کے کہنے والے کے متعلق بہت کچھ معلوم کیا ۔ اعلان بھی کیا کہ اس شعر کا کہنے والا اگر مجھ سے آکر ملے تو میں نہ صرف یہ کہ اس سے مل کر خوش ہوں گا بلکہ اس کی شاعرانہ طباعی اور ذہانت کی داد بھی دوں گا اور بے عذرت بھی کروں گا لیکن اس شعر کے مصنف کا پتہ نہیں لگ سکا ۔ بہرحال انھوں نے اس کا جواب دے دیا :-

روسیاہوں کو نہ دیکھیں چشم بد سے روسفید
مشک سے قیمت میں کم ہے مرتبہ کا فور کا

جب تک نواب کلب علی خاں زندہ رہے داغ نے رام پور نہیں چھوڑا ۔ جب وہ انتقال کر گئے تو داغ نے دہلی کا قصد کیا ۔ پھر مختلف علاقوں کی سیر کرتے ہوتے ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد پہنچے ۔ نصیبہ سکندر تھا ۔ چند دنوں کی امیدواری کے بعد ۱۸۹۱ء میں ان کو نواب محبوب علی خاں آصف جاہ ششم کی استادی مل گئی ۔ ساڑھے چار سو روپے مشاہرہ مقرر ہوا ۔ اس کے علاوہ انعام و اکرام کے طور پر ہزاروں روپے ملنے لگے ۔ ۱۳۱۱ھ میں بلبل ہندوستان جہاں استاد دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر داغ دہلوی خطاب بھی مرحمت

ہوا۔ حیدرآباد ہی میں ۹ رذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کو فالج کے عارضہ سے انتقال کیا اور درگاہ یوسف شریف کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔ نواب مرزا داغ سے سنہ انتقال برآمد ہوتا ہے۔ چار دیوان اور ایک مثنوی ان سے یادگار ہے۔

غالب نے اپنے بعض خطوط میں ان کا ذکر کیا ہے جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے جس زمانے میں حسین علی خاں کی شادی کے سلسلہ میں نواب کلب علی خاں سے مالی امداد کی درخواست کی تھی اور ان کی جانب سے اس کے منظور کرنے میں تعویق و تاخیر سے کام لیا جا رہا تھا۔ غالب نے داغ سے سفارش کروائی تھی اور ایک خط کے ذریعے ان کی درخواست منظور ہونے کا پیغام بھیجا تھا۔ اس طرح داغ غالب کے زبردست حریف اور دشمن شمس الدین خاں کے بیٹے ہونے کے باوجود ان کے محسن بھی تھے۔

(بزم داغ ص۲۱۶ ص۲۱۸ ص۳۸ ص۳۹ ص۴۰

مکاتیب غالب ص۸۱ ص۸۳ ، خمخانۂ جاوید سوم ص۱۰۳

داغ ، انتخاب یادگار ص۱۲۸)

ہیرا سنگھ درد

ہیرا سنگھ درد لالہ چھجے مل کھتری کے صاحبزادہ اور جواہر سنگھ جوہر کے چھوٹے بھائی تھے۔ چونکہ ان کے والد غالب کے دوست اور بھائی شاگرد تھے۔ انھوں نے بھی غالب ہی سے اصلاح لی۔

ہیرا سنگھ دبستاں نشینی ہی کے زمانے سے غالب کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ اس طرح ان کے اوقات کا بڑا حصہ غالب کی صحبت میں گذرتا تھا۔ اگر وہ کبھی نہیں آتے اور ان کی آمد و رفت میں تعطل ہو جاتا تو غالب فکرمند ہو جاتے تھے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۹ء میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ غالب ہی کے

ایک اور خط سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی بیوی زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکی اور ۱۸۵۳ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ مالک رام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جواہر سنگھ جوہر نے ان کی ملازمت کے لیے کوشش کی تھی اور رہتک میں ملازم کرادیا تھا لیکن رہتک میں ان کا دل نہیں لگا چاہتے تھے کہ کہیں اور تبادلہ کرالیں، چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے غالب کو لکھا کہ اگر وہ پیارے لال آشوب سے سفارش حاصل کرسکیں تو میرا تبادلہ ممکن ہے۔ غالب نے اس کے جواب میں ان کو لکھ بھیجا کہ مدرسہ کے علاقہ میں تو نوکر نہیں ہو جو پیارے لال بابو کو تمہاری بدلی کا اختیار ہو۔ ان کا کلام اور مزید حالات دستیاب نہیں ہوتے ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان ہی کی خواہش پر غالب نے اپنی نظم و نثر فارسی کا مجموعہ "سبد باغ دو در" کے نام سے مرتب کیا تھا۔

(سبد باغ دو در ص ۱۱۸، ص ۱۲۳، ص ۱۸۹ خطوط غالب ص ۵۸۹

"تلامذۂ غالب ص ۱۰۵)

محمد حبیب اللہ ذکا

محمد حبیب اللہ ذکا کے اسلاف نبے جاپور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ناساعد حالات کی بنا پر بیجاپور سے کرناٹک کی طرف ہجرت کی اور وہاں آباد ہوگئے ذکا کے والد حافظ محمد میراں وہیں پیدا ہوئے۔ ذکا کا مقام پیدائش اودگیر ہے انھوں نے بے خود و بدخوئے (۱۲۴۳ھ) سے اپنی تاریخ پیدائش نکالی ہے۔ ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی محمد رحمت اللہ سے حاصل کی، بعد میں دوسرے اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا اور مختصر سی مدت میں عربی اور فارسی پر پوری مہارت حاصل کرلی۔

ذکا کا گھریلو ماحول علمی اور ادبی تھا، اس لیے بچپن ہی سے ان کو شاعری کا

شوق پیدا ہوگیا - ابتدا میں میر مہدی ثاقب سے اصلاح کی - بعد میں سید میر مرتضیٰ بینش کو اپنا کلام دکھانے لگے - ان استادوں نے ان کی شاعری کو ایسی جلا دی کہ نوعمری ہی میں ان کا شہرۂ سخن کرناٹک میں عام ہوگیا - کرناٹک کے امیروں اور شاعروں کو ان کی یہ مقبولیت پسند نہیں تھی - وہ ان سے حسد کرتے اور وقتاً فوقتاً نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تھے - ذکا نے اس کو اپنی توہین و تحقیر پر محمول کیا اور ۱۲۶۳ھ میں کرناٹک سے حیدرآباد چلے گئے ـــــ !

حیدرآباد میں ذکا کو سر آنکھوں پر جگہ دی گئی - وہاں کے رئیسوں میں سید محمد عباس (والد مہدی نواز جنگ) اور عبدالوہاب نے ان کو مختار الملک کی سرکار میں پہنچایا جہاں وہ ان کے میر منشی مقرر ہوگئے - اس زمانے میں انھوں نے میر شمس الدین فیض سے اصلاح لی ۱۸۶۰ء میں غالب کا شہرہ سنا تو ان کے تلامذہ میں شامل ہوگئے -

ذکا اور مختار الملک کا تعلق مدتوں رہا - اس اثنا میں مختار الملک نے کسی بھی لمحہ ان کو اپنے سے جدا نہیں ہونے دیا - جس وقت ذکا کی تقرری درجہ سوم کی تعلقداری پر عمل میں آئی تو بھی وہ مختار الملک سے وابستہ رہے - بعد میں مختار الملک نے ان کو اپنے جاگیری علاقوں کی دیکھ بھال کے کام پر مامور کر دیا اور وہ ناگر کرنول کی تعلقداری پر چلے گئے - یہاں ۱۲۹۱ھ میں ان پر فالج نے شدید حملہ کیا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے "مات فی رب حبیب اللہ" سے ان کا سال وفات برآمد ہوتا ہے - ناگر کرنول سے ان کی لاش حیدرآباد لاکر وہاں کے ایک محلہ چنچل گوڑہ میں دفن کی گئی -

غالب نے مختار الملک کی تعریف میں قصیدہ لکھ کر ان ہی کے ذریعہ پہنچایا تھا انکے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"قصیدہ و غزل میں صلہ و تحسین بر اقتضائے بخت و قسمت ہے نہ خریدہ اندازۂ ارزش کلام، ممدوح سخن فہم ہوتا تو مجھ کو متوسط کے تساہل کا وہم ہوتا

اغنیا کو نہ مذاقِ شعر سے نسبت ہے نہ مطالعۂ اشعار کی فرصت، متوسط نے
بقدرِ ہمت سلسلہ جنبانی کی لیکن مرجع نے نہ قدر دانی کی"

اسی سلسلے میں ایک اور خط میں لکھا:

"صفتِ سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا، کچھ
قدر دانی نہ فرمائی"

ذکا بہت قادر الکلام اور پُر گو شاعر تھے، ان کا ایک دیوان ان کی زندگی ہی میں
شائع ہوا تھا لیکن اب وہ نہیں ملتا ہے۔ ان کی غزلوں کا نمونہ یہ ہے:

باغِ ہستی میں بہت میں کم رہا ۔۔۔ تو بھی روتا صورتِ شبنم رہا

اے گل! دماغ خندۂ بے جا نہیں مجھے ۔۔۔ آئی بہار تو میں چمن سے نکل گیا
عشق بتاں، اور بھی بہت ہیں کام ۔۔۔ کیا کروں عمرِ تنگ فرصت کو
شیخ صاحب! مری بھی ہے اک عرض ۔۔۔ آپ کرنا معاف جرأت کو

چھوڑ دوں نالہ کچھ بھی بات ہے یہ ۔۔۔ ناصحو! میرے دم کے ساتھ ہے یہ

مایوس نہ کر ڈالے کہیں رنجشِ بے جا ۔۔۔ ہم وصل کے وعدے پہ تقاضا نہ کریں گے

دل نشینی تمہارے قامت کی ۔۔۔ مصرعِ انتخاب کیا جانے
چشمِ بد دور تیری خوش نگہی ۔۔۔ نرگسِ نیم خواب کیا جانے

اس رُخ پہ خطِ سبز نکلنے کے دن آئے ۔۔۔ کچھ رنگ زمانے کا بدلنے کے دن آئے

میں نے بازیِ عشق میں آ ذلیت جیتے رہنے سے شرط ہاری ہے

طوف کعبہ سے غرض ہم کو بتوں کی دید ہے اے جنوں! رہنے دے پردہ جامۂ احرام کا

(گلزار اعظم ص ۱۹۶-۱۹۹ ، محبوب الزمن ص ۴۳۳-۴۳۶
خطوط غالب ص ۳۷۱)

خواجہ قمرالدین راقم

خواجہ قمرالدین خاں راقم، خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان کے بڑے صاحبزادے تھے۔ لالہ سری رام نے ان کو غالب کا رشتہ میں بھتیجا بتایا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے بیان کے مطابق راقم کے پردادا اور غالب کے دادا آپس میں بھائی بھائی تھے۔ خود راقم کا بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ اپنے پردادا اور غالب کے دادا کو عم زاد بھائی بتاتے تھے۔

راقم کا سال ولادت ۱۸۳۲ء ہے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور دہلی ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ سولہ سال کی عمر میں ملازمت کا شوق ہوا۔ لال قلعہ میں ملازم ہوتے۔ کچھ دنوں بہادر شاہ ظفر سے تیراندازی سیکھی، پھر ان کے ولی عہد مرزا فخرو فتح الملک کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ مرزا فتح الملک کے انتقال پر الور کا قصد کیا۔ چند ہی سال گزارے تھے کہ اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامہ کے دوران اخراج کا حکم ملا، جس پر جے پور جا کر مہاراجہ رام سنگھ کی سرکار میں روزینہ دار ہو گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اور وہیں مارچ ۱۹۱۰ء میں فوت ہوئے۔ ان کی بیوی مرزا غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عاشور بیگ کی صاحبزادی ننگی بیگم تھیں جن کے بطن سے دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔

راقم کا دیوان ۱۸۹۸ء میں نغمۂ اردو کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی تصانیف میں سبعہ سیارہ اور دیوان بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے دیوان غالب کی شرح بھی لکھی تھی جس کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ لالہ سری رام کے بیان کے مطابق راقم درجہ دوم کے شعرا میں اعلیٰ پایہ رکھتے تھے۔ مضمون آفرین طبیعت پائی تھی، زبان و بیان میں سلاست اور بندش میں چستی ترکیب کی استواری ان کے اشعار کا خاص جوہر ہے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

شق ہو گیا ہے سینۂ جفاؤں سے یار کی
اب راز عشق ہم سے چھپایا نہ جائے گا
رہنے دو زخم دل کو امانت ہے یار کی
احسان چارہ ساز اٹھایا نہ جائے گا
کس دل سے کہتے ہو کہ تجھے خاک میں ملائیں
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
قدرت سے نقشۂ قد دلدار بن گیا
اللہ سے بھی اب تو بنایا نہ جائے گا

ناخن بڑھے ہوئے ہیں اگر چارہ گر نہیں
کریں گے اچھے زخم جگر اس دوا سے ہم
کیوں ہم کو کوئی پوچھے تعلق نہیں جسے
اچھے ہیں یا برے ہیں کسی کی بلا سے ہم
اے نالہ ہائے ہجر تمہیں جانتا ہوں میں
جب کچھ لگتے ہو آگ لگا کر رہے ہو تم

ڈھونڈا کیے جہاں میں کوئی بے وفا ملے

جتنے ملے ہمیں وہ غرض آشنا ملے

اک ہم ہیں بے نصیب کہ دشنام بھی نہیں

اک وہ ہیں جن کو بوسہ بغیر التجا ملے

تم رہو غیر رہے تم کو مبارک عشرت

ہم چلے جائیں گے محفل سے ہمارا کیا ہے

(خمخانۂ جاوید جلد سوم ص۳۵۵، ص۳۵۶، ص۳۵۷، ص۳۵۸، ص۳۵۹، ص۳۶۰، احوال غالب ص۲۹۱ تا ص۲۹۳، مضامین فرحت پنجم ص۱۹۵، ص۲۹۵)

ارسطو جاہ رجب علی

رجب علی کا نام ان لوگوں کی فہرست میں نمایاں نظر آتا ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی سعیِ انقلاب کو ناکام بنایا اور انگریزوں کا ساتھ دے کر قوم کشی اور وطن فروشی کی انتہائی مکروہ تصویر پیش کی۔ رجب علی ۱۸۰۶ء میں ضلع لدھیانہ کے ایک قصبہ کونڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ جب ان کی عمر دس برس کی ہوئی، ان کا خاندان وہاں سے جگراؤں منتقل ہو گیا۔ جس کے بعد ۱۸۱۸ء میں وہ حصولِ تعلیم کے لئے لاہور بھیجے گئے جہاں انھوں نے حکیم سید خیر شاہ لاہوری اور حکیم ملا مہدی خطائی سے مختلف علم و فنون میں استفادہ کیا۔ بعد ازاں ۱۸۲۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہو کر وہیں ریاضی کے مدرس ہو گئے، لیکن ان کی یہ مدرسی زیادہ دنوں نہیں چلی، انھوں نے مدرسی کو ترک کر کے ہوشنگ آباد اور پھر بھوپال کا قصد کیا اور محکمہ فتاویٰ شرعیہ میں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۳۳ء میں اچانک بھوپال کا قیام ترک کر کے وطن کی راہ لی اور سردار فتح سنگھ کے مصاحبوں

میں شامل ہو گئے۔ اسی کے چار ماہ بعد ان کو جان رسل کلارک نے انبالہ میں اپنا منشی بنا لیا۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے ان کی بہتر کارکردگی سے متاثر ہو کر جگراؤں کے کچھ علاقے بطور جاگیر دے دیے۔ اسی دوران ہنری لارنس کے ساتھ راجپوتانہ کا بھی دورہ کیا۔ غالب نے ۱۲ مئی ۱۸۵۵ء کو منشی جواہر سنگھ کے نام ایک خط لکھا ہے۔

"مولوی رجب علی نے دہلی پہنچ کر کچھ دنوں قیام کیا، پھر جودھپور روانہ ہو گئے جہاں ایجنٹ راجستھان کے دفتر میں ان کا بڑا لڑکا ملازم ہے، روانہ ہوتے وقت ان کا چھوٹا لڑکا اور چھوٹا بھائی بھی ان کے ساتھ تھا، وہ واپس لوٹے تو دونوں ان کے ساتھ نہیں تھے۔ غالباً ان کو ایجنٹ راجستھان کے سپرد کر دیا ہے تاکہ ہر ایک کام سے لگ جائے"

رجب علی نے دہلی میں اس قیام کے دوران علم الکلام کے منتہی مولوی حیدر علی سے مولوی صدر الدین آزردہ کے بالمواجہ مناظرہ بھی کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران ان کو کمانڈر انچیف کا میر منشی بنایا گیا۔ ان کی خدمات کے صلہ میں ان کو پانچ ہزار روپے نقد اور ارسطو جاہ اور خان بہادر کے خطابات دیے گئے۔

غالب سرکار انگریزی میں علاقہ ریاست دو دمانی کے رکھنے کے مدعی تھے دربار میں ان کے لیے داہنی صف میں دسواں نمبر سات پارچہ مع جیغہ سر پیچ اور مالائے مروارید خلعت مقرر تھا، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ان کی پنشن تو جاری ہو گئی، لیکن یہ اعزاز ختم کر دیا گیا۔ جس کی بحالی کے لیے انھوں نے مختلف انداز سے اپنی کوششیں شروع کیں۔ وہ جانتے تھے کہ رجب علی کو سرکار انگریزی میں اثر و رسوخ حاصل ہے اور وہ کمانڈر انچیف کے میر منشی کی حیثیت میں کام کر رہے ہیں، اگر انھوں نے ان کے سلسلہ میں کسی قسم کی سفارش کی تو اسے مسترد نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ ایک خط کے ذریعہ انکی اس جانب توجہ دلائی کہ اس مرتبہ پنجاب میں جو دربار ہوا ہے۔ اس میں ان کا نام رئیس

زادوں کی فہرست سے نکال کر رعایا میں رکھا گیا ہے اور وہ خلعت و دربار کے اعزاز سے محروم ہو گئے ہیں - اس کے ساتھ ہی انھوں نے رجب علی سے یہ بھی درخواست کی کہ اگر وہ اپنے اثر و رسوخ سے کام لیں تو یہ ان کی عنایت ہوگی ۔

رجب علی نے اس سلسلہ میں غالب کی کہاں تک مدد کی اس سلسلہ میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا - البتہ یہ ضرور ہے کہ ۲ مارچ ۱۸۶۳ء کو دربار و خلعت پھر سے جاری ہو گیا - ان کے خلعت دوبارہ جاری ہونے سے دو سال پہلے، رجب علی مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لئے عراق اور عرب کے سفر پر روانہ ہو گئے - وہاں سے واپس آنے کے چند سال بعد ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا ۔

(تذکرۂ روسائے پنجاب صـ ۳۳۹ ، بہادر شاہ ظفر صـ ۱۳۹
سبد باغ دو در صـ ۱۳۶)

مرزا رحیم بیگ میرٹھی

مرزا رحیم بیگ کے والد کا نام پیر بیگ تھا، جنھوں نے تلاش روزگار میں دہلی سے میرٹھ کی طرف ہجرت کی اور اس کے ایک قصبہ سردھنہ کو اپنا وطن مالوف بنا لیا - مرزا رحیم بیگ سردھنہ ہی میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر ۱۲۵۷ھ میں سردھنہ سے میرٹھ پہنچ کر حکیم بو علی خاں سے علوم متداولہ کے سلسلہ میں رجوع ہوئے - حکیم بو علی خاں نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر ان کو اپنی پرورش میں لے لیا - اور وہ ان کے ساتھ بطور فرزند متبنیٰ رہنے لگے ۔

مرزا رحیم بیگ کو ایک اندازہ کے مطابق ۱۲۶۱ھ میں شاعری سے دلچسپی ہوئی اس وقت میرٹھ میں محمد بخش ناداں اور ان کے تلامذہ چھائے ہوئے تھے - مرزا رحیم بیگ نے محمد بخش ناداں کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ان کے مشورہ پر شعر کی

بجائے رحیم تخلص کرنے لگے۔ اسی دوران میرٹھ ہی کے ایک مدرسہ میں معلمی بھی اختیار کرلی۔

۱۸۵۸ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے کچھ دنوں بعد غالب نے اپنی کتاب قاطع برہان شائع کی جس پر تمام علمی حلقوں میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اور اس کے جواب میں مختلف لوگوں نے یکے بعد دیگرے متعدد کتابیں لکھیں۔ مرزا رحیم بیگ بھی خاموش نہیں رہ سکے۔ انھوں نے بھی قاطع برہان کے جواب میں ساطع برہان کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور اسے ۱۲۸۲ھ میں میرٹھ کے ہاشمی پریس سے شائع کرایا۔ اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد غالب نے ماگست ۱۸۶۵ء میں نامۂ غالب کے عنوان سے مرزا رحیم بیگ کو ایک تفصیلی خط لکھا اور فرہنگ نویسوں کے باب میں اپنے عقیدہ اور مسلک کی وضاحت کی اور تمام اعتراضات کے جواب دیئے اور لکھا:

”مجھ کو جس قدر تم نے لکھا یا کوئی اور لکھ رہا ہے۔ اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور درست نہیں، لیکن واللہ مجھ کو عرصۂ محشر میں باز خواست نہیں، میں نے عشق کی برکت سے دونوں جہاں سے صلح کرلی ہے، تم دشمن بنکر میری محبتوں کا عالم دیکھو“

غالب مولوی امام بخش صہبائی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی اثنا میں ان کو لوگوں سے معلوم ہوا کہ ساطع برہان کا مولف ان کا شاگرد مرزا رحیم بیگ ہے تو انھوں نے ایک طرف صہبائی کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالا، دوسری طرف مرزا رحیم بیگ کی شخصیت اور حیثیت کے سارے کس بل نکال دئے۔ چنانچہ ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں:

”رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہوگیا ہے۔ باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے

دیکھیں، تم کو بھی بھیجوں گا۔"

سیاح ہی کے نام ایک اور خط میں لکھا ہے:

"رحیم بیگ کا وطن اصلی سردھنہ، فی الحال میرٹھ میں مقیم اور معلمی اس کا پیشہ ہے اور آٹھ دس برس سے اندھا۔ نظم و نثر میں مولوی امام بخش صہبائی کا شاگرد اور فارسی شعر کہتا ہے۔"

عبدالرزاق شاکر کے نام ان کے خط کا اقتباس یہ ہے:

"رحیم بیگ میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہوگیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے۔ اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اسکو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں وائے اس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عز و وقار ہو۔"

قادر بخش صابر نے اپنے تذکرہ میں مرزا رحیم بیگ کی ذہانت و اصابت رائے کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے اردو اور فارسی میں چند رسالے تصنیف کئے ہیں اور حکیم احسن اللہ خاں کی فرمائش پر قصص الانبیاء کو بڑی حد تک منظوم کرلیا ہے۔

مرزا رحیم بیگ کے چند اردو شعر درج کئے جاتے ہیں:

جو لکھتا ہوں بیاں اپنے دلِ بے تاب و مضطر کا
تڑپتا ہے بہ رنگِ نفسِ عاشق تار مسطر کا

یہ کس مضطر کی بے تابیٔ دل کا حال لکھا ہے
کہ نقشہ ہے خطِ ملفوف میں لوٹن کبوتر کا

خدا جانے کہ وقتِ ذبح کیا اندازِ قاتل تھا

کہ نعرہ ہے لبِ ہر زخم سے اللہ اکبر کا

طفیلِ لاغری میں رہ گیا ہوں کوئے جاناں میں
کہ مثلِ بو نظر آتا نہیں اور ہوں گلستاں میں

ایک سینہ ہے روکے کس کس کو
تیر کو، تیغ کو کہ خنجر کو

(ادبی خطوط غالب صـ ۲۵۲، صـ ۲۵۳ _ گلستان سخن اول صـ ۳۹۳، صـ ۳۹۵

عود ہندی صـ ۳۵۷ صـ ۳۹۵ صـ ۳۴۳)

حکیم رضی الدین خاں بہادر

اعتماد الدولہ مہابت خاں اپنے دور کے ممتاز اطبا میں سے تھے۔ بعض مورخوں اور تذکرہ نویسوں کے بیان کے مطابق ان کو اسرارِ حکمت اور رموزِ طبابت کا ماہر خیال جاتا تھا۔ انہوں نے جب انتقال کیا تو ان کی عمر ستر سال سے زاید تھی حکیم رضی الدین خاں ان کے بالواسطہ رشتہ دار تھے۔ ان کی طبابت کی مشق اتنی بڑھی ہوئی تھی اور اس فن میں ان کو اتنا وسیع تجربہ حاصل ہو گیا تھا کہ ان کو دربارِ شاہی سے غیاث الدولہ، عمدۃ الملک اور حکیم رضی الدین خاں بہادر الحسان جنگ کے خطابات دیئے گئے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی حکیم محمد حسین خاں کو بھی اعلیٰ درجہ کا طبیب اور فخرِ خاندان سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۴۶ء میں جب نواب فرخ آباد بیمار ہوئے اور انہوں نے بہادر شاہ ظفر سے درخواست کی کہ وہ حکیم امام الدین خاں کو رخصت کر دیں تو احسن الاخبار کے

ایڈیٹر نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور رائے دی کہ

"حکیم امام الدین صاحب کے بجائے حکیم رضی الدین خاں بہادر کو بھیج دیا جائے کہ یہ بڑے معرکے کا علاج کرتے ہیں۔ مایوس مریضوں کو بھی ان کے علاج سے شفائے کلی حاصل ہو جاتی ہے۔ دہلی میں تو ان کی تشخیص اور علاج لوگوں کو بہت راس آگیا ہے۔"

حکیم رضی الدین خاں، مرزا علی بخش رنجور کے دوستوں میں سے تھے اور ان کو غالب کی نثر فارسی حد درجہ پسند تھی، جس وقت غالب نے اپنا دیوانِ فارسی "گل رعنا" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ مرزا علی بخش رنجور نے انکی نثر کو پڑھا تو ان کے جی میں آئی کہ یہ نثر اور غالب کی دوسری متفرق تحریریں یک جا جمع کر دی جائیں لیکن وہ اپنی مصروفیت کے باعث ایسا نہ کر سکے۔ بعد میں حکیم رضی الدین خاں بہادر نے تحریک کی اور ان پر زور دیا کہ وہ بہر طور غالب کی فارسی تحریروں کو یک جا جمع کر دیں۔

حکیم رضی الدین خاں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں عملی طور پر کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے تاریخی روزنامچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ۲ر اگست ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر نے موتی مسجد میں عیدالضحیٰ کی نمازِ دوگانہ ادا کی تھی۔ جلسۂ نذر گذاری کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں حکیم رضی الدین خاں نے تاخیر سے حاضر ہو کر نذر پیش کی تھی انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو حکیم رضی الدین خاں روپوش ہو گئے لیکن بعد میں ان کو ایک مخبر کی اطلاع پر گرفتار کر کے گولی مار دی گئی۔ غالب نے ۱۸۶۰ء میں انوار الدولہ شفق کے نام ایک خط میں اس پر افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہے ہے کیونکر لکھوں، حکیم رضی الدین خاں کو ایک خاکی نے قتلِ عام میں گولی مار دی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے"

خطوط غالب صفحہ ۳۶۹، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱

(احسن الاخبار ۸ مئی ۲۶ء و بحوالہ روزنامچۂ عبد)

(دیباچہ پنج آہنگ کلیات نثر غالب)

مرزا شمشاد علی بیگ رضواں

مرزا شمشاد علی بیگ رضواں، مرزا قربان علی بیگ سالک کے چھوٹے بھائی اور مرزا عالم علی بیگ کے صاحبزادے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۵۲ھ ہے۔ لالہ سری رام کے قول کے مطابق انہوں نے فارسی سبقاً سبقاً مرزا غالب سے پڑھی۔ لالہ سری رام نے ان کو نواب احمد سعید خاں طالب اور منشی بہاری لال مشتاق کا ہم مشق بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ شطرنج کھیلنے میں بھی بے مثل تھے۔

مرزا شمشاد علی رضوان کو دہلی میں کوئی مناسب ذریعہ معاش نہیں مل سکا تو وہ الور چلے گئے۔ پہلے وکالت کی۔ کچھ عرصہ بعد ڈپٹی مجسٹریٹ بنا دیے گئے۔ چالیس سال کی عمر میں ۱۲۹۳ھ میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال پر ان کے بڑے بھائی مرزا قربان علی بیگ سالک کو سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے اس سلسلہ میں ایک طویل دردناک نظم لکھی۔

مرزا شمشاد علی بیگ رضوان نے ایک مختصر سا رسالہ لباط فرہنگستان کے نام سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ اسی طرح کے تین اور رسالے لکھے تھے جن کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ لالہ سری رام نے ان کی متانت اور پختہ کلامی کی تصدیق کی ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے طبیعت دقت پسند پائی تھی۔ اور نازک خیالی کی طرف میلان خاطر تھا۔ بلند پروازی اور رسائی فکر کی بدولت اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔

اردوئے معلّیٰ میں مرزا شمشاد علی بیگ رضوان کے نام غالب کے دو خط ملتے ہیں۔ ایک میں ان کو فرزند ارجمند اور دوسرے میں مرزا سے مخاطب کیا ہے۔ پہلے میں گورنر کا حال، ٹونک والے سید معراج احمد کی خیریت اور علی نقی وزیر شاہ اودھ

کی حقیقت دریافت کی ہے اور لکھا ہے۔

"آٹھ نو دن میں خط کی آمد وشد یقینی ہے۔ نو دن راہ دیکھوں گا۔ دسویں دن اگر تمہارا خط نہ آیا تو اجنبی بن جاؤں گا۔"

دوسرے خط میں اپنی طرف سے جواب نہ بھیجنے پر معذرت کا اظہار کیا ہے۔

"رام پور میں سفر میں تاب و طاقت، حسنِ فکر، لطفِ طبیعت، یہ سب اسباب ٹ گیا۔ اگر تمہارے خط کا جواب نہ لکھوں تو محلِ ترحم ہے نہ مقامِ شکایت سنو میرے خط نہ پہنچنے سے تم کو تشویش کیوں ہو۔ جب تک زندہ ہوں غم زدہ افسردہ ناتوان و نیم جان ہوں۔ جب مر جاؤں گا تو میرے مرنے کی خبر سن لوگے پس جب تک میرے مرنے کی خبر نہ سنو جانو کہ غالب جیتا ہے۔"

کیا خاک پائے کوئی مزہ اعتدال کا
ان کا ہے ایک کھیل بگڑنا خیال کا

اخیا میں پھیل کر بھی وہ حیرت فزا رہا
کیا پوچھتا ہے اس کے فروغِ جمال کا

گھیرا ہے جب غبارِ الم نے جہان کو
وہ ایک ذرہ ہے مرے گردِ ملال کا

گم کردگانِ راہ کو ہو نقشِ پا دلیل
مل جائے گر نشان ترے پائمال کا

عشق کا نام دوسرا کیا ہے
مرض موت کے سوا کیا ہے

کہہ چکے آپ سن چکے ہم پھر
کہتے ہو کہتے ماجرا کیا ہے

خود تماشہ ہے خود تماشائی
کون جانے وہ خودنما کیا ہے

ٹٹ چکے مٹ چکے پھرائے گردوں — ہم پہ تو جور کر رہا کیا ہے
میں تو مرتی نہیں کہ ہوں محرم — جلوہ پردے میں اے خدا کیا ہے
آہ کو اپنی کیوں کروں تابع — چرخ کیا چرخ کی بنا کیا ہے
دل لگا ایسے بھولے سے خوباں — جو سمجھتا نہیں ادا کیا ہے

خانۂ جاوید سوم صہ ۳۰۱ تا ۳۰۳ ۔ خطوط غالب دوم صہ ۹۳، ۹۴

محمد مروان علی خاں رعنا

محمد مروان علی خاں رعنا مراد آباد کے ان رئیسوں میں سے تھے جن کے اہل خاندان نے شاہان مغلیہ اور نوابان اودھ کے زمانے میں مناصب جلیلہ پر فائز ہو کر نمایاں خدمات انجام دی تھیں ۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا انتظام ان کے گھر ہی پر کیا گیا ۔ اس سے فراغت پانے پر انھوں نے سرکار انگریزی میں ملازمت کر لی ۔ اس طرح ۱۸۵۰ء میں کمشنر پنجاب کے دفتر میں پیشکار ہو کر راولپنڈی پہنچے ، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران ان کو حسن ابدال (ضلع اٹک) کا تحصیلدار مقرر کیا گیا ۔ حسن کارکردگی کی بنا پر سند خوشنودی بھی دی گئی ، لیکن وہ تنخواہ قلیل ہونے کی وجہ سے اس عہدہ پر زیادہ دنوں کام نہیں کر سکے ۔ دسمبر ۱۸۵۸ء میں استعفیٰ داخل کر دیا ۔ ۱۸۵۹ء میں نواب مالیر کوٹلہ نے ان کو اپنے یہاں بلا کر اپنی ریاست کا مدار المہام بنا دیا ۔ اس خدمت پر کام کرتے ہوئے چار سال گزرے تھے کہ والی ریاست کپور تھلہ کے چھوٹے بھائی نے معتمد کی حیثیت سے ان کی خدمات حاصل کر لیں ۔ اس کے چند سال بعد ان کو والی الور مہاراجہ شیودھان سنگھ کی جانب سے عہدہ ہائے جلیلہ کا لالچ دیا گیا جس پر انھوں نے کپور تھلہ کی ملازمت ترک کر دی ، جس کے نتیجہ میں بہت دنوں تک بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑا ۔

۱۸۶۷ء میں ایکبار پھر ملازمت کی صورت پیدا ہوئی اور جودھپور میں نائب دیوان ہوگئے' اس کے کچھ دنوں بعد ان کے حسن انتظام کی وجہ سے والیٔ جودھپور نے ان کو "نظام الدولہ منتظم الملک' نواب محمد مردان علی خاں بہادر قائم جنگ" کے خطاب سے سرفراز کرکے دیوان بنا دیا۔ جاگیر اور نقارہ و نشان بھی دیے'

محمد مردان علی خاں رعنا نے ۱۸۷۶ء میں اس ملازمت سے فراغت حاصل کی اور حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے شرفیاب ہوئے۔ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے شرفیاب ہونے کے بعد انھوں نے سری نگر میں اقامت اختیار کرلی۔ ان دنوں یہاں ہیضہ زوروں پر تھا۔ سینکڑوں افراد اس میں مبتلا ہوکر ہلاک ہورہے تھے۔ محمد مردان علی خاں رعنا نے بھی ۲ جنوری ۱۸۷۹ء کو اسی وبا میں انتقال کیا اور یہیں دفن ہوئے۔

محمد مردان علی خاں رعنا ابتدا میں مضطر' پھر رعنا اور آخر میں نظام تخلص کرنے لگے تھے۔ اس کی تصدیق ان ہی کی اس رباعی سے ہوتی ہے۔

آغاز سخن وری میں مضطر تھا نام

رعنا تھا شباب شاعری کے ہنگام

ہے زیر نگیں جو کشور نظم تو اب

نواب خطاب اور تخلص ہے نظام

مردان علی خاں رعنا کی تصانیف نظم و نثر کی فہرست بڑی طویل ہے۔ انھوں نے علم جفر میں جفر جامع اور جفر کبیر' تاریخ میں ظل ناصری' تاریخ البلاد' تواریخ مارڑ' مسمریزم کے موضوع پر سیر غایت اور طلسم نظر لکھی۔ اس کے علاوہ علم موسیقی پر نغمۂ صنم اور غنچۂ راگ لکھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو فن موسیقی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔

اور وہ اس سلسلہ میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے - ان کا کلیات بھی کلیات نظام کے نام سے شائع ہو چکا ہے -

عبدالغفور نساخ نے ان کو کلکتہ میں دیکھا تھا - ان کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کچھ دنوں کے لئے کلکتہ بھی گئے تھے - ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :

گزرا ہے مرا نالۂ دل چرخ کہن سے
تھا روح کا ہمدم نہ بچھڑا جا کے وطن سے

جلوہ ہر رنگ میں دیکھا ترا گلزار پیدا
ہر گل باغ جہاں سے ہے تری بو پیدا

میں دل سے بے نیاز ہوں دل مجھ سے بے نیاز
دل میرا آشنا ہے نہ میں آشنائے دل

غم سوا عشق کا مآل نہیں
کون دل ہے جو پائمال نہیں،

کھو خیال میں کس کے اداس ہو رہتا
کسی سے تم جو نہیں آج گفتگو کرتے

کھو چکے پہلے ہی ناموس کو اور نام کو ہم
پہنچے آغاز محبت ہی پہ انجام کو ہم

غالب اور مردان علی خاں رعنا میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی، صرف خط و کتابت کے ذریعہ تعلق پیدا ہو گیا تھا - جب انھوں نے پہلی مرتبہ غالب کو اپنی غزل اصلاح کے لئے بھیجی تو اپنا پتہ لکھنا بھول گئے - غالب نے غزل دیکھی، پتہ درج نہیں تھا، خاموش ہو گئے - انھوں نے دوبارہ خط لکھا - اس پر پتہ بھی موجود تھا، جس پر غالب نے لکھا صاحب تم نے اب اپنے مسکن کا پتہ لکھا ہے - میں نے دوسرے ہی دن

جواب روانہ کردیا۔

(مقدمہ کلیات نظام علم و عمل دوم صلا۹

خطوط غالب صد۵۹۱)

حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی

مولوی قمرالدین قصبہ سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے جن کا تعلق خاندان بنی اسرائیل سے تھا۔ ان کی شادی میرٹھ میں مولوی نصراللہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ سکندر آباد کی سکونت ترک کر کے میرٹھ چلے گئے اور وہیں ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا۔

حکیم فصیح الدین رنج مولوی قمرالدین کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے میرٹھ میں اپنے عم بزرگوار سے تحصیل علوم و تکمیل فنون کی اور نظم و نثر، بیت و ہرہ صرف و نحو، حکمت و منطق، تکسیر و دنیات پر عبور حاصل کر لیا، طب میں حکیم سعادت علی خاں سے استفادہ کیا۔ پھر تلاش معاش کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں سرگرداں رہے۔ ان کی تصانیف سے ان کا علیگڈھ اور پنجاب جانا ثابت ہے۔

دسمبر ۱۹۶۵ء میں نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کا جشن مسند نشینی منایا گیا تو حکیم فصیح الدین رنج نے بھی در تہنیت جشن مسند نشینی نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کے عنوان سے ایک طویل قصیدہ لکھا۔ ان کا دربار رام پور سے تعلق نہیں تھا، اس لئے انھوں نے یہ قصیدہ غالب کو بھیج دیا تا کہ وہ اسے رام پور بھجوا دیں۔ غالب نے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی اور خواجہ الطاف حسین حالی کے قصیدوں کے ساتھ نواب کلب علی خاں کے میر منشی سیل چند کو بھیج دیا۔ اس قصیدہ کے اختتام پر شاعر کا نام و نشان یوں لکھا ہوا تھا۔

"مدح طراز عقیدت آگیں، خاک راہِ آلِ محمد فصیح الدین
بنی اسرائیل متخلص بہ رنج متوطن شہر میرٹھ۔"

اس قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں:-

آج کل چلتی ہے عالم میں خوشی کی وہ ہوا
آشیاں میں ناچتا ہے طائرِ قبلہ نما

دھوم ہے شادی کی اک غل ہے مبارکباد کا
زیرِ گردوں جا بجا بالائے گردوں جا بجا

مے پہ جوبن ہے عروسانہ لباس سُرخ سے
شورِ قلقل ہے لبِ مینا سے مے پر قہقہا

لوٹی جاتی ہے ہنسی کے مارے بجلی چرخ پر
ہے بلند آہنگ کوسِ شادمانی رعد کا!

پھولی پھرتی ہے شفق پہنے ہوئے رنگیں لباس
شادمانی سے جدا گردوں پھرے ہے ناچتا

کیا بیاں کیجئے تری دریا دلی بحرِ کرم
موتیوں سے دامنِ امید تو نے بھر دیا

ہے خوشی ذرّہ سے تا خورشید تیرے جشن کی
ہے نشاط اندوز عالم میں ہر اک چھوٹا بڑا

جاہ و منصب، عمر و دولت، روز افزوں ہو نصیب
جشنِ جمشیدی سے ہر دن جشن ہو تیرا سوا

تجھ سے گر چاہوں نہ دادِ شعر تو اے قدرداں
قدرداں تیرے سوا اب کون باقی رہ گیا؟

رنج کے ہاتھوں سے دل کا رنج کے یہ حال ہے
جس طرح ہو دانۂ انگور مرجھایا ہوا
جشن شاہانہ مبارک تجھ کو با اقبال عمر
عمر بھی وہ ہو کہ جس کی کچھ نہ ہووے انتہا

چند سال کی غربت اور مفلسی کے بعد ان کے کچھ آسودگی کی صورت پیدا ہوئی ایک اندازہ کے مطابق بیس بائیس سال انتہائی آرام و فراغت کے ساتھ بسر کئے آخر عمر میں استسقا کا مرض لاحق ہوگیا، جس میں آٹھ مہینے تک مبتلا رہنے کے بعد ۳۱ مارچ ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۰ھ کو انتقال کیا جس کی تاریخ ان کے دوست جارج پیش شورؔ نے لکھی۔

خوشی شورؔ کی لے گئی اپنے ساتھ
نصیب اس کو ہے اب غمِ رنجؔ آہ

حکیم فصیح الدین رنجؔ کی تصانیف میں نعت کا مجموعہ "مخزن الفصاحت" شاعرات کا تذکرہ "بہارستان ناز" اور ایک کلیات قابل ذکر ہے، ان کے کلام کا بڑا حصہ غالبؔ کے رنگ میں ہے۔

وائے قسمت وہ بھی ان کے عاشقوں میں ہوگیا
جو مری قسمت سے میرا نامہ بر پیدا ہوا

بالائے بام آئے وہ عہدِ شباب میں
لو اور احتراق ہوا آفتاب میں
لاکھوں بناؤ ایک تغافل میں آپ کے
لاکھوں بگاڑ ایک مرے اضطراب میں

کس کو اٹھاؤں اور نہ کس کو اٹھاؤں میں
پردے ہزار ہا ہیں تمہارے حجاب میں

اک بار اور میری عیادت کو آئیے
اچھی طرح سے میں ابھی اچھا ہوا نہیں
میں خوب جانتا ہوں لگاوٹ کو آپ کی
آنکھیں تو مل رہی ہیں مگر دل ملا نہیں

دل سے جائے گا نہ اس جنبش ابرو کا خیال
کیا کہیں گوشت بھی ناخن سے جدا ہوتا ہے

تمہیں نے حال سے بے حال کر دیا ہم کو
تمہیں نہ حال ہمارا سنو تو کیونکر ہو

بارش گریہ ہے یاں عزم خطا سے پہلے
مینھ برستا ہے مرے گھر میں گھٹا سے پہلے

بہارستان ناز ص۹۰ تا ص۹۱ — خمخانہ جاوید سوم ص۵۰۰
مکاتیب غالب حواشی ص۳۰۰ — سخن شعرا ص۱۹۲
کلیات رنج ص۱۲۶، ص۱۰۱

جانی بانکے رائے رند

جانی بانکے رائے رند کے حالات نہیں ملتے ہیں۔ وہ غالب کے شاگرد بھی

تھے اور محسن بھی، غالب کے خطوط سے ان کے متعلق جتنی کچھ اطلاعات بہم ہوئی ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھرت پور میں سرکاری وکیل تھے۔ انہوں نے ہرگوپال تفتہ کو وہاں ملازمت دلائی تھی۔

جن دنوں غالب تاریخ تیموریہ کا پہلا حصہ نیم روز لکھ رہے تھے۔ ایک انگریز جارج جوزف کے یہاں ان کی جانی بانکے رائے رند سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس سرسری ملاقات نے ان کو جانی بانکے رائے رند سے پوری طرح واقف ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جانی بانکے رائے رند منشی نبی بخش حقیر کے بھی دوست تھے جب ان کو اس بات کا علم ہوا کہ منشی نبی بخش حقیر کے پاس غالب کی نثر ہے تو انہوں نے ان سے منگوالی اور پھر غالباً ان ہی کی وساطت سے اپنے کچھ شعر غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجے غالب ان کی غزلوں پر اصلاح دینے کے علاوہ ان کو اپنی نثر کا خواہشمند پاکر ان کے لئے بھی مہر نیم روز کے مسودے کی ایک نقل تیار کرانے لگے۔

غالب اور جانی بانکے رائے رند میں حد درجہ موانست تھی۔ ان ہی کی خواہش اور اصرار پر غالب نے اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ بہت تکلف سے لکھوایا اور ان کے ذریعہ مہاراجہ جے پور کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ مہاراجہ جے پور نے اس سلسلہ میں جتنے کچھ انعامات دیتے، وہ سب جانی بانکے رائے رند نے غالب کو بھجوا تے، اس طرح اس دور میں غالب کو مالی امداد بہم پہنچائی جبکہ وہ شدید مالی پریشانیوں سے دوچار تھے۔ ۱۲۷۱ھ میں جانی بانکے رائے رند کو پے در پے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ غالب نے ایک خط میں لکھا۔

"زمانہ ان دنوں میں (جانی بانکے رائے رند) ان سے بر سر امتحان ہے۔ پروردگار ان کو سلامت رکھے اور اجر و شکیب عطا کرے۔ علاوہ مساعدت روزگار کی وہ صورت، شدائد رنج سفر کی وہ حالت، ناسازی مزاج کا وہ رنگ، ان

سب باتوں سے علاوہ یہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ جوان داماد مرجائے اور بیٹی بیوہ ہوجائے۔ مرگ و زیست کا سرشتہ خدا کے ہاتھ ہے۔ آدمی کیا کرے۔ دل پہ میرے جو گزری میرا دل جانتا ہے۔

جانی بانکے رائے ان صدموں کی ایک سال سے زائد تاب نہیں لا سکے۔ اور ۱۲۷۲ھ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ تفتہ کے دیوان دوم ۱۸۷۵ء کوہ نور پریس لاہور میں بانی بانکے رائے رند کی موت پر ایک طویل اور دردناک مرثیہ موجود ہے۔ اس سے عمر اسے کا پتہ چلتا ہے۔ اس مرثیہ میں تفتہ نے ان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندو ہونے کے باوجود اسلام کے دلدادہ تھے اس مرثیہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی ــــ! نہیں معلوم مالک رام نے ان کو لاولد کیونکر لکھ دیا ہے۔ جبکہ غالب نے ایک خط میں ان کی بیٹی کے بیوہ ہوجانے کی اطلاع دی ہے۔ جانی بانکے رائے رند کا کلام نہیں ملتا ہے۔

۱ نادرات غالب ص۱۰۱ ص۳ ص۴ تا ص۵

خطوط غالب اول ص۱۰۶، غالب ص۱۳۶ ص۱۳۷

حاشیہ نادرات غالب ص۱۰۱، ص۱۰۲، ص۱۰۳

مرزا علی بخش رنجور

مرزا علی بخش رنجور مرزا الٰہی بخش کے صاحبزادہ تھے۔ ان کی غالب سے دوہری رشتہ داری تھی۔ ایک طرف وہ انکی بیوی امراؤ بیگم کے بھائی اور دوسری طرف ان کی بھانجی امانی خانم کے شوہر تھے۔ غالب نے ان کو اپنے سے چار سال چھوٹا بتایا ہے۔ اس اعتبار سے ان کا سال ولادت ۱۲۱۶ھ ہونا چاہیے۔

۱۸۲۵ء میں انگریزوں نے بھرت پور پر چڑھائی کی تو احمد بخش خاں بھی اپنا دستہ

نے کران کی مدد کے لئے بھرت پور پہنچے۔ علی بخش رنجور بھی ان کے ہمرکاب تھے۔ اس موقع پر علی بخش رنجور نے غالب سے درخواست کی کہ اگر وہ تمام کلمات جمع کر دیں جو رسمی خطوں میں مرقصاب و آداب، شکر و شکوہ اور شادی و غم کے اظہار کے لئے مستعمل ہوتے ہیں تو اس سے میری رہنمائی ہوگی۔ ان کی درخواست پر غالب نے آہنگ اول و دوم مرتب کیا۔

۱۸۲۶ء میں الٰہی بخش کا انتقال ہوگیا تو علی بخش رنجور کی تمام تر دیکھ بھال احمد بخش خاں نے کی۔ اس اثنا میں علی بخش رنجور فیروز پور سے دہلی اور دہلی سے فیروز پور آتے جاتے رہے۔ احمد بخش خاں نے ان کے لئے اپنی ریاست سے ایک سو ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ وہ اس وظیفہ سے ایک سال بھی متمتع نہ کر پاتے تھے کہ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں احمد بخش خاں انتقال کر گئے تو ان کے جانشین شمس الدین خاں نے یہ وظیفہ بند کر دیا جس پر علی بخش رنجور دہلی سے نکل کر لکھنؤ اور پھر جے پور چلے گئے۔ بعد ازاں حیدر آباد کی راہ لی۔

۱۲۵۱ھ میں شمس الدین خاں، ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں ماخوذ ہوتے اور ان کو پھانسی کی سزا دی گئی تو علی بخش رنجور نے جے پور سے دہلی کا قصد کیا اور غالب کے یہاں اقامت اختیار کی۔ اسی دوران انگریزوں نے شمس الدین خاں کی ریاست کو ضبط کر لیا اور علی بخش رنجور کو سو روپے کی بجائے پچاس روپے ماہانہ بطور وظیفہ دینے لگے۔

جس وقت غدر کا ہنگامہ برپا ہوا، علی بخش رنجور دہلی میں مقیم تھے۔ غالباً اس وقت ان کا قیام جے پور میں تھا۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک عرصہ تک بیمار رہنے کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۸۶۳ء کو رات کے بارہ بجے کے قریب انتقال کیا۔

(دیباچہ پنج آہنگ ، دیباچہ دیوان معروف)
ذکر غالب ص۲۵ ، ص۳۴ ، ص۱۵۷

سید محمد ذکریا خاں ذکی

سید محمد ذکریا خاں ذکی نواب سید محمود خاں رضوی کے صاحبزادے اور اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور کے نواسے تھے۔ جن کے بزرگوں کو شاہ عالم ثانی کے وزیر مختار الملک مجد الدولہ نواب سید عبد الاحد خاں سے قرابت تھی۔ سر راس مسعود نے ذکی کا سال ولادت ۱۸۳۹ء مطابق ۱۲۵۵ھ بتایا ہے۔ انہوں نے ایک علم دوست اور ادب پرور خاندان میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لئے ان کو مختلف علوم کی تحصیل کے لئے اپنے دور کے ممتاز اور نامور اساتذہ کے سپرد کیا گیا۔ ذکی نے منطق مولوی حلیم سے، عربی مولوی سبحان بخش سے، فارسی پنڈت رام کشن بسمل کشمیری اور امام بخش صہبائی سے پڑھی۔ بعد ازاں سادھو بابا بشمبر ناتھ سے نجوم اور امیر پنجہ کش سے خوش نویسی کی مشق کی۔

۱۳۱۲ھ میں مطبع رضوی دہلی سے ذکی کا دیوان شائع ہوا تھا۔ اس کے آخر میں انہوں نے اپنے تفصیلی حالات درج کئے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جہاں اور مسلمانوں پر افتاد آئی وہاں ذکی اور ان کے خاندان کو بھی تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اسی تباہی و بربادی کے عالم میں الہ آباد پہنچے اور وہاں سے وکالت کا امتحان پاس کیا اور ملازم ہو گئے۔

دہلی میں جب امن کی صورت پیدا ہوئی اور وہاں کے رہنے والے دوبارہ آباد ہونے لگے، ذکی نے بھی دہلی کا قصد کیا۔ انہوں نے اپنے بیان کے مطابق دس بارہ سال کی عمر سے غالب کے جلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا شروع کیا تھا۔ غالب

ہیں اور ان کے بزرگوں میں دیرینہ مراسم تھے۔ اس بنا پر انہوں نے غالب کی خدمت میں پہنچ کر باقاعدہ طور پر ان کی شاگردی اختیار کر لی اور اپنا کلام ان کو دکھانے لگے راس مسعود کے بیان کے مطابق وہ گورکھپور، بریلی اور بدایوں میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور ۱۳۲۱ھ میں فوت ہوئے۔ نظام الدین اولیا دہلی کے والد ماجد سیّد احمد کے احاطہ درگاہ میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

غالب سید محمد زکریا خاں زکی کو اپنا عزیز شاگرد خیال کرتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے زکی کو اپنی مہر و دستخط سے ۱۲۸۰ھ میں سندِ شاگردی لکھ کر دی تھی جو اُن کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔ سندِ شاگردی کے الفاظ یہ ہیں :-

"سبحان اللہ سرٹیفکیٹ کے لکھنے کا کس وقت اتفاق ہوا ہے کہ میں نیم جان چند روز کا مہمان ہوں۔ مہینہ بھر سے غذا بالکل موقوف، صرف گوشت کے پانی پر مدار رہے۔ اگر اُٹھوں تو دورانِ سر سے گر پڑوں سید محمد زکریا خاں نسب میں سیّد امیر زادہ عالی دودمان ان کے بزرگ وزارت کا منصب پا چکے ہیں۔ جاگیر اب تک تھی۔ پھر بعوض جاگیر پنشن مقرر ہوا۔ معہذا یہ شخص بذاتِ خود نیک اور صاحب علم اور متواضع اور دانشمند اور نیک طینت اور رنگیں طبع معنی ہے۔ طبیعت کو علاقہ اچھا ہے۔ شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں اور اس فن میں میرے شاگرد رشید ہیں"

زکی بہت پختہ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے کلام میں غالب کی بعض شعری خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالب کے رنگ کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ ان کے دیوان سے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

تمکین وضع و طرزِ تکلم میں دیکھیے　　　انداز ان کی شوخیٔ طبع سلیم کا

ہم بگولے کی طرح جوشِ جنوں کے ہیں اسیر — دوش پر اپنے لیے پھرتے ہیں زنداں اپنا
کیوں عشق میں نا عاقبت اندیش ہیں ہم — چاہیے سوچ لے انجام بھی انساں اپنا

فصلِ خزاں میں دل جو رہا ہو گیا تو کیا — آنے دو پھر بہار، گرفتار دیکھنا
مانعِ ادب ہے ورنہ ابھی کھینچ لوں نقاب — مشکل نہیں ہے کچھ تجھے دلدار دیکھنا

نقشِ پا بن کے بھی رہیئے تو مٹا دیتا ہے — اس کے کوچہ میں نہیں اپنی گذر کی صورت
عشق میں جان کوئی چیز نہیں ہے ناصح — اور کیا اس کے سوا ہو گی ضرر کی صورت

بارہا مر کے ہم جیئے شبِ ہجر — ہو گیا عمر کا حساب غلط
عشق میں مرنے کا زمانہ ہے — حاصلِ زندگی شباب غلط
پھر گئے وہ وفا پرستوں سے — ہو گئی کیا رہِ صواب غلط

یہ شرمگیں نگہ یہ تبسم نقاب میں — کیا بے حجابیاں ہیں تمہارے حجاب میں
اس کی طلب میں ہر نفس آغازِ شوق ہے — رکھتا ہے کون عمرِ گذشتہ حساب میں
بدقسمتی نے اس سے کیا مجھ کو ہم کلام — دشمن کا حال کہنے لگا اضطراب میں

عبث آغوش میں ہونے کا گماں ہوتا ہے — دل خود رفتہ خدا جانے کہاں ہوتا ہے
چپ رہیں مگر اس کا تو نہیں کچھ بھی علاج — حالِ دل صورتِ محزوں سے عیاں ہوتا ہے

صبا نکہتِ زلف کیا لے گئی — بلا ہو گئی دل اڑا لے گئی

حرم کو گیا میں کبھی دیر کو — تری جستجو جا بجا لے گئی
وہ جلوے قیامت اٹھاتے رہے — مجھے میری حیرت سنبھالے گئی
جہاں بن گئی تھی ابھی جان پر — اسی کوچہ میں پھر وفا لے گئی

خم خانۂ جاوید ۳ ص ۱۲۹ تا ص ۱۳۰ ، انتخاب زریں
ص ۱۳۸ ، ص ۱۵۱ ، دیباچہ دیوان زکی ص

سیّد زین العابدین خاں (عرف کلن میاں)

صاحبزادہ سیّد زین العابدین خاں عرف کلن میاں، سیّد اصغر علی خاں کے بیٹے اور سیّد عبداللہ خاں کے پوتے تھے۔ اس طرح ان کو رام پور کے حکمران خانداں سے بھی تعلق قریبہ تھا۔ اعجاز علی عرشی نے ان کا سالِ ولادت ۱۲۴۸ھ بتایا ہے۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ خیال ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی۔ بعد میں وہ اپنے دادا سیّد عبداللہ خاں کی صدر الصدوری میرٹھ کے زمانے میں دہلی سے میرٹھ چلے آئے اور نواب یوسف علی خاں ناظم کے عہدِ حکومت میں رام پور کا قصد کیا۔

سیّد زین العابدین خاں کے بڑے بھائی سیّد رضا خاں سے نواب یوسف علی خاں ناظم کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ سیّد رضا خاں کا انتقال ہو گیا۔ تو سیّد زین العابدین نے نواب یوسف علی خاں ناظم کی اجازت کے بغیر ۱۲۷۰ھ میں ان سے شادی کر لی۔ یہ بات عوام میں چہ میگوئیوں کا سبب بنی اور عوام میں خاندانِ شاہی سے متعلق متعدد شکوک پیدا ہو گئے۔ سیّد زین العابدین خاں پر عتابِ شاہی نازل ہوا اور وہ ترکِ وطن کر کے جے پور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

زین العابدین خاں کے دادا سیّد عبداللہ خاں کی غالب سے دوستی تھی۔ اس

لئے انہوں نے بھی اصلاح شعر کے سلسلہ میں غالب سے رجوع ہونا مناسب جانا اور اپنی متعدد غزلیں اصلاح کے لئے ان کے پاس ارسال کیں۔ غالب کو یہ بات یقینی طور پر معلوم تھی کہ نواب یوسف علی خاں ناظم ان سے ناراض ہیں۔ اس لئے انہوں نے ان کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کر دیا اور ایک خط کے جواب میں ۱۴ مارچ ۱۸۶۰ء کو لکھ بھیجا۔

"میں خاص خدمت اصلاح اشعار پر جناب نواب صاحب قبلہ کے مامور ہوں اور آپ حضور کے عزیزوں اور فرزندوں میں ہیں، پس میں بے حکم حضور کے آپ کی خدمت بجا نہیں لا سکتا ناچار کاغذ اشعار مسترد بھیجتا ہوں۔"

زین العابدین خاں نے غالب کے اس انکار کے بعد کس سے اصلاح لی وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ انہوں نے ۱۸۹۲ء میں بمقام جے پور انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ امیر مینائی نے اپنے تذکرہ میں ان کے یہ شعر درج کئے ہیں۔

تھا جو اڑنا ہی ہوش کو میرے
بو گئے گیسوئے عنبریں ہوتا
تھا جو کھلنا نہ عقدۂ دل کو!
کاوش ابرو کی تیرے چیں ہوتا

انتخاب یادگار ۲۱۲، خم خانۂ جاوید
نغمہ ج ۴ صفحہ ۲۹۱، مکاتیب غالب صفحہ ۸۶، ۸۷۔

سبحان علی خاں کنبوہ

سبحان علی خاں کے نام غالب کے فارسی میں تین خط ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے سبحان علی خاں کے ذریعہ دربار اودھ میں توسل اختیار کرنے کی

گزشش کی تھی اور نصیر الدین حیدر کی مدح میں ایک قصیدہ گزرانا تھا

سبحان علی خاں کا ذکر تاریخ اودھ میں بار بار آیا ہے لیکن اس سے ان کی کوئی خاص شخصیت نمایاں نہیں ہوتی ہے۔ وہ قوم کے کنبوہ تھے۔ نظم اور نثر دونوں میں کوئی ان کا مثل نہیں تھا۔ لیکن ان کی خوش تدبیری اور مصلحت اندیشی نے ان کو غازی الدین حیدر کے دربار تک پہنچا کر ان کی دوسری صلاحیتیں پس منظر میں ڈال دیں۔ معتمد الدولہ آغا میر نے اودھ کی نیابت کا خلعت پایا تو رفتہ رفتہ سبحان علی خاں کی بھی توقیر بڑھی، وہ ایکطرف غازی الدین حیدر کو اپنی ہم صفت موصوف شخصیت سے مسحور کئے تھے، دوسرے انکو معتمد الدولہ آغا میر کے مزاج میں بھی زیادہ دخل ہو گیا۔ معتمد الدولہ آغا میر کی وزارت کا زمانہ طویل ہوا تو اس میں سبحان علی خاں کی کوششیں زیادہ کارفرما رہیں۔ وہ نہ صرف معتمد الدولہ آغا میر کو مناسب اور صائب مشورے دیتے بلکہ خزانے میں آمدنی کے طریقے بھی بتاتے تھے۔

غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا اور ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو نصیر الدین حیدر نے ان کی مسند سنبھالی۔ نصیر الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں سبحان علی خاں کے اعزاز میں مزید اضافہ ہوا، ان کو وزارت کی نیابت عطا کی گئی، اس کے علاوہ صدر کلکتہ اور گورنر جنرل سے مراسلات کرنے کے بھی اختیارات ان کو نیک قلم دے دئے گئے۔ ساتھ ہی دار الانشار کی افسری اور پچاس ہزار روپیہ نقد بھی انعام کیا گیا۔

۱۲۴۳ھ میں معتمد الدولہ آغا میر کی سیاسی زندگی پر زوال آیا تو سبحان علی خاں بھی احتساب و مواخذہ سے نہ بچ سکے۔ نصیر الدین حیدر کے حکم پر ان کے مکان پر پہرہ بٹھا دیا گیا اور صبح و شام ان کی نگرانی کی جانے لگی۔ اس دوران ان کا مال و متاع سب کچھ لوٹ لیا گیا۔ یہ دور ان کے لئے بڑی آزمائش و ابتلا کا تھا۔ اس آزمائش و ابتلا میں وہ پورے اترے اور ان پر کسی بھی قسم کا الزام ثابت نہیں ہو سکا، جس پر نصیر الدین

حیدر کو اپنے کیے پر ندامت ہوئی اور اس نے ان کو یک قلم شریک مشورہ کر لیا۔ لیکن وہ بڑی حد تک سیاست سے دستکش ہو کر مذہبی امور میں دلچسپی لینے لگے۔

معتمد الدولہ کی معزولی کے کئی سال بعد روشن الدولہ کو اقتدار ملا اور وزارت کی خلعت عطا ہوئی تو سبحان علی خاں پھر ایک بار سیاست کی وادیٔ زخار میں داخل ہوئے اس بار ان کے بیٹوں کو بھی بڑی ترقی ہوئی اور یہی امور حکومت میں دخیل ہو گئے۔ روشن الدولہ بذات خود ملکی امور حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ سبحان علی خاں کو اپنے مشوروں میں شامل کر لیا۔ سبحان علی خاں حکومت کی خیر خواہی کا انجام دیکھ چکے تھے۔ اس لیے کسی اور ابتلا سے گزرنا نہیں چاہتے تھے ان کو یقین تھا کہ روشن الدولہ کی نااہلی ان کو ہی نہیں تباہ کرے گی بلکہ دوسرے بھی ناکردہ گناہ عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ انھوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ روشن الدولہ سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس غرض سے انھوں نے روشن الدولہ سے کربلائے معلیٰ رخصت ہونے کی درخواست کی، لیکن روشن الدولہ نے اسے منظور نہیں کیا۔

۲ ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ کو نصیر الدین حیدر کو بعض روایتوں کے مطابق زہر کھلایا اور ان پر سکرات کی کیفیت طاری ہوئی تو سبحان علی خاں ان کے سرہانے ہی موجود تھے۔

(کلیات نثر غالب ص۱۱۱ ، تاریخ اودھ حصہ چہارم)

نواب سجاد مرزا دہلوی

نواب سجاد مرزا دہلوی، نواب معین الدولہ، صفدر الملک، ذوالفقار الدین حیدر بہادر، ذوالفقار جنگ ناظر حسین مرزا کے صاحب زادے اور مبارز الدولہ مبارز الملک حسام الدین حیدر خاں نامی کے پوتے تھے جن کا سلسلۂ نسب

سلطنت اودھ کے بانی برُہان الملک میر محمد امین نیشاپوری سے امام موسیٰ رضا علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ناظر حسین مرزا کی غالب سے دوستی تھی جس کے پیش نظر غالب نواب سجاد مرزا کو چاہتے اور ان سے شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب سجاد مرزا نے غالب کو اپنی خیریت کا خط لکھا اس سے غالب کو بڑی خوشی ہوئی۔ انہوں نے نواب سجاد مرزا کو "خوبیٔ دین و دنیا کی ارزانی" کی دعا دیتے ہوئے لکھا۔

"تمہارے خط کے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہوگئیں، دل کو چین آگیا چشم بد دور، خط اچھا، عبارت اچھی، اردو میں مطلب نویس اچھے ہو۔ حق تعالیٰ تم کو عمر و دولت عطا کرے۔"

۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں والیٔ رام پور کا جشن مسند نشینی منایا گیا۔ اور غالب بھی اس میں شریک ہوئے۔ اس وقت باقر علی خاں کامل اور حسین علی خاں شاداں بھی ان کے ساتھ تھے۔ باقر علی خاں کو تحصیل داری کی آرزو تھی۔ غالب بھی یہی چاہتے تھے کہ باقر علی خاں تحصیل دار ہوجائیں لیکن اس خواہش کا پورا ہونا ممکن نہیں تھا۔ غالب نے نواب سجاد مرزا کو اس صورت حال کی اطلاع اس طرح دی۔

"تمہارے یار باقر مرزا تحصیلداری تحصیلداری پکارتے تھے۔ یہاں معلوم ہوا کہ قلمرو میں چھ تحصیل داریاں اور چھ تھانہ داریاں ہیں ساتواں علاقہ کہاں سے پیدا کیا جائے۔ رہی مصاحبت، اس کو پہلے تسنن اور پھر علوم اسمیہ سے آگہی، پھر زبان آوری پھر قسمت کی یاوری، شرط ہے۔ باقر علی خاں کو تین شرطیں درکار، پہلی شرط موجود، تم کو پہلی شرط انسلاداً ابداً مفقود۔"

نواب سجاد مرزا غالب کے بعد مرزا قربان علی بیگ سالک کو اپنا کلام دکھانے

گئے۔ غزلوں کے علاوہ مراثی کا بھی شوق تھا۔ ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۳ھ میں جب کہ ان کا زمانہ شباب تھا، گھوڑے سے اچانک گر کر انتقال کیا۔

نواب سجاد مرزا کا کلام نہیں ملتا ہے۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں۔

انگلیاں شہر میں اٹھتی ہیں، جدھر جاتا ہوں
اور ابھی دور ہے عالم مری رسوائی کا

آپ کے پند و نصائح ہیں بجا سب واعظ
عقل اس دور میں اک نام ہے بن آئی کا

غیر کا کوچہ ہے اور گرد ہے لڑکوں کے ہجوم
ہے محبت میں یہ سامان ترے سودائی کا

یہ جو دیوانہ سا پھرتا ہے وہی ہے سجاد
شہر میں شور تھا جس شخص کی دانائی کا

خطوط غالب اول صفحہ ۱۳۲، خم خانۂ جاوید چہارم صفحہ ۲، ۱۸۲، ۱۰۳۱، ۱۳۱۱
واقعات دار الحکومت دہلی سوم صفحہ ۹۶، ۲۰۱

شیخ امیر اللہ سرور

شیخ امیر اللہ سرور، شیخ عبد اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کا اصل مولد اکبر آباد تھا۔ جن دنوں کونسل کے اجلاس میں غالب کا مقدمہ پیش تھا اور فیصلہ ہونے میں نہیں آتا تھا، شیخ امیر اللہ نے ان سے اصلاح کلام کی درخواست کی جس سے غالب نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے لکھا:

"آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے نتائج فکر دیکھ کر اپنی گزارشات آپکی

خدمت میں پیش کروں، آجکل اس کی فرصت کہاں اور دماغ کس کو ...... اس لئے چند دنوں کے لئے مجھے معاف رکھئے"

مالک رام نے شیخ امیر اللہ سرور کو تلامذۂ غالب میں شامل کیا ہے۔ یہ بات کسی ثبوت کے بغیر درست نہیں کہی جاسکتی۔ شیخ امیر اللہ سرور نے غالب سے ناامید ہونے کے بعد شیخ رحمت اللہ مجرم اکبرآبادی کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا جو میر مہدی بیدار کے واسطے سے مولانا فخرالدین دہلوی کے سلسلہ میں مرید ہو کر دہلی میں فقیرانہ زیست بسر کرتے تھے۔ ان کی کشش شیخ امیر اللہ سرور کو بھی دہلی کھینچ لائی اور انھوں نے ۱۲۴۳ھ میں دہلی کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔

(کلیات نثر فارسی ص ۱۲۵، تلامذۂ غالب ص ۱۵۲، سخن شعرا ص ۲۱۴)

چودھری عبدالغفور سرور

چودھری عبدالغفور سرور، ضلع ایٹہ کے قصبہ مارہرہ کے رئیسوں میں سے تھے۔ ان کے خاندان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ شہاب الدین غوری کے عہد حکومت میں اس علاقہ میں آکر مستقل طور پر آباد ہوگیا تھا۔ مرزا عسکری کے بیان کے مطابق سرور کے آبا و اجداد نے حضرت صاحب عالم کے بزرگوں کو مارہرہ بلا کر مجبور کیا تھا کہ وہ یہیں آکر آباد ہو جائیں۔

چودھری عبدالغفور سرور حضرت صاحب عالم کے خاص ملنے والوں اور حاضر باش مریدوں میں سے ایک تھے۔ حضرت صاحب عالم کی وساطت ہی سے ان کے اور غالب کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اسی خط و کتابت کے دوران غالب نے ان کو شاعری کے علایم و رموز سمجھائے اور تربیت خیال کی۔ غالب،

ان کو حد درجہ عزیز رکھتے تھے۔ ان کی غزلوں کی اصلاح میں ذرا بھی دیر ہوجاتی تو کسرِ نفسی کے طور پر شرمندگی کا اظہار کرتے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہوتے ہی چودھری عبدالغفور نے غالب سے ملنے کے لئے دہلی جانے کا ارادہ کیا، لیکن ان کے چچا نے ان کو گرمی کا بہانہ کرکے روک دیا۔ غالب کو ان کے ارادے کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے شہر کی تباہی اور بربادی پر نظر کرتے اور حاکموں کے ناروا طرزِ سلوک کو دیکھتے ہوئے انھیں لکھ بھیجا کہ آپ کے چچا نے کرامت کی جو آپ کو منع کردیا۔

چودھری عبدالغفور سرور پہلے شخص ہیں جن کو غالب کے خطوط کی ترتیب کا خیال آیا۔ انھوں نے منشی ممتاز علی رئیس میرٹھ کی فرمائش پر "مہرِ غالب" کے نام سے ان کے خطوط کا ایک مجموعہ مرتب کرلیا تھا۔ "مہرِ غالب" سے ۱۲۷۸ھ کے اعداد نکلتے ہیں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ اس کی تکمیل اس وقت تک ہوچکی تھی لیکن بعد میں غلام غوث خاں بے خبر نے اسی مجموعہ کو اپنے فراہم کردہ خطوط کے اضافہ کے ساتھ عودِ ہندی کے نام سے اکتوبر ۱۸۶۸ء میں شائع کروایا۔

عبدالغفور سرور کا کلام نہیں ملتا البتہ ان کے چند قطعات بطور یادگار رہ گئے ہیں ذیل کا قطعہ انھوں نے سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے یہاں بیٹا پیدا ہونے کی تقریب پر لکھا تھا:

مرے فرزند احمد کا وہ فرزند — دعا گو جس کا ہر فرد و بشر ہے
الٰہی اس کو تو رکھیو سلامت — کہ نخلِ زندگانی کا ثمر ہے
نوید فرحت سید و مولود — سرورِ سینہ و نورِ نظر ہے
سرورِ خوش دل شاداں نے تاریخ — لکھی فی الفور، یہ لختِ جگر ہے

۱۲۸۳ھ

(عودِ ہندی دیباچہ، آجکل فروری ۱۹۵۵ء
ادبی خطوطِ غالب ص ۲۴۹)

سراج الدین احمد

مولوی سراج الدین احمد موہان (لکھنؤ) کے باشندہ تھے کاروبار کے سلسلے میں انھوں نے کلکتہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ جن دنوں غالب اپنی پنشن کے مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں کلکتہ پہنچے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد کا قیام وہیں تھا۔

مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر غالب نے اپنے اردو فارسی کلام کا ایک مختصر سا انتخاب کیا اور اس کا نام گل رعنا رکھا۔ مولوی سراج الدین احمد کو کلکتہ کے ہفتہ وار اخبار آئینہ سکندری سے تعلق تھا یا نہیں، وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ البتہ یہ تعلیق امر ہے کہ وہ حکام میں اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ چنانچہ ان ہی کی کوششوں سے آئینہ سکندری میں غالب کا کلام چھپتا رہا۔ غالب اس ہفتہ وار کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ اسکے متعلق انھوں نے اپنے ایک خط میں اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے اور اس کے خریدار بنانے کی بھی سعی کی ہے۔

مولوی سراج الدین احمد ۱۸۵۹ء میں لکھنؤ چلے آئے تھے اور احاطہ خانساماں کے متصل تکیۂ شیر علی شاہ کے قریب مولوی عبدالکریم کے مکان میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ غالب نے اپنے شاگرد منشی شیو نارائن آرام کے ذریعے اپنی تصنیف دستنبو کا ایک نسخہ ان کے اسی پتہ پر بھجوایا ہے۔

غالب اور مولوی سراج الدین احمد کے تعلقات کی نوعیت کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام لکھے ہیں۔ مولوی سراج الدین احمد نے ایک طویل عرصہ اکبرآباد میں گزارا۔ جن دنوں مولوی سراج الدین احمد اکبرآباد میں تھے انھوں نے منشی جواہر سنگھ جوہر کو ان کے پاس بھیجا تھا تاکہ وہ ان کی صحبت میں رہ کر کسی قابل ہو سکیں، غالب نے بے تجبر کے نام ایک خط میں مولوی سراج الدین احمد

کی یوں تعریف کی ہے :

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست

ورنہ غالب نیست آہنگ غزل خوانی مرا

(غالب ص۱۱۲ ص۱۱۳ ، ذکر غالب ص۲۰۲ ص۲۵۱

تاریخ صحافت اول ص۸ ، خطوط غالب ص۲۰)

میر سرفراز حسین

میر سرفراز حسین ، میر مہدی مجروح کے بھائی اور میر حسین نگار کے صاحبزادے تھے ان کو کتابیں جمع کرنے اور فقہ پڑھنے کا حد درجہ شوق تھا۔ غالب نے متعدد بار ان کو دوسرے مروجہ علوم کی تحصیل کی جانب توجہ دلائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا جس پر غالب ان کو طنزیہ طور پر مجتہد العصر اور سلطان العلماء کہنے لگے۔

۱۸۵۷ء میں جہاں دہلی کے رہنے والوں پر مصیبت آئی ، میر سرفراز حسین کو بھی پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے پانی پت پہنچ کر وہاں کچھ دن گذارے جب امن و امان کی کچھ صورت پیدا ہوئی ، دہلی آکر نوکری کی تلاش میں لگ گئے۔ غالب نے الگزینڈر ہیڈرلی سے ان کی نوکری کے لیے سفارش کی جو اس وقت الور میں کپتان کے عہدہ پر مامور تھے۔ اسی دوران راجہ شیو دھان سنگھ کو اختیارات تفویض ہوئے اور الور کے انتظامی ڈھانچہ میں تبدیلی عمل میں آئی ، جس پر غالب نے میر سرفراز حسین کو الور روانہ کیا۔ میر سرفراز حسین ۱۸۵۹ء میں الور پہنچ کر راجہ شیو دھان سنگھ کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا۔ غالب ان کی پریشانی روزگار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انھوں نے میر سرفراز حسین کو ایک تعارفی خط دے کر علی بخش خانساماں کے پاس رام پور بھیجا ، لیکن رام پور پہنچنے کے بعد ان کو

سر سے ارسال کریں تو کچھ مالی امداد ہو جائے گی۔ غالب نے ایک مسودہ عرضداشت سے ساتھ سکے کے تین نقشے ارسال کئے اور لکھا کہ "جو نقشہ پسند آئے وہ حضور کو مبارک ہو ________"

غالب کے اس مسودہ عرضداشت اور سکہ کے نقشوں کا کیا بنا؟ اس سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اغلب ہے کہ یہ مسودہ عرضداشت اور سکہ کے نقشے دفتری طریق کار کی نذر ہو گئے اور غالب کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکی کہ وہ راج کے متوسل اور سری مہاراج کے دولت خواہ اور دعاگو گنے جائیں۔

(غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط۔ آجکل ۱۵ / فروری ۴۷ء

صحیفہ، تذیب ۱۵، ص ۵۳)

سراج الدین احمد ٹونکی

سراج الدین احمد ٹونکی کے تفصیلی حالات نہیں ملتے ہیں ان کے آباؤ اجداد نے عالمگیر کے عہد حکومت میں کوہاٹ سے لاہور کی طرف ہجرت کی تھی اور شمالی ہند کے مختلف شہروں میں آباد ہونا شروع کر دیا تھا۔ سراج الدین احمد ٹونکی کے اہل خاندان رامپور میں آباد ہو گئے۔ ان کے والد سید احمد رام پوری نے کچھ عرصہ رام پور میں بسر کرنے کے بعد ٹونک کی راہ لی اور وہاں توطن اختیار کر لیا، سراج الدین احمد نے اپنے والد کے ساتھ ٹونک پہنچ کر ملازمت کے حصول کی کوشش کی اور چند ہی دنوں کے اندر اندر سواروں میں بھرتی ہو گئے۔ جب ان کے چچا سید مسعود الدین احمد کو دیوان ریاست کا منصب ملا تو سراج الدین احمد کی بھی قسمت چمک اٹھی اور وہ کمپو ودم کے افسر بنا دیے گئے۔ بعد میں ان کی خدمات کے صلہ میں والیٔ ٹونک نواب وزیر الدولہ کی طرف سے ان کو سراج الدولہ ثاقب جنگ کا خطاب دیا گیا۔ اس کے علاوہ اٹھائیس ہزار روپے سالانہ

کی جاگیر بھی عطا کی گئی - وزیر الدولہ کے انتقال پر نواب محمد علی خاں مسند نشین ہوئے ابتدا میں سراج الدین احمد ٹونکی اور نواب محمد علی خاں میں خوش گوار تعلقات رہے، لیکن بعد میں ایسے اختلافات پیدا ہو گئے کہ نواب محمد علی خاں نے ان کو جلا وطن کر دیا. ان کا ساز و سامان اور جائیداد ضبط کر لی گئی - مکان سے برآمد ہونے والی تین لاکھ اشرفیوں کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا گیا -

سراج الدین احمد ٹونکی ٹونک سے نکل کر آبو اور پھر کلکتہ پہنچے - دو تین سال تک وہاں مقدمہ دائر کرنے کی کوشش کی، اس میں کامیابی کا امکان ممکن نہیں رہا تو جے پور آ گئے اور بقیہ تمام عمر یہیں گزار دی - ان کے انتقال پر نواب ابراہیم علی خاں نے انکے بال بچوں کے لئے ایک سو تیس روپے ماہانہ کا اضافہ کر دیا -

غالب اور سراج الدین احمد میں روابط تھے بھی یا نہیں، اس سے متعلق وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں، غالب نے جن دنوں والیانِ ٹونک کی مدح میں قصائد لکھے تھے خیال ہوتا ہے کہ سراج الدین احمد ٹونکی سے بھی واقفیت پیدا کر لی تھی کیونکہ ان کو نواب وزیر الدولہ کے مزاج ہی میں رسوخ نہیں تھا بلکہ وہ انصرام ملکی و مالی میں بھی پوری طرح دخیل تھے - سراج الدین احمد ٹونکی پر وزیر الدولہ کے انتقال کے بعد جو کچھ گزری اس کا علم غالب کو اپنے رامپور کے قیام کے دوران ہوا - اس پر وہ نہ صرف پریشان ہوئے بلکہ انھوں نے قربان علی بیگ سالک کے بھائی شمشاد علی بیگ رضواں کو ایک خط لکھا اور اس کے ذریعے سراج الدین احمد ٹونکی کے حالات معلوم کرنا چاہے -

انھوں نے لکھا:

"ہاں بھئی ٹونک والے سراج الدین احمد کا بھی حال لکھنا"

اس سے غالب کا مطلب سراج الدین احمد کی حالات سے آگہی حاصل کرنے کے علاوہ کچھ نہیں -

(آجکل فروری ۵۸ء   خطوط غالب ص۱۳۱)

حکیم سعدالدین خاں

نواب ضیاء الدولہ کا نام حکیم سعد الدین خاں تھا، وہ حکیم نواب رکن الدولہ کے صاحبزادے اور دہلی کے شاہی طبیب تھے۔ ان کی بہن غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عاشور بیگ سے منسوب تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی سعیِ انقلاب ناکام ہونے پر انگریزوں نے مرزا عاشور بیگ اور ان کے اہل خاندان کو گولی ماردی تو نواب ضیاء الدولہ نے دہلی سے فرار کیا اور پانی پت جاکر روپوش ہوگئے وہاں لٹنا ان کا تمام مال واسباب لٹ گیا۔ انگریزوں نے بغاوت کے شبہ میں ان کی تمام املاک اور جائیداد ضبط کرلی۔ نواب ضیاء الدولہ نے انتہائی پریشانی اور فاقہ کشی کی حالت میں لکھنؤ کا قصد کیا تاکہ اپنے بہنوئی کے بھائی مرزا عباس بیگ سے قانونی امداد حاصل کریں۔ اس کا کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا، نامرادانہ دہلی چلے آئے۔

اس وقت دہلی میں شاہ عبدالعزیز عرف چھوٹے افغا جی کی کرامات کا کافی چرچا تھا۔ نواب ضیاء الدولہ نے ایک روز ان کی خدمت میں حاضر ہوکر تنگ دستی کی شکایت کی اور کہا کہ میں نان شبینہ تک کو محتاج ہوگیا ہوں۔ اب میرے لئے اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں رہی کہ اپنے اہل خاندان کو لے کر مسجد میں آرہوں۔ شاہ عبدالعزیز نے نے لاہور جانے اور وہاں قانونی کارروائی کرنے کی رائے دی، لیکن نواب ضیاءالدولہ کے پاس اتنا بھی سامان نہیں تھا کہ وہ ایک روز کا فاقہ ٹال لیں، وہ اسی فاقہ کشی کی حالت میں گھر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں ایک ایسا ساہوکار مل گیا جس سے ان کی دیرینہ ملاقات تھی۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ ان کے لاہور جانے اور وہاں درپیش آنے والے اخراجات کی کفالت کرے گا، جس پر وہ اپنے لڑکے نواب بشیرالدین احمد خاں کے

ساتھ لاہور روانہ ہوگئے۔ غالب نے ۱۶، فروری ۱۸۶۲ء کو نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"ضیاء الدولہ کی پانچسو روپے کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہوگئی، تباہ و خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے"

نواب ضیاء الدولہ نے لاہور پہنچتے ہی چیف کورٹ کا رُخ کیا اور صدر حاکم کے دروازے کے پاس کھڑے ہوگئے، وہ عدالت برخاست کر کے کمرہ سے نکلا تو اچانک اس کی نظر ان پر پڑ گئی، اس نے انتہائی ہمدردی سے تمام حالات سُنے اور مشورہ دیا کہ ایچی گن کو اپنا وکیل مقرر کرو۔ ایچی گن نے مقدمہ لڑا، چند دنوں کے بعد قرق شدہ ساری املاک واگذاشت ہوگئیں، دہلی آکر پھر ایک امیر اور دولت مند بن گئے لیکن زیادہ دنوں زندہ رہنا نصیب نہیں ہوا۔

(کارنامہ سروری ص۹ ص۳۳ ص۳۳ ص۳۵

(عمدۃ الصحائف ص۲۸، خطوط غالب ص۹)

میر سعادت علی

میر سعادت علی باقر علی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا مولد دہلی تھا۔ لیکن انہوں نے بہ سلسلۂ روزگار اجمیر میں اقامت اختیار کر لی تھی اور رزیڈنٹ راجپوتانہ کے دفتر میں میر منشی ہوگئے تھے۔ غالب کی بعض تحریروں سے اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ ان میں اور غالب میں دوستانہ نوعیت کا تعلق تھا۔ میر سعادت علی نے اجمیر کے قیام کے دوران ایک مسجد اور ایک کنواں تعمیر کرایا تھا اور غالب سے اس کا قطعۂ تاریخ لکھنے کی خواہش تھی۔ غالب نے قطعہ کے طور پر چار شعر کہے تھے۔

میر سعادت علی کرد در اجمیر طرح　　　　مسجد و چاہی کہ ہست چشمۂ آب بقا

اس کہ زباقرعلی تا بہ علی می رسد　　　حلقہ بہ حلقہ ہم سلسلہ اسش مرحبا
ساختہ شد چوں مکاں، کرد بدل اجر آں　　　از رہِ صدق و صفا نذرِ رسولِ خدا
از پئے ایں سال نیک گفت ہمایوں سروش　　　چشمۂ زمزم صفت مسجد کعبہ بنا

میر سعادت علی نے اجمیر میں ایک طویل عرصہ تک قیام کیا۔ ۱۸۶۲ء میں یا اس سے کچھ پہلے حسن وظیفہ پر ملازمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے آئے۔ اسی دوران غالب نے اغلاط برہان قاطع کو بہ عنوان قاطع بُرہان مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع کرایا۔ جس پر پورے ہندوستان کی ادبی فضا مکدر ہو گئی۔ میر سعادت علی نے محرق برہان کے عنوان سے قاطع برہان کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور وجہ تالیف یہ بیان کی کہ :۔

"میں نے ایک کتاب حدائق العجائب لکھی تھی اور اس کی تصنیف میں برہان سے بھی مدد لی تھی۔ قاطع برہان میں جن لغات پر اعتراض ہیں، ان میں سے ۳۲ حدائق العجائب میں بھی لکھے ہوئے تھے۔ رشیدی جہانگیری وغیرہ کی طرف رجوع کیا تو اعتراض غلط نظر آئے۔ اندفاعِ اعتراض ہائے غالب کے لئے یہ کتاب تحریر کی۔"

اس کتاب میں میر سعادت علی کا لہجہ درشت تھا۔ انھوں نے کنایتہً غالب کو مرزا عبدالصمد کا معشوق قرار دیا، حکیم محمود خاں سے اختلال حواس کا علاج کرانے کی نصیحت کی ساتھ ہی شاعری کو بھی ناقابلِ اعتنا ٹھہرایا۔ اس پر غالب جس قدر بھی مشتعل ہوتے کم تھا، انھوں نے اس کے جواب میں، لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم کے نام سے یکے بعد دیگر دو رسالے لکھے جن کو اپنی بجائے میاں داد خاں سیاح اور عبدالکریم کی تصنیف بتایا۔ لطائف غیبی میں میر سعادت علی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"منشی سعادت علی نہ نثر سے واقف نہ نظم سے آگاہ، نہ عقل کا سرمایہ، نہ علم کی دست گاہ، کسی بستی میں، کسی گاؤں میں کسی گھاٹ پر، کسی ہاٹ پر، اس بزرگ کا نام کسی سے نہیں سنا الخ۔"

"ہمارے منشی صاحب از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں، از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں، جیسے منشی بھیروں ناتھ، منشی گینڈا مل وغیرہ۔"

"یہ مناظرہ ہے یا جھگڑا؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک تالیاں بجا بجا کر گالیاں دیتا ہے یا ایک بٹری کو کسی نے چھیڑ دیا ہے۔"

سوالات عبدالکریم میں خود عبدالکریم کی زبانی کہلوایا ہے۔ سنئے میں نے ایک دن نواب صاحب محتشم الیہ غالب سے پوچھا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی بد زبانی کا جواب کیوں نہ دیا، حضرت نے فرمایا کہ اگر راہ چلتے سڑک پر تم کو گدھا لات مارے تو کیا تم بھی بہ سبیل تلافی سڑک پر ٹھہر جاؤ گے اور گدھے کو لات مارو گے، میں نے کہا کہ ہرگز نہیں، حضرت نے ارشاد کیا کہ پھر میں منشی جی کی خرافات کا جواب کیوں دوں۔

قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ میر سعادت علی کی وفات تیغ تیز کی تصنیف سے کچھ قبل وقوع میں آئی تھی، اس میں ان کا ذکر بہ صیغۂ ماضی ہے اگر یہ استدلال درست ہے تو پھر میر سعادت علی نے ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا کیونکہ یہی تیغ تیز کا سال تصنیف و اشاعت ہے۔

(لطائف غیبی، سوالات عبدالکریم،

سبد باغ دو در صفحہ، آثار غالب ص ۳۲)

سلطان العلما سیّد محمد

غفراں مآب سید دلدار علی نے خاندان اجتہاد کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ لکھنؤ کے پہلے مجتہد تھے۔ ان کے متعلق آئینۂ حق نما، دوحۂ ہاشمیہ، نجوم السما اور تاریخ و سیر کی متعدد دوسری کتابوں میں لکھا ہے کہ انھوں نے شب قدر کی ایک مخصوص ساعت میں

زیر قبہ حسینی اپنی اولاد میں تا قیامت علم دین باقی رہنے کی دعا مانگی تھی، جس کو شرف قبول ملا۔

غفراں مآب سید دلدار علی نے اپنے انتقال سے گیارہ روز پہلے ۱۲ رجادی الاوّل ۱۲۳۵ھ کو ایک وصیت نامہ کے ذریعہ اپنے بڑے صاحبزادہ سید محمد کو اپنا ولی عہد اور جانشین مقرر کیا۔

سید محمد، ۱۷صفر ۱۱۹۹ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ امجد علی شاہ والی اودھ نے ۱۲۵۲ھ میں سر برآرا ہونے کے بعد قاضی قضات کی منصب ان کے حوالہ کی اور تمام دفاتر کو ہدایت کی کہ وہ سید محمد کے نام کے ساتھ سلطان العلماء، مجتہد العصر اور قبلہ و کعبہ کے القاب لکھیں۔

سید محمد کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اودھ کے نظم و نسق کو اسلامی اصولوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ جس کے نتیجہ میں کتاب و سنت پر باقاعدہ عمل ہوتا، زکوٰۃ و خمس وصول کی جاتی اور عراق و عرب کے مختلف شہروں کو امدادی عطیے بھیجے جاتے تھے۔

واجد علی شاہ کے عہد حکومت میں جب ہندوؤں نے ہنومان گڑھی کے قریب واقع مسجد کو شہید اور سیکڑوں مسلمانوں کو قتل کیا تو سید محمد ہی تھے جنھوں نے شیعان ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جہاد کو واجب قرار دیا۔

غالب کو سید محمد سے غائبانہ عقیدت تھی، وہ ان کو سلطان العلماء، مجتہد العصر اور قبلہ و کعبہ کے القاب سے یاد کرتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے غالب کو دربار اودھ سے خلعت ملا تھا۔ ایک مرتبہ غالب نے ان سے مسئلہ نظیر المبین کے بارے میں بھی رائے پوچھی تھی۔

اودھ کی ضبطی اور ۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب کے ناکام ہونے کے بعد سید محمد کو بھی لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ غالب نے ۱۸ر جولائی ۱۸۵۸ء کو ایک خط کے ذریعہ مرزا

حاتم علی بیگ مہر سے ان کی خیریت دریافت کی، لکھتے ہیں:

"ہائے لکھنؤ! کچھ نہیں کھلتا کہ اس بہارستان پر کیا گزری؟ اموال کیا ہوئے؟ اشخاص کہاں گئے؟ خاندان شجاع الدولہ کے زن و مرد کا انجام کیا ہوا، قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر کی سرگذشت کیا ہے؟ گمان کرتا ہوں کہ بہ نسبت میرے تم کو کچھ زیادہ آگہی ہو گی۔ امیدوار کہ جو آپ پر معلوم ہے وہ مجھ پر مجہول نہ رہے"

سید محمد نے ۲۲ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور غفراں مآب کے امام باڑہ میں مدفون ہوئے۔ ان کے انتقال پر متعدد شاعروں نے مرثیے لکھے اور تاریخیں نکالیں۔ ان میں مفتی محمد عباس کے اس قطعۂ تاریخ کو بے پناہ قبولِ عام حاصل ہوا:

قبلۂ دیں کعبۂ ایماں جناب مجتہد
کز وجودش رونق محراب و منبر داشتند
رہبرِ دیں علی بود دست و ہمنام نبی
ہیبتے از رعب خود در قلب کافر داشتند
در حکومت زہد و تقویٰ العجب ثم العجب
کیسہ پر زر داشتند و طبع بوزر داشتند
در عرب یا در عجم در علم و فضل و حسن خلق
کس نمی گوید کہ در آفاق ہمسر داشتند
حلہ ہائے نو بہ تو پوشند در خلد بریں
در جہاں گرچہ لباسِ کہنہ در بر داشتند
سالِ تاریخ وفاتش راچو می پرسی زمیں

آسمانے بود وائے از زمین برداشتند

۱۲۸۴ھ

سید محمد نے ایک اندازہ کے مطابق پچاس سے زائد کتابیں تصنیف کیں جن کا موضوع فقہ، مناظرہ، علم الکلام اور سوانحِ اہلِ بیت رہے۔

(تذکرۂ بے بہا صفحہ ۲۳۳، خطوطِ غالب صفحہ ۲۱۵

مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے تجلیات)

میاں داد خاں سیّاح

میاں داد خاں سیاح کے والد عبداللہ خاں اورنگ آباد کے متمول افراد میں سے تھے سیاح کی ولادت اورنگ آباد ہی میں ہوئی۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے ان کا سال ولادت ۱۸۳۰ء بتایا ہے۔ سیاح نے علوم رسمیہ کی تکمیل بھی نہیں کی تھی کہ گھر کا اقبال ادبار سے بدل گیا اور وہ اورنگ آباد کو خیرباد کہہ کر سورت چلے گئے۔ وہیں سے عرب اور عجم کی راہ لی۔ بلادِ ہند کا بھی چپہ چپہ چھان مارا۔ ایک اندازہ کے مطابق ۱۸۳۶ء سے ۱۸۶۲ء تک حالتِ سفر میں رہے۔ اس کے بعد دربار سورت میں آ کر میر غلام بابا رئیس سورت کی مصاحبت اختیار کر لی۔ اس اثنا میں بھی لذتِ آوارگی نے چین سے نہیں رہنے دیا۔ وقتاً فوقتاً کانپور، اورنگ آباد، دہلی، بمبئی، پونہ، پٹنہ، بنارس، مرادآباد اور رام پور جاتے رہے۔

۱۸۷۸ء میں سیاح بمبئی سے حیدرآباد جا رہے تھے۔ انھوں نے دوسرے درجہ کا ٹکٹ خرید کر سو روپے کا نوٹ بھنایا، اس کے فوری بعد ایک اور مسافر نے بھی سو روپے کا نوٹ دے کر ٹکٹ حاصل کیا۔ اس کے اور سیاح کے نوٹ کا نمبر ایک ہی تھا، جس پر کارروائی پولیس کے سپرد کی گئی اور سیاح کو حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر جعلی کرنسی بنانے اور چلانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ زبردست پہرے میں بمبئی لائے گئے جہاں

ان کو چودہ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔
قید خانہ کا منتظم ایک پارسی شخص تھا، اس نے سیاح کے علم و فضل کی قدر کرتے ہوئے اپنے بچوں کی اتالیقی کا کام ان کے سپرد کیا۔ جب ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی منائی گئی تو اس نے سیاح سے قصیدہ لکھوا کر اپنی سفارش کے ساتھ حکومت ہند کو بھیجا جس پر وہ مقررہ میعاد سے پہلے رہا کر دیئے گئے۔

۱۸۹۳ء میں سیاح کے سرپرست اور ولی میر غلام بابا رئیس سورت کا انتقال ہوگیا جس کے نتیجہ میں سیاح مالی طور پر اس درجہ پریشان ہوگئے کہ ان کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرنا پڑا۔ بالآخر ان کے ایک مداح حکیم شیخ محمود نے ان کی دست گیری کی اور رہائش کا بندوبست کیا۔ سیاح نے ان ہی کی سرپرستی میں پچاسی سال کی عمر میں ۱۹۰۷ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ سیاح کے انتقال پر غلام بابا رئیس سورت کے صاحبزادے مظفر حسین نے ان کی بیوہ عارض بی بی کو اپنے محل میں بلا لیا۔ ۱۹۳۰ء میں وہ بھی انتقال کر گئیں۔

سیاح غالب کے محبوب دوست، معتمد شاگرد اور زبردست طرف دار تھے۔ غالب نے اپنے خطوط میں برخوردار، نور چشم، عزیز جان، سعادت و اقبال نشان اور مولانا سیاح کے القاب سے یاد کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ایک مرتبہ تو یہ بھی لکھ دیا:

"یہ جو میں نے سیف الحق کا خطاب دیا ہے، اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے، تم میرے ہاتھ ہو، میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمہارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔"

سیاح کی پوری تصانیف سامنے نہیں آئی ہیں، اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے کیا لکھا اور کتنا لکھا۔ ضرورت ہے کہ اس جانب بھی توجہ کی جائے۔ ارباب تحقیق فی الحال میر سیاح اور ایک مختصر دیوان کی دریافت سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ ان کے کلام کا انتخاب

یہ ہے: ———

آیا نہ یار وعدے پہ ستایا صبح تک　　کیا کیا شب فراق میں تڑپی بدن میں روح

عبث جاتا ہے کعبے کو خدا نزدیک ہے دل سے　　تو کیا ناداں ہے زاہد فائدہ تحصیل حاصل سے
نہ رکھیں گے قدم دہشت کے مارے غیر واں ہرگز　　نہ گروائیں اٹھا کر لاش میری کوچے قاتل سے

دلِ وحشی کا بھی کیا کارخانہ لاابالی ہے　　زرِ داغِ جنوں کا چرخ ہے سرکار عالی ہے
کہوں گر جان تو سمجھے کہ ہم کو بے وفا سمجھے　　سمجھ اس بدگماں کی ساری دنیا سے نرالی ہے
پھرا کرتا ہوں گرد اس کے نہیں تاب ہم آغوشی　　میں ہوں تصویر اور وہ شمع فانوس خیالی ہے

ہوتے ضرور تیری ثنا خواں پہ کیا کریں　　قائل دہانِ زخم کی گویا زبان نہ تھی

پڑ گیا ہے اس کو چسکا چاٹ کر کس کا لہو　　اوگلی ہی پڑتی ہے جو تلوار اس خونخوار کی

آتش قدم ایسا ہوں جو بیٹھوں تو زیادہ　　ہو دھوپ سے بھی سایۂ دیوار میں گرمی

بچھاتا خار غم کے واں جہاں بستر لگاتا ہوں　　کھٹکتی میری دو دن کی فلک کو زندگانی ہے

مشتعل ہے بزم میں شعلہ جو اس کے حسن کا　　شمع پروانوں سے جو پاتی پہ پروانہ ہے

بارے اتنا تو اثر نالۂ بلبل نے کیا　　نظر آتا ہے ہر اک گل ہمہ تن گوش مجھے

عدم کا کیوں کیا ثابت وجودِ اہلِ سخن بھولے   نہ دیتے تھے عدم کے ساتھ تشبیہ دہن پہلے

سیاح اور ان کا کلام ۔ سخن شعرا صفحہ ۲۳

(خم خانۂ جاوید جلد چہارم صفحہ ۳۰۳ خطوطِ غالب صفحہ ۴۲۹)

مرزا حسین علی خاں شاداںؔ

مرزا حسین علی خاں کا تخلص شاداں بھی تھا اور خیالی بھی ۔ وہ زین العابدین عارف کے چھوٹے صاحبزادے تھے ۔ عارف کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف دو سال تھی ۔ جس پر غالب نے ان کو اپنا فرزند متبنیٰ بنا لیا اور بڑے لاڈ پیار سے پرورش کی ۔ غالب ایک لمحے کے لئے بھی ان کو اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے ۔ رامپور کے سفر کے دوران بھی ان کو اپنے ساتھ رکھا تھا ۔

حسین علی خاں سن بلوغ کو پہنچے تو غالب نے اپنی کوششوں سے ان کی منگنی نواب احمد بخش خاں مرحوم والیٔ لوہارو کے حقیقی بھائی کی پوتی اور اکبر علی خاں کی بیٹی ،، حسن جہاں بیگم سے کردی اور اس سلسلہ میں تاریخ عقد کا تعین بھی کردیا ۔ اس کے باوجود غالب کے مالی حالات اور وسائل ایسے نہیں تھے کہ وہ اس بارگذاری سے سلامت گزر جاتے انہوں نے مالی امداد کے لئے نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور سے درخواست کی اور اس میں لکھا ۔

" آپ کے غلام زر خرید حسین علی خاں کی منگنی ہوگئی ..... رجب کا مہینہ قرار پایا ۔ اب میرے بڑھاپے اور مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ ہے "

مغرور نواب نے اپنے باپ کے استاد کی اس درخواست کو " مہمل " قرار دے دیا اور ہدایت کی کہ " خلاصہ مکنونِ خاطر تحریر کیا جائے ۔ اس سے غالب پر کیا گزری ۔ اس کا اندازہ ممکن نہیں ۔ بہرحال انہوں نے یہ جبر بھی سہہ لیا اور دوبارہ

لکھا ——— !

"مجملاً یہ کہ میں در دولت کا گدائے خاک نشین اور وہ (حسین علی خاں) آپ کا غلام، تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد، جنس اسباب، املاک اور میرے گھر میں زیور زرینہ وسیمینہ کا نام ونشان نہیں، ادھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں، تاکہ یہ کام سرانجام پا جائے۔ اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔

انہوں نے اس وضاحت میں بھی فی ڈھونڈ نکالی اور حکم دیا گیا کہ "مصارف کی تعداد لکھی جائے تاکہ حکم مناسب دیا جائے"۔

غالب نے ایک بار اور لکھ بھیجا۔

یہ رسم نہیں ہے کہ سائل مقدار سوال عرض کرے۔ حال مصارف شادی خاندان لکھ دیا۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی لیکن۔ یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میرا حق خدمت اتنا نہیں کہ اتنا مانگ سکوں۔ جو کچھ دوگے اس میں شادی کر دونگا"

اس پر بھی نواب کا دل نہ پسیجا۔ غالب مالی امداد کی امید پر شادی کو ملتوی کرتے اور تاریخوں کو بڑھاتے رہے۔ حسین علی خاں کی سسرال والوں کی جانب سے شادی کے سخت تقاضوں کی اطلاع بھی دی۔ کار برآری کے لئے قصیدہ بھی لکھا۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ بالآخر اس باب میں یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

ناچار حسین علی خاں کی شادی سے قطع نظر کی، اب اس باب میں عرض کروں، کیا مجال۔ کبھی نہ کہوں گا۔ شادی کیسی، میری آبرو بچ جائے تو غنیمت ہے۔

غالب کی زندگی میں حسین علی خاں کی شادی کا ارمان پورا نہیں ہو سکا۔ ان کے انتقال کے ایک ماہ بعد حسین علی خاں نے نواب کلب علی خاں سے اپنے تقرر تنخواہ کی درخواست کی۔

اس درخواست پر امتیاز علی عرشی کے قیاس کے مطابق نواب کلب علی خاں

نے حسین علی خاں کو اپنے دربار کے متوسلین میں شامل کر لیا اور پچیس روپے ماہوار مقرر کر دیئے۔ مولوی بشیر الدین دہلوی کے بیان کے مطابق حسین علی خاں کو ماہور سے پہلے تیس اور بعد میں ساٹھ روپے ملنے لگے۔ لالہ سری رام اور مالک رام نے بھی کسی جواز کے بغیر اسی بات کا اعادہ کیا ہے۔ لالہ سری رام کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی خاں کا اپنے بڑے بھائی مرزا باقر علی خاں کی موت کے صدمے سے دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ اور وہ آخر زمانے میں مالیخولیا کا شکار ہو گئے تھے اور یہ فرض کر لیا تھا کہ شاعر کے لئے دبلا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس وہم نے صورتحال یہاں تک پہونچا دی کہ پانی اور غذا کا استعمال بھی کم کر دیا۔ حکیم رضا خاں نے ایک خمیرہ کا نسخہ لکھ کر دیا تھا۔ جب بھی پیسے ہوتے، بازار جا کر اسے خریدتے اور کھاتے تھے غذا اور پانی کے بغیر زندگی کہاں تک وفا کرتی۔ نقاہت اور کمزوری نے طول کھینچا اور یکم شوال ۱۲۹۶ھ کو تیس سال کی عمر میں چل بسے۔ نساخ نے شادان فرخ نہاد سے
۱۲۹۶ھ
ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔

احمد علی شوق کے بیان کے مطابق حسین علی خاں کا الور میں بوجہ ملازمت قیام رہا۔ بہت سے شاگرد تھے۔ شاعری کا رات دن مشغلہ تھا۔ لالہ سری رام کے بیان کے مطابق ان کا مجموعۂ کلام ان کے اعزا و احباب کی غفلت سے تلف ہو گیا اس کے باوجود انہوں نے مختلف ذریعوں اور گلدستوں سے ان کے کلام کا اچھا خاصہ انتخاب جمع کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ انتخاب یادگار، طور کلیم اور سخن شعرا میں بھی ان کے چند شعر ملتے ہیں۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے۔

گر یہی جنبشِ مژگان کے اشارے ہوں گے

دل نکل جائے گا پہلو سے تنفر ہونے تک

وہ یہ کہتے ہیں جو کرتے ہو دعا بھی کر لو

ہم مزہ تم کو دکھا دیں گے اثر ہونے تک

تم تو آتے ہی رہے بہر عیادت اور ہم
مر گئے چارۂ آزار جگر ہونے تک

دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے ان سے اچھی
رنگ کھل جائے گا، اس کا بھی سحر ہونے تک

زلف کی بو ادھر نہیں آتی — کیا صبا میرے گھر نہیں آتی
نیند اس بت کے ہجر میں ہم کو — شام سے تا سحر نہیں آتی،
جب کہ وہ خود نظر نہیں آتا — زندگی بھی نظر نہیں آتی

دل کسی شخص پہ آجائے تو کچھ حال کھلے
آپ کیا جانیں کہ عاشق کی طبیعت کیا ہے

تذکرۂ کاملان رامپور ص ۱۱۴ مکاتب غالب ص ۱۴۳، ۸۰، ۸۳
خم خانۂ جاوید چہارم ص ۳۶۹، ۳۸۸ واقعات دارالحکومت
دہلی دوم ص ۳۸۱ انتخاب یادگار ص ۳، ۱۲۷ فغان دہلی ص ۵۵
ذکر غالب ص ۱۱۰، ص ۱۴۲

فیض الدین حیدر (عرف حیدر جان)

فیض الدین حیدر عرف حیدر جان کا تخلص شائق تھا۔ وہ ڈھاکہ کے باشندے اور خلیل اللہ کشمیری کے بیٹے تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ان کی ولدیت علیم اللہ بھی ظاہر کی ہے جو شبہ سے خالی نہیں۔ فیض الدین حیدر نے علوم عربیہ و فارسیہ کی

باقاعدہ تحصیل نہیں کی تھی، اس کے باوجود ان کو ان زبانوں پر اس درجہ عبور حاصل تھا کہ وہ فارسی اور اُردو میں شعر موزوں کر لیتے اور ان پر خط وکتابت کے ذریعہ غالب سے اصلاح لیتے تھے۔

سراپا سخن کے مولف نے فیض الدین حیدر کو وارد دہلی لکھا ہے۔ وہ دہلی بھی گئے ہوں یہ ناممکن نہیں۔ عبدالغفور نساخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کلکتہ میں بھی قیام کیا تھا۔ اس کی تائید غالب کے ایک فارسی خط سے بھی ہوتی ہے جو اُنہوں نے مرزا احمد بیگ طپاں کے نام لکھا تھا جو کلکتہ میں رہتے تھے۔ اس خط میں فیض الدین حیدر کا ذکر ہے۔ جس وقت نساخ اپنا تذکرہ لکھ رہے تھے۔ فیض الدین حیدر کے انتقال کو تیرہ سال گذر چکے تھے۔ نساخ کے تذکرہ کا سال تالیف ۱۲۸۱ھ ہے۔ اس بنا پر قیاس کیا جاتا ہے کہ فیض الدین حیدر نے ۱۲۶۹ھ میں وفات پائی۔ ان کے شعر پُر درد اور بامزہ ہوتے تھے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

اسی نے کیا ہم کو رُسوائے عالم | کہ جس نے تجھے عالم آرا بنایا
شیشہ گر کیا ہے بنا تجھ سے جو پتھر شیشہ | اشک کا اس سے بناتا ہوں مَیں بہتر شیشہ
یوں یہ تن خراب بنا اور بگڑ گیا | جیسا کہ اک حباب بنا اور بگڑ گیا
ہیں بس. لو خوں بہا بعد قتلم | بلفر ماکہ از کشتگاں من است

سخن شعرا ص۳۴۱، نگارستان سخن ص۳۵

سراپا سخن ص۱۹۲، آثار غالب ص۱۷۱

شاہ عالم مارہروی

درگاہ برکاتیہ سرکار خورد کے سجادہ نشین حضرت صاحب عالم مارہروی سے غالب کو اس درجہ ارادت تھی کہ وہ بغیر تعظیم کے ان کا نام زبان پر لانا بے ادبی خیال کرتے تھے۔

شاہ عالم ان ہی صاحب عالم مارہروی کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۴۰ھ بتایا جاتا ہے۔ شاہ عالم کی تعلیم و تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی، ان کے والد اور خاندان کے دوسرے افراد شعر کہتے اور تفتہ سے اصلاح لیتے تھے، اس بنا پر شاہ عالم کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق ہو گیا اور اپنی غزلیں غالب کے پاس بغرض اصلاح روانہ کرنے لگے۔

جن دنوں غالب رام پور گئے ہوئے تھے، شاہ عالم نے اپنی غزلوں کا مسودہ غالب کے پاس دہلی کے پتہ پر روانہ کیا۔ جب وہ رام پور سے دہلی واپس ہوتے تو ان کو شاہ عالم کا خط ملا جس میں انھوں نے غزلوں میں اصلاح دینے میں تاخیر کی شکایت کی۔ غالب نے ان کو لکھا:

> "تفرقۂ اوقات و سفر رام پور و شدت تموز متفق اس کی ہوئی کہ ہنوز تمہارے مسودات دیکھے نہیں گئے۔ تا نزول باران رحمت الٰہی اور بھی چپکے بیٹھے رہو۔"

فرزند احمد صفیر بلگرامی شاہ عالم کے بھانجے تھے۔ ان کے یہاں لڑکے کی ولادت ہوئی اور اس کا نام نور احمد رکھا گیا تو شاہ عالم نے پانچ شعر کا قطعہ کہا جس کے آخری مصرعہ سے تاریخ ولادت برآمد ہوتی ہے۔ قطعہ یہ ہے:

چوں ز شوم شاد کہ ناگہ ز شرف — مژدہ رساں پیک صبا آمدہ
گفت کہ در خانۂ شمس الضحیٰ — رشک سہا بدر الدجیٰ آمدہ
ہاں بہ وجود آمدہ پور صفیر — کو ہم تن ذہن و ذکا آمدہ
شاہ عالم شاداں پئے تاریخ ظفر — گفت زہے شمس الضحیٰ آمدہ

—— ۱۳۰۰ھ ——

شاہ عالم کے حالات نہیں ملتے ہیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ۱۰ محرم

۱۳۰۳ھ کو ۶۳ سال کی عمر میں انتقال کیا - ان کا کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے ۔
جلوۂ خضر دوم ص۳۰ ، ناموس المشاہیر دوم ص۲۵
خطوطِ غالب ص۵۰)

سیّد عبدالرزاق شاکر

سید عبدالرزاق شاکر، سید عبدالوہاب مچھلی شہری کے صاحبزادے تھے جن کے آباؤ اجداد نے عرب سے غزنی اور غزنی سے جون پور کی طرف ہجرت کی اور پھر مچھلی شہر کو اپنا وطن بنا لیا - غلام رسول مہر نے عبدالرزاق شاکر کو گورکھپور کا رہنے والا بتایا ہے، یہ بات غلط ہے ۔

سید عبدالرزاق شاکر کو عربی اور فارسی میں عالمانہ استعداد حاصل تھی، وہ اپنے دور کے زبردست عالم و فاضل تسلیم کئے جاتے تھے - ان کو علم الانساب کا بھی ماہر خیال کیا جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے نسب نامہ کی تکمیل کے لئے نہ صرف افغانستان عراق اور عرب کی سمت اپنے آدمی بھیجے تھے بلکہ بعض ضروری معلومات کے لئے خطیر رقم بھی صرف کی تھی ۔

سید عبدالرزاق نے ابتدا میں وکالت کی لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تو ۱۸۷۳ء میں سرکاری ملازمت قبول کر کے منصف ہو گئے ۔ بعد میں عدالت خفیفہ کی جج تک ترقی کی - غالب نے شاکر کے نام جتنے بھی خطوط لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شاکر نے اس وقت غالب کو اپنا کلام اصلاح کے لئے بھیجا تھا جب وہ آلام جسمانی میں مبتلا ہو کر قوت حافظہ و سامعہ سے محروم ہو گئے تھے، اس کے باوجود انھوں نے دل شکنی نہیں کی اور لکھا:

" آپ کا واسطے اصلاح کلام کے رجوع کرنا میری طرف موجب

نازش کا ہے' میرا طریق اس فن خاص میں یہ ہے کہ جو شعر بے عیب ہوتا ہے اس کو بدستور رہنے دیتا ہوں اور جہاں لفظ کے بدلے لفظ لکھتا ہوں اس کی وجہ خاطر نشان کر دیتا ہوں تاکہ آئندہ صاحب کلام اس قسم کے کلام میں خود اپنے کلام کا مصلح رہے۔"

ایک مرتبہ سید عبدالرزاق شاکر نے اپنا ایک مخمس اصلاح کے لئے بھیجا جس وقت غالب اس پر اصلاح دے رہے تھے، مفتی صدرالدین آزردہ بھی آپہنچے۔ انھوں نے اس مخمس کی بڑی تعریف کی' چنانچہ غالب نے لکھا:

"مخمس بعد اصلاح بھیجا جاتا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ شعر آپ کہتے ہیں اور حظ میں اٹھاتا ہوں۔ حسن اتفاق سے اصلاح خمسہ کے وقت دوست غم گسار یار وفا شعار روزگار ختم العلما المتجرین مولوی مفتی صدرالدین خاں صاحب بہادر صدر الصدور دہلی المتخلص آزردہ دام لجاہ وزاد علاؤہ کہ مجھ سے ملنے غم خانے پر تشریف لائے ہوئے موجود تھے۔ خمسہ کو دیکھ کر پسند فرمایا' حضور کی بلاغت کی تحسین کی' عربی مصرعوں کے میرے ساتھ شریک غالب ہو کر مزے لوٹے اور آپ کی شیرینیٔ گفتار کے وصف میں تا دیر عجب البیان ورطب اللسان رہے اور مجھ سے بقدر میرے معلوم و بیان کے آپ کی صفات حمیدہ سے واقف ہو کر بہت شاد و خرسند ہوتے۔"

غالب نے عبدالرزاق شاکر کی ایک غزل پر اصلاح کرتے وقت' بعض شعروں میں خامیوں کی طرف ان کی توجہ دلائی' لکھتے ہیں:

کوئی آتا نہیں آگے ترے ہمتا ہو کر آئینہ جب نظر آیا ہے تو اندھا ہو کر

یہ مطلع دل نشیں ہے مگر اتنا تامل ہے کہ آئینہ کو اندھا کہنا

چاہیے یا نہیں ؟

مردم چشم سیہ جب نظر آتا ہے ترا　　بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر
حرمت مے کیلئے پیر مغاں کا ہے یہ حکم　　ریش قاضی کی رہے پنبۂ مینا ہو کر

یہ شعر بے لطف ہو گیا ، کس واسطے کہ جب قاضی کی ریش کہی تو وہ ایہام ریش پنبہ کی رہا "

سید عبدالرزاق شاکر کی خواجہ غلام غوث خاں بے خبر سے بھی دوستی تھی ، شاکر ملازمت کے سلسلہ میں جب تک الہ آباد میں رہے - ان سے ملاقات ہوتی رہی انھوں نے ۱۸۹۴ء میں حسن وظیفہ ملازمت پر سبکدوش ہونے کے بعد علیگڑھ میں سکونت اختیار کر لی اور جون ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا - ان کی جسمانی یادگار ان کے تین صاحبزادے تھے ، سید محمد تقی ، سید علی تقی اور سید محمد ہادی مچھلی شہری جو بالترتیب ۱۹۲۲ء ۱۹۳۳ء اور ۱۹۵۸ء میں بے پور ، علیگڑھ اور کراچی میں انتقال کر گئے -

شاکر کی تصانیف نظم و نثر کا تمام ذخیرہ ان کے اہل خاندان کے پاس محفوظ ہے اور تاحال کسی نے اس کی اشاعت پر توجہ نہیں دی ہے - انکے چند شعر یہ ہیں :

بے مہری و بے لطفی و کج خلقی و نفرت　　کیا کیا نہ مرے یار نے اغیار سے سیکھا
گرنا کبھی ، اٹھنا کبھی رہ رہ کے چمکنا　　بجلی نے مری آہ شرربار سے سیکھا

تاک میں ہوں ساغر سرشار کی　　اس میں کیفیت ہے چشم یار کی
ہیچ ہے دنیا وے یا ایں ہمہ　　دھوم ہے عالم میں اس مردار کی

آفتاب حشر باشد روئے تو　　نامۂ اعمال من گیسوئے تو
مرحبا بر زخم دامن دار من ،　　آفریں بر قوت بازوئے تو

مثلِ خسرو کشتۂ شاکر راہیں   غمزۂ تو چشمِ تو ابروے تو

(تلامذۂ غالب ص ۱۶۲ تا ص ۱۶۵ ، اردوئے معلیٰ ماہنامہ دسمبر ۱۹۱۲ء

خطوط غالب دوم ص ۲۷۹، ص ۲۸۶، ص ۲۸۶

ادبی خطوط غالب ص ۲۵۳)

مرزا نورالدین شاہی

مرزا نورالدین شاہی، مرزا حیدر شکوہ کے بھائی اور مرزا سلیمان شکوہ ابن شاہ عالم کے پوتے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے ۱۲۰۵ھ میں ترک وطن کیا تھا اور لکھنؤ میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ مرزا نورالدین شاہی لکھنؤ میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ شاعری کا ذوق ورثہ میں ملا تھا، خواجہ حیدر علی آتش اور اس کے بعد مرزا آشوب علی حاں کو کلام دکھانے لگے۔

لالہ سری رام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی لکھنؤ سے دہلی آتے اور قلعۂ معلیٰ میں قیام کرتے تھے۔ امیر احمد علوی نے لکھا ہے کہ وہ اپنے بھائی مرزا حیدر شکوہ کے ساتھ ۱۸۱۵ء میں دہلی آئے تھے۔ قادر بخش صابر کی رائے ان کے بارے میں اچھی نہیں تھی، لکھتے ہیں: ——

"عرصہ دو سال کا ہوا کہ کسی تقریب میں شاہجہاں آباد پہنچ کر چرب زبانی کے وسیلے سے مزاج سلطانی میں دخل پایا اور سخنان بے فروغ کو آب و نان کی تحصیل کا ذریعہ بنایا"

مرزا نورالدین شاہی نے شوال ۱۲۶۵ھ مطابق اگست ۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا اور اس کے ردیف نون کی طرح دی تھی۔ اس مشاعرہ میں نہ صرف بہادر شاہ ظفر شریک ہوئے تھے بلکہ انھوں نے غالب کو بھی حکم دیا تھا کہ وہ طرح پر غزل کہیں، غالب نے اپنی غزل کی ایک نقل منشی نبی بخش حقیر کے نام روانہ کی اور ان کو لکھا ہے کہ:

"بجائی غزل کی داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو میر تقی میر کیا کہتے تھے، اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شاہزدگان تیموریہ میں سے لکھنؤ سے یہ زمین لائے، حضور نے خود بھی غزل کہی اور مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی"

مولانا محمد باقر نے اپنے دہلی اردو اخبار میں، رستبر کو اس مشاعرہ کی روداد لکھی تھی اور اس میں پڑھی جانے والی غزلوں کو درج کیا تھا۔ مرزا نورالدین شاہی کی غزل کا مطلع ہے:

لو دعائیں مستجاب شاہ مرداں ہوگئیں
شکر ہے سب مشکلیں شاہی کی آساں ہوگئیں

غالب نے پڑھا:—

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بہادر شاہ ظفر نے اپنی یہ غزل ارشاد فرمائی:—

چار آنکھیں پھر تری اے آفتِ جاں ہوگئیں
تیر سے اس کے جگر کے پار مژگاں ہوگئیں

مرزا نورالدین شاہی، مرزا قادر بخش صابر کے تذکرہ کی تکمیل سے دو سال قبل لکھنؤ روانہ ہوگئے تھے۔ گلستان سخن کا سال تکمیل ۱۲۷۱ھ ہے، اس طرح ان کی واپسی کا زمانہ ۱۲۶۸ھ یا ۱۲۶۹ھ قرار پاتا ہے۔ خم خانۂ جاوید کے مولف نے رسالہ علم حیدری کو مرزا نورالدین شاہی کی تصانیف میں شمار کیا ہے اور بیان کیا ہے کہ اس کا نسخہ انکے کتب خانے میں موجود ہے۔ مرزا نورالدین شاہی کے چند شعر یہ ہیں:

مژدہ باد اے مے پرستو میکدہ کا در کھلا ۔۔۔ خم سر شیشہ کھلا شیشہ سر ساغر کھلا
ملو گلے سے تو جاتا رہے گلا دل کا ۔۔۔ تمہارے وصل پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

(سخن شعراء صـ۲۳۰، گلستان سخن دوم صـ۵۲
بہادر شاہ ظفر صـ۱۰۵، تاریخ صحافت اردو صـ۱۶۳
خم خانۂ جاوید جلد چہارم
نادرات غالب صـ۲۹)

نواب شمس الدین خاں

جن دنوں نواب احمد بخش خاں کا قیام الور میں تھا۔ انھوں نے ایک عورت مدی بیگم سے شادی کر لی تھی جس کے بطن سے دو لڑکے نواب شمس الدین خاں اور ابراہیم علی خاں اور دو لڑکیاں نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم پیدا ہوئیں۔ اسی کے کچھ دنوں بعد ایک برلاس مغل نیاز محمد بیگ خاں کی صاحبزادی بیگم جان سے بھی ان کا نکاح ہو گیا۔ بیگم جان کے بطن سے دو لڑکیاں ماہ رخ بیگم اور بادشاہ بیگم اور دو لڑکے نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں پیدا ہوئے۔

مولوی عبدالقادر رام پوری نے نواب احمد بخش خاں کا ذکر مناسب الفاظ میں نہیں کیا ہے۔ نواب احمد بخش خاں نے انتہائی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی جائیداد اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی۔ فیروز پور جھرکہ کا علاقہ نواب شمس الدین خاں کو اور لوہارو کا علاقہ نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو دیا۔

نواب احمد بخش خاں کے انتقال پر نواب شمس الدین خاں نے اس تقسیم کے خلاف آوازہ بلند کیا اور سرکار انگریزی میں مستدعی ہوئے کہ میں خلف اکبر ہونے کی حیثیت سے فیروز پور جھرکہ کا بلا شرکت غیر حق دار ہوں۔ فرانسس ہاکنس نے اپنی ریذیڈنسی کے زمانے میں ان کی اس استدعا کی توثیق کر دی اور ان کو ان کے بھائیوں کا علاقہ یعنی لوہارو بھی

دلا دیا، جس پر نواب امین الدین احمد خاں نے ۱۸۲۴ء میں کلکتہ جا کر عدالت العالیہ میں اپیل کی۔ اس اپیل کا فیصلہ نواب شمس الدین خاں کے خلاف ہوا اور اس کے کچھ دنوں بعد ۲۲؍ مارچ ۱۸۳۴ء کو کسی نامعلوم شخص نے دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ لوگوں میں مختلف قسم کی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ خوش حال گوجر، بلاقی جمعدار، سنگین بیگ کوتوال، حمایت علی، اودیا، منولال، آغا جان اور اسی قسم کے دوسرے جاہ طلب افراد انعام و اکرام کے لالچ میں تحقیقاتی افسروں سے مل گئے اور ان کو جھوٹی رپورٹیں پہنچا کر اس امر کا یقین دلانا شروع کیا کہ ریذیڈنٹ ولیم فریزر کو نواب شمس الدین خاں کی انگیخت پر ان کے ملازم کریم خاں نے ہلاک کیا ہے۔ مقدمہ کی ابتدائی سماعت کے بعد کریم خاں کو پھانسی دی گئی۔ اس کے بعد نواب شمس الدین خاں کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ ۹؍ اگست ۱۸۳۴ء کو شائع ہونے والے سلطان الاخبار کی اطلاع کے مطابق عدالت گواہوں سے جو چاہتی انگریزی میں لکھوا لیتی تھی۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے اس لیے ان کو اس امر کا پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ نواب شمس الدین خاں کے خلاف بیان دے رہے ہیں یا ان کی صفائی میں۔ ان فرضی اور جعلی بیانات کا سلسلہ ختم ہونے پر عدالت کی جانب سے پھانسی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلہ کا علم ہونے پر نواب شمس الدین خاں نے اسفندیار بیگ کو اپنا وکیل بنا کر کلکتہ بھیجا، لیکن اس سے پہلے کہ کلکتہ میں اس فیصلے پر نظر ثانی کی جاتی، سزا کو بحال رکھا گیا۔

انگریزوں کو خدشہ تھا کہ اگر نواب شمس الدین خاں کو پھانسی دی گئی تو پورا شہر مشتعل ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے پھانسی دیئے جانے سے ایک روز قبل یعنی ۷؍ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو ہی احتیاط کے طور پر اور شہریوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے موری دروازہ اور کشمیری دروازہ درمیانی علاقہ میں تین ہزار مسلح سپاہیوں کو متعین کر دیا اور جگہ جگہ بھاری توپیں نصب کرا دیں۔ ان تمام اقدامات کے مکمل ہونے پر ۸؍ اکتوبر کی صبح نواب شمس الدین خاں کو پھا

میں بٹھا کر قتل گاہ میں لایا گیا۔ اس وقت ان کے چہرے پر کسی قسم کا تکدر یا ملال نہیں تھا وہ انتہائی فاتحانہ انداز میں قتل گاہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت ایک پادری نے آگے بڑھ کر ان کو عیسائی ہونے کی ترغیب دی، جس پر انھوں نے جواب دیا کہ میں عیسیٰؑ کا منکر نہیں ہوں، جس طرح اہلِ یہود نے ان کو بلا جرم پھانسی دی تھی اسی طرح تم ان کے پیرو ہوتے کے باوجود مجھ کو بلا جرم پھانسی پر چڑھا رہے ہو۔

اس گفتگو کے فوری بعد نواب شمس الدین خاں کو پھانسی کے تختہ پر لایا گیا۔ اس وقت ان کے دونوں ہاتھ پشت کی جانب باندھ دیئے گئے اور گلے میں رسی ڈال کر پھانسی دے دی گئی۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد ان کی لاش کو ان کے ورثا کے حوالے کیا گیا ان کے خسر مرزا افضل بیگ نے ان کی لاش کو غسل دیا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے شاہ محمد اسحاق نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی، جس میں آٹھ ہزار افراد شریک ہوئے۔ اردو کے مشہور شاعر نواب مرزا داغ ان ہی کے صاحبزادے ہیں جن کی والدہ نے اپنے شوہر کی شہادت کے بعد مرزا فخرو ولی عہد بہادر شاہ ظفر سے نکاح کر لیا تھا۔

(دیباچۂ دیوان معروف، آجکل فروری ۱۹۵۷ء

کلیاتِ نثر غالب ص۱۰۸، واقعات دارالحکومت دہلی دوم

ص۹۲، ص۴۹۳، تاریخ صحافت اردو ص۱۰۱)

غلام امام شہید

شاہ غلام محمد کو لکھنؤ کے قصبہ امیٹھی کے مشاہیر میں شمار کیا جاتا تھا۔ غلام امام شہید ان ہی کے صاحبزادے تھے۔ انھوں نے مولوی حیدر علی منتہی سے علوم متداولہ کی تحصیل کی اور شاعری میں قتیل، مصحفی وغیرہ سے مشورہ لینے لگے، پھر الہ آباد پہنچ کر صدر نظامت میں پیشکاری پر مامور ہو گئے اور بیس سال کا طویل ترین

عرصہ اسی عہدہ پر امتیاز و اعتبار کے ساتھ گزارا - اس کے بعد شمس الدولہ نے ایکہزار روپیہ زادِ راہ بھیج کر انھیں حیدر آباد بلا لیا - غلام امام شہید نے حیدر آباد جاتے وقت کچھ دنوں کے لیے دہلی میں بھی قیام کیا اور ایک آدھ مرتبہ غالب سے بھی ملاقات کی غالب نے غلام غوث خاں بے خبر کے نام ایک خط میں لکھا ہے :

" مولوی صاحب (غلام امام شہید) سے میری ایک ملاقات ہوئی جب وہ دلی آئے تھے اور میر خیراتی کے گھر اترے ہوئے تھے شرفا میں تعارف بنائے مودت و محبت ہے چہ جائے آں کہ معانقہ اور مکالمہ اور مشاعرہ واقع ہوا ہو - روز ملاقات سے اس دن تک کہ حضرت دکن کو روانہ ہوں، کوئی امر اب کے باعث ناخوشی کا ہو، درمیان نہیں آیا "

حیدر آباد میں غلام امام شہید کی قدر و منزلت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا - نظام نے چار سو تیس روپے ماہانہ بلا شرط خدمت مقرر کئے تھے - راجہ گردھاری پرشاد باقی اور نواب مختار الملک وزیر اعظم حیدر آباد نے بھی ان کی مختلف طریقوں سے مدد کی اور جب وہ زیارت حرمین شریفین کو جانے لگے تو مناسب زادِ راہ کا بندوبست کیا -

غلام امام شہید نے کافی طویل عمر پائی اور ۱۸۷۶ء میں انتقال کیا - ان کے دوست غلام غوث خاں بے خبر نے ان کے انتقال پر ایک طویل قطعہ تاریخ کہا ہے جس کے اس مصرعہ سے اعداد مطلوبہ برآمد ہوتے ہیں :

ولے امام شعرا و رشد شہید (۱۲۹۳ھ)

نواب صدیق حسن خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب کلب علیخاں والی رامپور، نواب سعید عالم خاں رئیس سورت اور دوسرے امرا غلام امام شہید کی نہایت تعظیم و توقیر کرتے تھے، اکبر آباد، لکھنؤ، رام پور، مراد آباد، الہ آباد اور حیدر آباد

ہیں ان کے ارادت مندوں اور شاگردوں کی کمی نہیں تھی۔

ان کو نعت شریف لکھنے اور پڑھنے کے علاوہ کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس بنا پر مداحِ نبی اور عاشقِ رسول کے مبارک القاب سے یاد کیے جاتے ہیں، ان کا لکھا ہوا مولود شریف اس قدر مقبول ہوا کہ اب اس کی اشاعتوں کا شمار ممکن نہیں، اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں "انشائے بہار بے خزاں"، کلیات شہید اور دیوانِ قصائد و غزلیات یادگار ہے۔ انھوں نے روضہ تاج گنج کا حال بھی پرانے ڈھنگ کی نثر میں لکھا تھا۔

(شمع انجمن صفحہ ۲۳۳ تا صفحہ ۲۳۶ - خطوط غالب صفحہ ۳۲۶
تاریخ ادب اردو صفحہ ۹ - داستان تاریخ اردو صفحہ ۲۶ صفحہ ۲۹۹)

اکبر شاہ ثانی شعاع

شاہ عالم ثانی کے عہدِ حکومت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو لال قلعہ دہلی پر اس قدر تصرف حاصل ہو گیا تھا کہ لوگ بادشاہ کی بجائے اسی کو عملی طور پر حکمران خیال کرنے لگے تھے۔ اکبر شاہ ثانی، شاہ عالم ثانی کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کا سالِ ولادت ۱۷۵۹ء ہے۔ شاہ عالم ثانی ۸ر نومبر ۱۸۰۶ء کو انتقال کر گئے تو اکبر شاہ ثانی کا جشنِ تخت نشینی انتہائی دھوم دھام سے منایا گیا۔ انگریزوں نے قلعہ معلّٰے میں حاضر ہو کر نذریں گزرانیں۔ مولانا امام بخش صہبائی نے قطعہ تاریخ جلوس کہا:

بسر چو کردہ لباسِ خلافتِ اکبر شاہ
بشرفِ دولت و اقبال عزت و ناموس
سروشِ غیب زروئے ہدیہ یک ناگاہ

جہیز عشرت پرویز گفت سال جلوس

اس کے چند ہی سال بعد اکبر شاہ ثانی نے اپنی چہیتی بیگم ممتاز محل کے بیٹے مرزا جہانگیر کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا چاہا۔ انگریزوں نے اسے ناانصافی پر محمول کیا۔ یہ بات مرزا جہانگیر کو بری لگی۔ وہ اپنے مزاج میں شورش پسند تھے۔ انہوں نے اپنے ملازموں کو مسلح کر کے فساد کرنا چاہا۔ ایک دن انگریز رزیڈنٹ آرچبولڈ سٹیلین ان کو سمجھانے کے لئے قلعہ معلٰی میں داخل ہو رہے تھے کہ انہوں نے ان پر گولی چلادی اور دروازہ بند کر لیا۔ بعد میں آرچبولڈ سٹین نے اپنے سپاہیوں کی مدد سے دروازہ توڑ کر ان کو گرفتار کر لیا اور وہ گولی چلانے کے الزام میں الٰہ آباد کے قلعہ میں نظر بند کر دیئے

اس واقعہ کے پیشِ نظر گورنر جنرل لارڈ منٹو نے ان تمام سیاسی حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو انگریزوں اور شاہ عالم ثانی کے درمیان ایک معاہدہ کی رُو سے طے پائے تھے۔ اس کے برعکس اس نے شاہی اخراجات کے لئے صرف ۹۰ ہزار پانچسو روپے ماہانہ وظیفہ کی منظوری دی۔ یہ وظیفہ حد درجہ ناکافی تھا۔ تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے۔ شہزادوں کو جو قلعہ کے نو محلے میں رہتے تھے ماہانہ روپیہ نہیں ملتا تھا۔ وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ ہم بھوکے مرتے ہیں۔ اس صورتِ حال نے اکبر شاہ ثانی کو مجبور کیا کہ وہ کلکتہ سے راجہ رام موہن رائے کو دہلی بلا کر اپنا مختار بنائیں اور لندن روانہ کریں۔ انگریزوں کو جب اکبر شاہ ثانی کے ارادے کا پتہ چلا تو انہوں نے راجہ رام موہن رائے کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے لندن میں اکبر شاہ ثانی کے مطالبات پیش کئے تو اچھا نہیں ہوگا۔ جس کے نتیجے میں راجہ رام موہن رائے نے ایک عام شہری کی حیثیت سے لندن جا کر مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ انگریزوں نے راجہ رام موہن رائے سے بہت کچھ وعدے کئے لیکن اس سے پہلے کہ یہ وعدے ایفا ہوتے، راجہ رام موہن رائے کا

۱۸۳۲ء میں انتقال ہوگیا۔

اس واقعہ کے دو سال بعد مارچ ۱۸۳۵ء میں لال قلعہ کے رہنے والوں نے جشنِ نوروز بڑی شان و شوکت سے منایا۔ ان دنوں لال قلعہ والوں سے غالب کے تعلقات استوار ہو رہے تھے۔ انہوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک طویل قصیدہ کہا اور ان کی نذر گزرانا۔ اس قصیدہ کے چند شعر یہ ہیں:-

دریں زمانہ کہ کلکِ رصد نگار رقم
ہزار و دو صد و پنجاہ راند در تقویم

اواخرمہ ذیقعدہ خسروِ انجم
فزود شانِ حمل را بہ فرّہِ دیہیم

سحر ز نور رقیبانہ بر کشاد بساط
شب از نہیب غریبانہ در نوشت گلیم

دریں بہار کہ تردستیٔ ہوائے بہار
نشاط رانہ بہ اندازہ مے کند تقسیم

ابھی نوروز کا یہ جشن ختم ہی ہوا تھا کہ انگریزوں نے کمپنی بہادر کا سکّہ جاری کر دیا اور مغل حکمران کی حیثیت ایک وظیفہ خوارِ محض ہو کر رہ گئی۔ اکبر شاہ ثانی کو اس واقعہ سے جتنا بھی صدمہ ہوتا کم تھا۔ غالباً وہ اسی صدمے کو برداشت نہیں کر سکے اور ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۲ھ کو قطب صاحب میں فوت ہو گئے۔ سرسید احمد خاں نے تخرجہ کے ساتھ ان کا قطعہ تاریخِ وفات کہا ہے:

چوں رفت از جہاں شہِ اکبر
شد سیہ آسماں ز دودِ جگر

پائے شادی شکست واحمد گفت

سالِ تاریخ او غنیم اکبر

اکبر شاہ ثانی کی شاعری کا کئی تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے والد شاہ عالم ثانی کے تخلص آفتاب کی مناسبت سے اپنا تخلص شعاعؔ رکھا تھا۔ ان کے دربار سے امام بخش صہبائیؔ، نظام الدین ممنونؔ، غالب علی خاں غالبؔ اور اسی قسم کے دوسرا متعدد شعراء وابستہ تھے۔ اکبر شاہ ثانی کا کلام نہیں ملتا ہے۔ عبدالغفور نساخ اور قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکروں میں ان کے یہ دو شعر نمونے کے طور پر درج کئے ہیں :-

تجھ زلف کے سودے سے یہ دل کیونکر برآوے
تا حشر نہ چھوٹے یہ بلا جس کے سر آوے
واں یار شعاعؔ ذرہ نمط ہم کو کہاں ہے
دن رات جہاں مجرے کو شمس و قمر آوے

(جلوۂ خضر ص ۲۰۳، سخن شعراء ص ۲۳۷،
سیرت فریدیہ ص ۱۰۴، ۱۰۶، بہادر شاہ ظفر ص ۶۳،
کلیات غالب فارسی دوم ص ۳)

سید اکبر علی شیون

سید اکبر علی شیون کا پہلا تخلص حافظ تھا۔ وہ مفتی محمد اکرام الدین کے بھانجے تھے۔ میر احمد حسین میکش سے ان کی دوستی تھی اور میکش ہی کے ذریعے ان کا غالب سے تعارف ہوا تھا۔ سید اکبر علی شیون کو علوم متداولہ میں تدقیق و تحقیق سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ وہ شعر گوئی کے سلسلہ میں طرزِ دل پسند کے قائل تھے قادر بخش صابر نے ان کو تہذیب واخلاق میں یکتائے روزگار اور حلم وبردباری

میں شہرہ آفاق بتایا ہے ۔ جن دنوں احمد حسین میکش کا قیام لکھنؤ میں تھا وہ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے غالب کے پاس آتے اور ان سے ملاقات کرتے تھے ۔ اس کا پتہ غالب کے ایک خط سے ملتا ہے جو انہوں نے میر احمد حسین میکش کو لکھا تھا ۔ لکھتے ہیں ۔

"آج کہ جمعہ کا دن اور ماہ محرم ۱۲۶۰ھ کی چوتھی تاریخ ہے مخدومی و مولائی حافظ سید اکبر علی شیون مجھ سے ملنے آئے تھے ۔ کہنے لگے کہ کل میکش کو خط بھیج رہا ہوں، چنانچہ میں نے بھی دو چار سطریں لکھ کر سید صاحب موصوف کو دے دیں کہ اپنے خط میں رکھ کر تمہیں بھیج دیں "

اس واقعہ کے تین سال بعد ۱۲۶۸ھ میں سید اکبر علی شیون کا انتقال ہوگیا ۔ اور ان کی میر احمد حسین میکش سے ملاقات نہ ہوسکی ۔ قادر بخش صابر کے بیان کے مطابق قرشی کی طب پر لکھی ہوئی ایک کتاب موجز کا عام فہم فارسی میں ترجمہ کیا تھا ۔ بالعموم شعر بھی فارسی ہی میں کہتے تھے ۔ ان کے نتائج افکار سے یہ چند شعر پیش کئے جاتے ہیں ۔

کشتۂ تیغ نگاہِ تو بہ خوں می غلطید
جاں ہمی داد و دگر زخم تمنا می کرد

دین و ایماں ہمہ درباخت بہ غمزۂ او
شیون از بے خردی دعویٰ تقویٰ می کرد

کلک قضا کہ نقطۂ مشکیں بدل گذاشت
آں را بروئے مہر بتاں انتخاب کرد

شد بندۂ کسے کہ گرفتن بہ بندگی
باید بہ حال زار زلیخا گریستن

آبے بروئے کار نیاورد گریہ ات
اے دیدۂ شرم باد بہ بے جا گریستن

گلستان سخن اول صد ۱۰۱ صد ۱۰۲ ۔

سبد باغ دو در صد ۱۶۳

انور الدولہ شفق

انور الدولہ نواب سعد الدین بہادر کا تخلص شفق اور خطاب سعید الملک اور صولت جنگ تھا۔ وہ رئیس کالپی نواب احمد بخش خاں بے تاب کے صاحبزادے اور نواب ناصر الدولہ بہادر ناصر کے پوتے تھے۔ نواب ناصر الدولہ بہادر ناصر کے والد نواب عماد الملک غازی الدین خاں نظام کو میر تقی نے یگانۂ روزگار لکھا ہے اور بتایا ہے کہ وہ پانچ چھ خط خوش نویسی کے بخوبی لکھتے ہیں، ریختہ اور فارسی دونوں میں بامزہ شعر کہتے ہیں،

انور الدولہ شفق کی بھی رہائش کالپی میں تھی، سید امجد علی قلق لکھنوی ان کی خواہش پر کالپی میں رہتے تھے۔ انور الدولہ شفق نے ابتدا میں اپنے کلام پر ان ہی سے اصلاح لی، لیکن بعد میں خط وکتابت کے ذریعہ غالب کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ غالب کو ان سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔ وہ ان سے ملاقات کی دن رات دعائیں مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ اے خدا جب تک انور الدولہ سے نہ مل لوں، میری روح قبض نہ کرنا۔

انور الدولہ بہت پختہ مشق شاعر تھے۔ ان کے کلام کی غالب نے بھی اپنے خطوط میں جابجا تعریف کی ہے۔ ان کا سال انتقال ۱۲۹۰ھ ہے۔ ان کی تصانیف میں ایک رسالۂ نثر، ایک دیوان اور ایک مثنوی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا میلاد نامہ منظوم مخزن سعادت کے نام سے ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔

سخن شعرا کے مولف کے بیان کے مطابق انور الدولہ شفق کے چھوٹے بھائی خواجہ نور الدین بھی شفق اور فروغ تخلص کرتے تھے۔ انور الدولہ کا نمونۂ کلام یہ ہے:

شب جو دل گرم فغاں یاد بت پرفن میں تھا ... نالۂ ناقوس کا عالم مرے شیون میں تھا

کریں امید وفا خاک اہل محفل سے ... صراحی مے کی جو رونے لگی ایاغ ہنسا

کس نے روئے آتشیں دھویا ہے اپنا آب میں ... شعلۂ جوالہ کا عالم ہے گرداب میں

یادہے چشمۂ خنجر کی روانی مجھکو! — کر دیا نزع میں کس لطف سے پانی مجھ کو

آرزو اتنی ہے میری ساقیٔ ایام سے — جب مرا پیمانۂ پر ہو منھ لگا ہو جام سے

حوصلے دل میں تڑپنے کے ہیں کیا کیا دیکھئے — ذبح کر کے رقص بسمل کا تماشہ دیکھئے

گھر سے وحشت میں نکلتے ہی وطن بھول گئے — یہ فضا دشت کی دیکھی کہ چمن بھول گئے

(گلستان سخن ص۳۶۰ ، بزم خانۂ جاوید پنجم ص۲۰۶ ،
سخن شعراء ص۲۳۸ ، ص۲۳۹ ، ص۲۵۰ ، ص۲۶۶ ،
خطوط غالب ص۱۵۵ ، ذکر میر ترجمہ ص۱۵۲)

شیو دھان سنگھ والیٔ الور

راجگان الور راجپوتوں کے ایک فرقہ نروسے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کے خاندان کا بانی راوٴ پرتاب سنگھ تھا ۔ اس کے کوئی اولاد نہیں تھی ۔ اس کے انتقال پر اس کا متبنیٰ لڑکا راوٴ بختاور سنگھ مسند نشین ہوا ۔ اس نے اپنی مسند نشینی کے بعد انگریزوں سے درخواست کی کہ وہ اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیں، چنانچہ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے اسی کو اپنی سرپرستی میں لے لیا ۔ اس سلسلہ میں ریاست اور برطانوی حکام کے درمیان ایک معاہدہ بھی طے پایا ۔ بختاور سنگھ نے ۱۸۱۵ء میں انتقال کیا ۔ اس کے انتقال پر وراثت اور مسند نشینی ایک سنگین مسئلہ کی صورت اختیار کر گئی ۔ راجپوت بختاور سنگھ کے متبنیٰ لڑکے بنے سنگھ کے طرفدار تھے اور نواب احمد بخش خاں لوہارو بلونت سنگھ کے ۔ بالآخر بنے سنگھ کو خطاب راجگی ملا اور بلونت سنگھ کو انصرام ریاست ۔ اس وقت یہ دونوں مدعی نابالغ تھے، اس لئے بعد میں بھی یہ مسئلہ باقی رہا جس پر ریاست تقسیم کر دی گئی ۔ بلونت سنگھ لاولد مر گیا جس پر اس کی ریاست بھی بنے سنگھ کے حصہ میں آگئی ۔ بنے سنگھ نے ۱۸۵۷ء میں انتقال کیا ۔ شیو دھان سنگھ اسی کے بیٹے تھے ۔ وہ مسند نشین ہوتے ۔ ان کی بھی کوئی اولاد نہیں تھی

انھوں نے ۱۸۷۴ء میں انتقال کیا۔

شیودھان سنگھ ادیب اور شاعر نہیں ہونے کے باوجود علم دوست اور ادب پرور تھے۔ اس کا اندازہ ان کے دور کے شائع ہونے والے اخبارات کی بعض اطلاعات سے بھی ہوتا ہے۔ کانپور سے ہر سہ شنبہ کو شائع ہونے والے شعلۂ طور نے اپنی ۳ر جنوری ۱۸۶۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے:

"راؤ راجہ صاحب والیٔ الور کو آجکل شعر و سخن کا بہت شوق ہے ہر ہفتہ میں ایک مشاعرہ ہوتا ہے اور چند شاعر دہلی سے بھی طلب کیے جاتے ہیں ان کی تنخواہیں بھی بیش قرار مقرر ہو گئی ہیں۔ راجہ صاحب کو ترویج علوم کی طرف نہایت توجہ ہے۔ ذوق شعر و سخن بھی دلیل کمال توجہ علوم ہے کہ شاعری میں جمع فنون کے اصطلاحات معلوم ہوتے ہیں"

غالب کے والد عبداللہ بیگ خاں الور جا کر بختاور سنگھ کی فوج میں ملازم ہوئے تھے اور وہیں کسی لڑائی میں جان دی تھی، غالب کو اس اعتبار سے راجگان الور کیساتھ دور کا سہی کچھ تعلق ضرور تھا، جس کی وضاحت انھوں نے ذکا کے نام ایک خط میں کی ہے

"باپ میرا عبداللہ بیگ خان بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر چار سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی، والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا"

غالب نے شیودھان سنگھ والیٔ الور کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کے ان شعروں میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہم گرچہ ز بند دولت گنی جلوس   آدم بہ نذر سلک گہر ہائے شاہوار

چون من گہر فروش نباشد بہر بساط — چون من سخن سرائی نخیزد زہر دیار
پیرم کہ دل بہ طبع جوانان گران نیم — غم خوردنم نہفتہ دمی خوردن آشکار
گفتار من جو فر جمال تو دلفروز — افکار من چو رائی رزین تو استوار
تقویم سال نیست خط بندگی من — کز کہنگی فرو فتد از اوج اعتبار
آں خط لطیفہ ایست کہ امسال در جہاں — خوشتر ز پار و پار بود خوشتر از پرار
از روی راستی بود آن خط الف مثلی — سالست نقطہ در نظر مرد ہوشیار
ہر سال قدر آن شود افزوں کہ با الف — یک نقطہ دہ دو نقطہ صد و سہ شود ہزار
زان پس کہ گشت گوہر من در جہان یتیم — زان پس کہ کشتہ شد پدر من بکارزار
در بچگی شدہ ام چاکر حضور ، — رنگین سخن طرازم و دیرین وظیفہ خوار
دارم بگوش حلقہ ز پنجاہ و ہشت سال — اکنون کہ عمر شصت و سہ سالست از شمار

(صحیفۂ زریں ص ۶۳ ، خطوط غالب ص ۳۴۲

ہفتہ وار شعلۂ طور کانپور ۳ رجنوری ۱۸۶۵ء

تاریخ صحافت اردو جلد سوم ص ۱۳۸ ،

کلیات غالب دوم ص ۲۳۵)

صاحب عالم مارہروی

حضرت شاہ برکت اللہ مارہرہ کے باکمال بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے ۱۱۴۲ھ میں انتقال کیا۔ انتقال کے بعد ان کی جاگیر ان کے دو بیٹوں میں تقسیم ہو گئی جن کے خاندان سرکار کلاں اور سرکار خورد کہلانے لگے۔ صاحب عالم کے والد سید خورشید علی بلگرامی عرف پیارے صاحب سرکار خورد کے سجادہ نشین تھے۔

صاحب عالم ۲۶ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے

غالب کے دریافت کرنے پر ان کو بتایا تھا کہ ان کا سال ولادت لفظ تاریخ سے برآمد ہوتا ہے۔ صاحب عالم کی تعلیم و تربیت کس نہج پر ہوئی۔ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا۔ مرزا محمد عسکری نے مولانا احسن مارہروی کے حوالے سے بتایا ہے کہ صاحب عالم نے ابتدائی تعلیم فرخ آباد میں پائی اور مارہرہ چلے آئے۔ ان کو عربی اور فارسی پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ علوم تصوف اور اشتغال درویشی کے علاوہ شعروشاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے اور ان کا تخلص صاحب تھا۔ ان کے اساتذہ میں مرزا محمد حسن قتیل اور سید افتخار علی بلگرامی قابل ذکر ہیں جو اُن کے حقیقی ماموں تھے۔

صاحب عالم اور غالب میں غائبانہ دوستی تھی۔ غالب ان سے ملاقات کے لئے متمنی رہتے تھے۔ صاحب عالم نے بھی ان کو بارہا مدعو کیا، لیکن ہر دفعہ کوئی نہ کوئی ایسی مجبوری نکل آتی کہ غالب کو معذرت خواہ ہونا پڑا۔ غالب نے ان کے اور اپنے تعلقات کو نسبت اویسی قرار دیا ہے۔ صاحب عالم انتہائی بدخط تھے۔ غالب کو ان کی تحریر پڑھنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ وہ بعض اوقات ان کے خط پوری طرح پڑھ بھی نہیں پاتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے ایک شاگرد چودھری عبدالغفور سرور کو بار بار تاکید کی کہ وہ پیرومرشد کے ارشادات کو ایک اور کاغذ پر اپنے ہاتھ سے نقل کرکے بھیج دیا کریں۔

صاحب عالم کا ۲ محرم الحرام ۱۲۸۸ھ کو انتقال ہوا اور وہ اپنے جدِ امجد حضرت شاہ برکت اللہ کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ روضۃ الکرام کے مؤلف نے ان کی تاریخ انتقال ۲۰ محرم بتائی ہے۔ عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ میں ان کا یہ شعر درج کیا ہے

ضعف سے حال یہ پہنچا ہے اسیروں کا ترے　　قوتِ نالہ نہیں، طاقتِ فریاد نہیں

(جلوۂ خضر دوم ص۲۰۰، قاموس المشاہیر ص۲۵،
سخن شعرا، آج کل فروری ۱۹۵۶ء)

خواجہ صدرالدین

غالب نے غلام غوث خاں بے خبر کے نام بعض خطوط میں خواجہ صدرالدین کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "کل میرے شفیق مکرم منشی نواب جان کلبۂ احزاں میں تشریف لاتے آپ کا سلام کہا، معلوم ہوا ہے کہ خواجہ صدرالدین صاحب لشکر کے ساتھ گئے ہیں اور آپ یہیں ہیں"

ہم کو خواجہ صدرالدین کے تفصیل حالات کا علم نہیں ہے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ غلام غوث خاں بے خبر کے منجھلے ماموں تھے اور گورنر کے دفتر میں ان کی تعیناتی تھی غالب نے ان کو اپنا قدردان اور مہربان بتایا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ان کا انتقال جنوری ۱۸۶۶ء میں یا اس سے کچھ پہلے ہوا ہے۔ اس کی تائید غلام غوث خاں بے خبر کے ایک خط سے ہوتی ہے جو انھوں نے حافظ نظام الدین کو لکھا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق "میرے منجھلے ماموں جناب خواجہ صدرالدین مغفور نے ایک مہینہ ہوا اس جہان سے انتقال کیا"۔ غالب نے خواجہ صدرالدین کی رحلت کی خبر سنی تو ۱۰/ جنوری ۱۸۶۶ء کو ایک خط کے ذریعہ غلام غوث خاں بے خبر کو یوں پرسہ دیا:

"خواجہ صاحب کی رحلت کا اندازہ بقدر قرب و قرابت آپ کو اور بہ اندازہ مہر و محبت مجھ کو۔ وہ مغفور میرا قدردان اور مجھ پر مہربان تھا۔ حق تعالیٰ اسکو اعلیٰ علیین میں بہ سبیل دوام قیام دے۔"

(عودِ ہندی صـ ۲۴۳ صـ ۲۴۴)

فرزند احمد صفیر بلگرامی

فرزند احمد نام اور صفیر تخلص تھا۔ عبدالملک آروی کے بیان کے مطابق ان کا سلسلۂ نسب

سید احمد بن سید غلام یحییٰ بن سید بندہ علی بن سید خورشید علی سے ہوتا ہوا سید عبدالحکیم بن سید ابوالقاسم بن سید خان محمد بن محمد کی وساطت سے سید محمد حضرا فاتح بلگرامی تک پہونچتا ہے جو عیسیٰ موتم الاشبال بن زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسین کی اولاد میں سے تھے۔

صفیر ۲۰ ذیقعدہ ۱۲۴۹ھ کو اپنے ننہال مارہرہ میں پیدا ہوئے۔ شمس الضحیٰ سے سالِ ولادت برآمد ہوتا ہے۔ ایک سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ بلگرام اور چار سال کی عمر میں آرہ پہونچے۔ صفیر کے خاندان میں کئی پشتوں سے شعر و شاعری کا ذوق چلا آرہا تھا جس کے نتیجہ میں انہوں نے چودہ سال کی عمر ہی سے شعر موزوں کرنا شروع کر دیے۔ ابتداء میں اپنے پھوپھا سید محمد مہدی خبر سے اصلاح لی۔ بعد میں لکھنؤ جاکر امان علی سحر کے شاگرد ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مرثیوں پر مرزا سلامت علی دبیر سے بھی اصلاح لی۔ ۱۸۶۲ء سے اپنے نانا صاحب عالم مارہروی کے مشورہ پر اپنا اردو اور فارسی کلام بغرضِ اصلاح غالب کے پاس بھیجنے لگے۔ ۱۸۶۰ء میں اپنے ماموں شاہ عالم شائق مارہروی کے ساتھ دہلی پہونچ کر غالب سے ملاقات کی اور تین ماہ تک ان کے ساتھ قیام کیا۔ غالب نے ان کے ایک رسالہ تذکیر و تانیث کے دیباچہ میں ان کی بڑی تعریف کی ہے

سیدی سندی نورِ بصر لختِ جگر قرۃ العین اسد مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبداء فیاض سے اس رسالہ کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی سبحان اللہ تانیث و تذکیر کی تقریر کلاً او ز مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے کس لطف سے ادا ہوتی ہے۔

اس دیباچہ کے علاوہ غالب کے کئی خط صفیر کے نام ملتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں صفیر کے ایک پوتے سید وصی احمد بلگرامی نے اپنے ایک مضمون س ش م کے نام سے ندیم گیا کے بہار نمبر میں غالب کا ایک ایسا خط بھی شائع کیا ہے جسے قاضی عبدالودود نے مکمل دلائل کے ساتھ جعلی ثابت کیا ہے۔ صفیر غالب کے انتقال کے بعد غلام حسنین قدر بلگرامی کے شاگرد ہوئے جس کی وجہ سے

ان کا وہ رنگِ شاعری ایک بار پھر ابھر گیا جو امان علی سحر کی بدولت پیدا ہوا تھا۔ عبدالملک آروی نے درست لکھا ہے کہ،

"اگر صفیر غالب جیسے شفیق استاد سے اصلاح لیتے تو یقیناً آج بہار کے سب سے بڑے شاعر ہوتے۔ لکھنؤ کی شاعری نے ان کے اندر پریشاں نظری اور ادبی گمراہی پیدا کر دی۔"

صفیر نے ۱۲ر رمضان ۱۳۰۷ھ کو آرہ میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ شہر رمضان المبارک سے ان کا سالِ وفات نکلتا ہے۔ انہوں نے پہلی شادی بلگرام میں اور دوسری آرہ میں کی۔ ان کی پہلی بیوی کے بطن سے نور احمد اور دوسری بیوی کے بطن سے غنی حیدر اور ولی حیدر پیدا ہوئے جن کی اولاد ہند و پاکستان کے بعض شہروں میں دادِ علم دے رہی ہے۔

صفیر کی تصانیف کی صحیح تعداد کیا ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ ان کی تصانیف کا بہت بڑا حصہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں بوستانِ خیال کا اردو ترجمہ، خمخانۂ صفیر، صفیر بلبل، تاریخ بلگرام، معراج الخیال اور تذکرہ جلوۂ خضر کی جلد اول و دوم مشہور ہے۔

صفیر کی شاعری میر، غالب، ناسخ اور داغ کی تتبع اور تقلید سے عبارت ہے ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

فرطِ دعائے جنت و حور و قصور سے
خم ہو کے شیخ صورتِ مہتاب ہو گیا

محفل میں اس کے آتے ہی لوگ اور چلے گئے
میں نامرادِ منتِ درباں میں رہ گیا

حسن اور عشق کا چرچا رہا دیوانوں تک
سب یہ ساماں تھا ترے بے سر و سامانوں تک

ان دنوں بوسوں کی بے باقی لگاتے جاتے
ورنہ سابق میں حساب آپ کا بیباق رہا

گدگداتے تھے جو ہم کہتے تھے وہ !
دیکھیے اب یہ مرا ہاتھ آیا

پھل جوانی کا ملے غیرتِ گلشن کب تک
دیکھیے ابھرے پری رُو ترا جوبن کب تک

بے وجہ نہیں آپ الگ پھرتے ہیں ہم سے
کچھ جوڑ مقرر کسی استاد نے مارا

(خم خانۂ جاوید جلد سوم ص ۳۳۹، ص ۳۴۱ ، آب بقا ص ۹۰، ص ۹۱ ،
مقام محمود ص ۹۰، ص ۹۸ ، تلامذہ غالب ص ۱۹۳، ص ۱۹۶ ،
بہار اور اردو شاعری ص ۱۱۵، ص ۱۲۰ ، خطوط غالب ص ۴۳۵
آج کل فروری ۱۹۵۷ء)

صوفی منیری

صوفی منیری کا پورا نام سید ابو محمد جلیل الدین حسین عرف شاہ فرزند علی تھا۔ ان کے مورث اعلیٰ دانش مند نیشاپوری تھے جنکے اہل خاندان نے نیشاپور سے ہجرت کی تھی اور پٹنہ آکر آباد ہوئے تھے۔ صوفی منیری کا سلسلۂ نسب والدہ کی طرف سے مخدوم شاہ جلیل الدین برادر مخدوم الملک شاہ شرف الدین خلف مخدوم یحییٰ منیری تک پہنچتا ہے۔

صوفی منیری کی تاریخ ولادت ۹ شوال ۱۲۵۲ھ ہے۔ اس وقت ان کے بھائی اور نانہالی رشتہ دار پٹنہ کے مشہور قصبہ منیر شریف میں اقامت گزیں تھے۔ اس بنا پر صوفی منیری کی تمام تر تعلیم و تربیت وہیں ہوئی اور وہ اسی وجہ سے منیری کہلاتے۔ انکے

اساتذہ میں مولوی حسام الدین حیدر اور مولوی فیض اللہ کا نام قابل ذکر ہے جن سے انھوں نے اسلام پور میں عربی اور فارسی پڑھی۔

صوفی منیری نے ۶ رذیقعد ۱۳۱۸ھ کو انتقال کیا۔ ان کی اولاد میں پہلی بیوی سے سید شاہ عبدالقادر حاجی شاہ محمد عمر عامر اور شاہ علی کمال کے علاوہ دو صاحبزادیاں ہوئیں اور دوسرے بیوی سے شاہ اسداللہ ہوئے۔

صوفی منیری اردو اور فارسی کے قادر الکلام اور باکمال شاعر تھے۔ ان کی متعدد اردو اور فارسی تصانیف کی موجودگی میں اس امر سے انکار ممکن نہیں، ان کی دو غیر مطبوعہ مثنویاں روشن عشق اور کشش عشق رسالہ اردو ۱۹۵۰ء میں شائع ہو چکی ہیں، مطبوعہ تصانیف میں لوا الحمد کا نام خاصہ مشہور ہے۔

صوفی منیری اور غالب میں کب روابط پیدا ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ صوفی منیری نے ۲۲ رذی الحجہ ۱۲۸۲ھ کو منیر شریف سے اصلاح کے لئے چند اردو مثنویاں اور ایک قصیدہ تلمذ کی استدعا کے ساتھ غالب کو ڈاک کے ذریعے ارسال کیا تھا۔ غالب نے ان کی سیادت اور بزرگی کے پیش نظر ان کو جس قسم کے خط لکھے ہوں گے۔ ان کا اندازہ غالب کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے صوفی منیری کی استدعائے تلمذ کے جواب میں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

"زبدۂ اولاد حضرت خیر الانام، قبلہ و کعبۂ مجموعہ اہل اسلام حضرت پیر و مرشد عالی مقام کی خدمت میں فقیر غالب کی بندگی قبول ہو، اپنے ابوالآبا کے بوڑھے غلام کو آپنے اتنا کیوں شرمایا کہ وہ بے چارہ شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ کافی تھا اور ان اشعار کا بھیج دینا اور فکر و اصلاح کی اجازت دینی۔ میری مدح آپ کے غلاموں کو موجب ننگ و عار اور میرے آباؤ اجداد کو ذریعہ عزو افتخار حکم بجالایا۔ دو ایک جگہ املا کی صورت بدل گئی

کہیں مصرع کی جگہ مصرع لکھا گیا بے عاملہ تکلف و تملق آپ کا کلام معجز نظام ہے۔ لفظ عمدہ ترکیب اچھی بلند"

صوفی منیری کے اردو اور فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

جلوے کو تیرے حشر کا کیوں انتظار ہے
جلوہ ترا ہے حشر کا ساماں کہیں جسے

خوش ہوں جنوں سے میں کر وہ کرتے ہیں التفات
ہے جمع عید چاک گریباں کہیں جسے

صوفی بتائے منزلِ جاناں کی راہ کون
اب چپ ہے وہ جرس دلِ نالاں کہیں جسے۔

در سینہ دلِ پنہاں نہ گنجد — رازم بہ درون ازاں نہ گنجد
از قید وجود ہر کہ وارست — در دائرہ جہاں نہ گنجد
ساقی قدحے کہ عجب و پندار — در خاطر مے کشاں نہ گنجد
عشق آمد و حکم عقل برخاست — یک ملک دو حکمراں نہ گنجد

(معارف جون ۱۹۳۲ء ، اردو جولائی اکتوبر ۱۹۵۰ء
خطوط غالب ص ۹۱۶ ، تلامذہ غالب ص ۱۹۶ ، ۱۹۸
احوال غالب ص ۹۱)

امام بخش صہبائی

مولوی امام بخش صہبائی فارسی اور عربی کے جید عالم ہونے کے علاوہ اردو کے بھی زبردست شاعر تھے۔ مرزا قادر بخش صابر نے گلستان سخن میں ان کے خاندان کی طرح

کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان کا سلسلۂ نسب والد کی جانب سے خلیفۂ ثانی حضرت فاروق اعظم اور والدہ کی جانب سے سید عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ صہبائیؔ کے ابتدائی حالات لاعلمی کے اندھیرے میں ہیں، صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن کشمیر تھا اور مولا محمد بخش کے صاحبزادہ تھے۔ انھوں نے عبداللہ خاں علوی سے عربی اور فارسی پڑھی اور ذاتی کوششوں سے اس میں استدراک حاصل کیا۔ بہادر شاہ ظفر ۱۱ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو تخت پر نشین ہوئے تو صہبائیؔ نے چراغ دہلی سے ان کا سال جلوس نکالا۔ ۱۸۴۰ء میں قدیم دہلی کالج میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے مولوی عبدالحق نے مرحوم دہلی کالج میں ان کی تقرری کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"۱۸۴۰ء میں جب آنریبل مسٹر ٹامسن لیفٹیننٹ گورنر بہادر مدرسے کے معائنہ کے لئے آئے تو انھوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کیا کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں اور تیسرے امام بخش صہبائی۔ لیفٹیننٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلایا، مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگے، انھوں نے انکار کر دیا۔ مومن خاں نے یہ شرط پیش کی کہ سو روپے ماہانہ سے کم کی تنخواہ قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا، انھوں نے یہ خدمت چالیس روپے ماہانہ پر قبول کر لی، بعد میں پچاس روپے ہو گئے"

۱۸۵۷ء میں سعی انقلاب ناکام ہوئی اور انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا، جس کے نتیجہ میں جہاں سینکڑوں مسلمان مارے گئے، وہیں صہبائی اور ان کے لڑکے کو بھی گولی مار دی گئی۔ علامہ راشد الخیری نے اس واقعہ کی تفصیل ان کے حقیقی بھانجے میر قادر علی کی زبانی نقل کی ہے:

"میں صبح کی نماز اپنے ماموں مولانا صہبائی کے ساتھ کٹھرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آپہنچے۔ پہلی ہی رکعت تھی کہ امام کے صاف سے ہماری مشکیں کس لی گئیں۔ ہماری بابت مخبروں نے بغاوت کی اطلاعیں سرکار میں دیدی تھیں۔ اس لئے ہم سب گرفتار ہو کے دریا کے کنارے پر لائے گئے۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا کہ موت تمہارے سر پر ہے، گولیاں تمہارے سامنے ہیں اور دریا تمہاری پشت پر ہے۔ تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہیں وہ دریا میں کود پڑیں، میں بہت اچھا تیراک تھا مگر ماموں یعنی مولانا صہبائی اور ان کے صاحبزادے مولانا (عبدالکریم) سوز تیرنا نہ جانتے تھے، اس لئے دل نے گوارہ نہ کیا لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا، اس لئے میں دریا میں کود پڑا۔ پچاس یا ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور وہ صف بستہ گر کر مر گئے۔"

مفتی صدرالدین آزردہ نے جب صہبائی کی شہادت کی خبر سنی تو بے اختیار چیخ اٹھے

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو ‏ ‏ قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اکبرالہ آبادی نے بھی اس واقعہ پر یوں رنج و غم کا اظہار کیا:

وہی صہبائی جو تھے صاحبِ قولِ فیصل ‏ ‏ ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

مولانا صہبائی کی تصانیف کی فہرست بڑی طویل ہے، جسے طوالت کے باعث چھوڑ دیا گیا ہے۔ غالب اور صہبائی میں گہرے تعلقات تھے۔ غالب نے ایک شعر میں ان کو یوں یاد کیا ہے:

مومن و نیر و صہبائی و علوی و نگاہ ‏ ‏ حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

لیکن غالب کے بعض خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اور صہبائی کے تعلقات

میں فرق آگیا تھا اور صہبائی کو قابلِ اعتنا نہیں خیال کرتے تھے۔ اس کی تائید ان کے اس خط سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے نام ۷ فروری ۱۸۷۰ء کو لکھا تھا اور بتایا ہے کہ صہبائی شفق صبح کو غلط اور اس رنگ کو مخصوص بہ شام جانتا ہے۔ اسی طرح غالب نے مولوی عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں رحیم بیگ میرٹھی تلمیذ صہبائی پر یوں نفرین کی ہے:

"وائے اس ہیچ و پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ غرور افتخار ہو"

صہبائی کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

یارب آں کن بہ جنون دل دیوانۂ ما
کہ شود بال پری نالۂ مستانۂ ما

منکر کفر مشو گر سر ایماں داری
کعبہ یک پارۂ سنگ است ز بتخانۂ ما

چوں شرر حاصل ما در گرو دست فناست
برق ما ریشہ کند سر بدر از دانۂ ما

حسن بر آئینہ وقف است دگر واقف نیست
ہمہ بر خویش بود جلوۂ جانانۂ ما

وائے گر ناز عتابش بتغافل ندہد
ہست نشتر بہ کف شوخی افسانۂ ما

جلوہ بر خود غلط و عشق نظر باز غیور
شمع داغ است ز خودداری پروانۂ ما

طرفہ کاں بت برخ کعبہ رواں ہم خندد
دست در گردن غیر است ز جانانۂ ما

عقل می نازد و از سر یقیں آگہ نیست
لغزش جہل بود ہمت فرزانۂ ما

کن آشنائے لب دو سہ حرف عتاب را
از بہر ما دو آتشہ ساز ایں شراب را

رنگ زخم چو گل بہ پرواز می زند
دارم خزاں رسیدہ بہارِ شباب را

دارد اثر ز چین جبیں موج خندہ ات
یک رنگ کردہ ناز تو لطف و عتاب را

امروز تا کرشمۂ لطفش چہ مے کند
رحمت فگندہ است بہ فردا حساب را

چوں شمع آرمیدن عمر است اضطراب
دارد بہ بر درنگ بہارم شتاب را

لبریز حرف شکوۂ دلدار می روم   خواہم دراز مدت روز حساب را
صہبا بیا بہ وسعت رحمت نگاہ کن   یکسو بنہ شمار گناہ و ثواب را

(شمع انجمن ص۲۶۲، تذکرہ اہل دہلی ص۲۰۲
گلستان سخن اول ص۱۳۱، دہلی کی آخری بہار ص۴
مرحوم دہلی کالج ص۱۶۰، خطوط غالب ص۵۸۸، ص۳۳۶)

شمس العلما ضیاالدین خاں

ضیاءالدین دہلوی کے نام غالب کے کئی خط ملتے ہیں۔ خلیق انجم کو اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ضیاءالدین خاں بستی دارا پور کے رئیس سابق کے پوتے تھے —— ضیاءالدین خاں نے علوم عربیہ و دینیہ کی تکمیل مشہور عالم مولوی مملوک العلی نانوتوی اور مفتی صدرالدین آزردہ سے کی۔ بعد میں منشی ذکاءاللہ اور مولوی نذیر احمد کے ساتھ دہلی کالج میں داخل ہوئے اور شمس العلماء کا اعزاز حاصل کیا۔

ضیاءالدین خاں کو ۱۸۶۳ء میں دہلی کالج میں عربی کا مددگار پروفیسر اور پروفیسر مقرر کیا گیا۔ کالج کے بند ہو جانے پر وہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر بنائے گئے ان کو سر ولیم بیٹور کی سفارش پر ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دی، ۱۸۸۷ء میں اسسٹنٹ کمشنری سے وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہونے کے بعد وہ تالیف و تصنیف میں مشغول ہو گئے اور ۱۹۰۰ء سے قبل انتقال کیا۔

مولوی بشیرالدین احمد دہلوی نے ضیاءالدین خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بڑے بھاری ادیب وقت تھے۔ چونکہ ساری عمر سررشتۂ تعلیم میں صرف ہوئی پڑھانے ہی کی دھن رہی، تصنیف و تالیف کوئی نہیں چھوڑی، یہ درست نہیں ہے کیونکہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے مرحوم دہلی کالج میں بتایا ہے کہ افسوس کہ ان کی یادگار

سوائے رسوم ہند کے پہلے حصہ کے کوئی اور نہیں پائی جاتی۔ حال ہی میں ان کی دو تصانیف 'حدیقۃ الارواح اور انشائے اردو' کا پتہ چلا ہے۔

غالب اور ضیاء الدین خاں کے تعلقات ایک زمانے میں انتہائی خوشگوار تھے۔ اس کا اندازہ غالب کے اس خط سے ہوتا ہے:

"کرم از شما و کمی از ما، اچھوں کے ساتھ سب بھلائی کرتے ہیں، بدوں کے ساتھ نیکی کرنی جواں مردی ہے۔ اگر اپاہج نہ ہوتا فوراً آپ کے پاس پہنچتا۔ اب متوقع ہوں کہ آج اس وقت یا اور وقت، مگر آج ہی آپ تشریف لائیں اور ضرور تشریف لائیں، شام تک چشم براہ رہوں گا"

ان تعلقات میں برہان قاطع کی اشاعت کے بعد خلل پڑ گیا۔ جب غالب نے ۲ر دسمبر ۱۸۶۷ء کو قاطع القاطع کے مؤلف مولوی امین پٹیالوی کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کیا تو ضیاء الدین خاں نے مولوی محمد امین الدین کی طرف سے بطور گواہ عدالت میں پیش ہونے کے علاوہ غالب کی انتہائی شدومد سے مخالفت کی۔ اس سلسلے میں مولانا حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ

"جو مولوی امین الدین کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوئے تھے، ان مولویوں کا مرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا حضرت انھوں نے خلاف شہادت کیوں دی؟ مرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا:

ہر آں کہ در نگری جز بہ جنس مایل نیست
عیار بے کسیِ من شرافت نسبی است

(واقعات دار الحکومت دہلی ، غالب کی نادر تحریریں صـ ۶۵
ذکر غالب صـ ۲۲۹ ، یادگار غالب صـ ۴۳
مرحوم دہلی کالج صـ ۱۶۷ ، اردو اپریل ۱۹۴۳ء)

مرزا سعید الدین احمد خاں طالب

مرزا سعید الدین احمد نام تھا لیکن نواب احمد سعید خاں کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے دوسرے بیٹے اور شہاب الدین ثاقب کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۵۲ھ ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا بندوبست خود ان کے والد نے اپنی نگرانی میں کیا۔

نواب احمد سعید خاں کو اپنے والد اور بھائی کی طرح بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ کلام پر غالب سے اصلاح لیتے اور طالب تخلص کرتے تھے۔ غالب کو ان سے اپنے بچوں کی طرح محبت تھی۔ جب ان کو نواب احمد سعید خاں کی خیر و عافیت کی خبر نہ ملتی تو پریشان اور متفکر ہو جاتے تھے۔ جب شہاب الدین ثاقب نے اپنے خطوط میں ان کا ذکر کرنا موقوف کر دیا تو غالب نے ان کو سخت تنبیہ کی۔ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء کو ایک خط کے ذریعے ان کو لکھتے ہیں۔

"تم جو خط لکھتے ہو تو اس میں سعید احمد خاں کا کچھ ذکر نہیں لکھتے، لازم ہے کہ اس کی خیر و عافیت اور اس کی بہن کی خیر و عافیت لکھتے رہا کرو۔"

نواب احمد سعید خاں کا نکاح اپریل ۱۸۷۵ء میں احمد شاہ نواب سردھنہ کی صاحبزادی بادشاہ بیگم سے ہوا۔ اسی سال لیفٹننٹ گورنر پنجاب رابرٹ ایجرٹن نے ان کی خاندانی بزرگی اور عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر مقرر کیا۔ دس سال تک انتہائی دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۸۸۵ء میں ضیاء الدین احمد خاں کا انتقال ہو گیا تو ملازمت سے دل برداشتہ ہو گئے اور علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی دوران دہلی میونسپل کمیٹی نے ان کو اپنا رکن نامزد کیا۔ اخراجات لوہارو سے ملنے والے پانچسو روپے ماہانہ کے وظیفہ سے پورے کرنے لگے۔ واقعات دارالحکومت

دہلی کے مؤلف نے ان کو خوش رو، خوش خو اور خوش خلق بتایا ہے۔ ان کو اچھے گھوڑے اپنی سواری میں رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہو کر بازار سے گزرتے تو ان کو دیکھنے والوں کا ہجوم لگ جاتا تھا۔ شعر خوانی میں بھی انکو انفرادیت حاصل تھی، اکثر شعراء ان کے تحت اللفظ کی نقل کرتے اور ان ہی کے انداز میں اپنا کلام سناتے تھے۔

آخر عمر میں ان کے پاؤں میں ورم آگیا تھا جس کی وجہ سے ان کے لئے چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔ معذوروں کی طرح رہنے لگے۔ اسی حالت میں ۴ ذی الحجہ ۱۳۰۳ھ بروز یکشنبہ انتقال کیا۔ درگاہ قطب میں اپنے خاندانی احاطہ میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ان کے لوح مزار پر مندرجہ بالا تاریخ وفات کندہ ہے۔ ان کا دیوان شائع نہیں ہوا ہے۔ تذکروں میں متفرق غزلیں اور اشعار مل جاتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

اگرچہ دل ہمارا آتش فرقت سے سوزاں تھا
ہوائے ضبط سے لیکن چراغ زیر داماں تھا

لگی تھی آگ یاں ہر رونگٹے میں سوزش دل سے
مگر ان کے لئے نظارہ سرو چراغاں تھا

مصیبت کا کبھی ہوتی ہے باعث پاک دامانی
فروغ عارض عصمت کسوف ماہ کنعاں تھا

وہ سوتے بے تکلف تھے نگاہ شوق تھی بیباک
پراگندہ پڑے تھے گل کھلا گل چیں داماں تھا

یہ نکتہ ہم نے مضمر پایا ہر اک کام کی تہہ میں
نہیں چاہا تو وہ دشوار تھا چاہا تو آساں تھا

بنا ہے آج طالب صوفی تہمانی مگر کل تک
ہوائے نفس میں اڑتا عزازیل بحر عصیاں تھا

یہاں تو وہی کی وہی سوجھتی ہے — زمانے کو کیونکر نئی سوجھتی ہے
قیامت کے وعدوں پہ تم جی رہے ہو — تمہیں زاہدو دُور کی سوجھتی ہے
یہاں حال پر ہے ہنسی اپنے آتی — وہ سمجھے کہ اس کو خوشی سوجھتی ہے

اس کے دَر سے اٹھے اٹھائے ہوئے ، ناتوانی ذرا سنبھال ہمیں

اپنے بیگانے ہوئے سب لطف ساقی دیکھ کر ، پھر گیا ہم سے زمانہ گردشِ ساغر کے ساتھ

(خم خانۂ جاوید پنجم صـ۳۱۱ تا صـ۳۱۸
واقعات دارالحکومت دوم صـ۲۰۱ ، صـ۲۰۲
واقعات دارالحکومت سوم صـ۲۷ ،
خطوط غالب صـ۸۶)

مرزا احمد بیگ طپاں

مرزا احمد بیگ طپاں ، مرزا جان طپش کے شاگرد اور دہلی کے باشندے تھے ان کا سلسلۂ نسب تعمش خاں والیٔ دشت قپچاق تک پہنچتا ہے ۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے والد کا نام عطاء اللہ خاں بتایا ہے یہ درست نہیں ۔ مولوی عبدالقادر رامپوری نے ڈھاکہ سے کلکتہ پہنچ کر طپاں سے ملاقات کی تھی ۔ انہوں نے ان کے والد کا نام مرزا ہادی خاں لکھا ہے ۔ یہ غلط نہیں ہوگا ۔ غالب نے ان کے لئے "مرزا احمد بیگ خاں ابن مرزا ہادی بیگ خاں برادر زن مہین برادر نواب احمد بخش خاں دوم" لکھا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان لوہارو سے ان کی رشتہ داری تھی ۔

جب دہلی اہل کمال پر تنگ ہوگئی اور وہاں کے رہنے والوں نے دور دراز کے علاقوں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو مرزا احمد بیگ طپاں بھی کلکتہ چلے گئے عبدالغفور نساخ

کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صدر دیوانی کلکتہ میں مختار کی حیثیت سے کام کرتے تھے اس کی تائید غالب کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں وہ اپنے مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں کلکتہ آئے تھے۔ مرزا احمد بیگ خاں طپاں کا تقرر مختار صدر دیوانی کلکتہ کی حیثیت سے عمل میں آیا تھا۔ غالب کو ان سے اس امر کی بھی شکایت رہی تھی کہ انہوں نے زینت بخش پیش گاہ صدر عدالت ہونے کے بعد ایک مرتبہ بھی ان کو یاد نہیں کیا۔ مرزا احمد بیگ خاں طپاں جب کلکتہ سے اکتا گئے اور دہلی آنے کا ارادہ کیا تو غالب نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ کلکتہ کو غنیمت جانیں۔ دہلی میں وہاں کی سی فراغت اور آسودگی ممکن نہیں۔

غالب نے کلکتہ کے قیام کے دوران اعظم الدولہ سرور کے تذکرہ کے لئے مرزا احمد بیگ طپاں کے حالات اور کلام حاصل کیا تھا، اعظم الدولہ سرور نے اسے کسی وجہ سے اپنے تذکرہ میں شامل نہیں کیا۔ جب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنا تذکرہ گلشن بے خار مرتب کرنے لگے تو غالب نے ان کو تاکید کی۔

"مرزا احمد بیگ طپاں سے میری ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔ وہ اردو میں شعر کہتے تھے۔ اور مرزا جان طپش کے شاگرد تھے۔ کلکتہ کے قیام کے دوران جب میں نے ان کو بتایا کہ نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور اردو شاعروں کا تذکرہ مرتب کر رہے تو طپاں نے مجھے اپنا منتخب کلام عنایت کیا تھا تاکہ میں اسے دلی لیتا جاؤں اور سرور کے حوالے کر دوں۔ سرور کے ذہن سے یہ بات نکل گئی اور وہ اوراق ان کے تذکرہ میں شامل ہونے سے رہ گئے۔ افسوس ہے کہ مجھے خود بھی ان کا کوئی شعر یاد نہیں رہا، آپ زحمت فرما کر ان اوراق کو سرور مرحوم کے فرزندوں سے حاصل کر کے شامل تذکرہ کر لیں"

گلشن بے خار میں مرزا احمد بیگ طپاں کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو اعظم الدولہ سرور کے صاحبزادوں سے مرزا احمد بیگ طپاں کے حالات اور کلام حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکی۔ مرزا احمد بیگ خاں طپاں نے ۱۸۳۳ء میں انتقال کیا۔ نساخ کے بیان کے مطابق ان کی یادگار ایک دیوان بھی تھا۔ مولوی عبدالقادر رام پوری نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

"وہ اچھے شاعر ہیں، اپنا سلسلۂ نسب تقمش خاں سے ملاتے ہیں۔ میری ان سے بے تکلفانہ دوستی ہے۔ وہ ریختہ گوئی میں پرانے شعرا کا نمونہ ہیں۔ کلکتہ کے اکثر لوگ اس فن میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ اس خیال سے کہ لوگ یار فروشی نہ سمجھیں، ان کا مرتبہ جیسا جانتا ہوں، نہیں لکھتا۔"

مرزا احمد بیگ طپاں کا نمونۂ کلام یہ ہے :-

رات کو چرخ سے ٹوٹا نہ ستارہ ہوگا — آہ سوزاں کا مری کوئی شرارہ ہوگا
کیوں نہ جھولوگے ہنڈولے میں تم اغیار کے ساتھ — میری قسمت کا جو گردش میں ستارہ ہوگا

پابند نہیں اپنے وہ رتبۂ عالی کا — بڑھ جائے جسے چسکا اس پیار کی گالی کا
طرفین کی الفت سے تکمیل محبت ہو — امکان نہیں بجنا اک ہاتھ سے تالی کا

کون آئینہ رو آج گیا ہے مرے گھر سے — پیدا ہے جو حیرت مرے ہر حلقۂ در سے
دریا سے نکلتے نہیں جو مردم آبی — پنہاں ہیں مری آہ شرربار کے ڈر سے

تغیر وعدۂ جاناں میں سو سو بار ہوتا ہے — کبھی اقرار ہوتا ہے کبھی انکار ہوتا ہے

سخن شعرا صفحہ ۳۰۲ ، کلیات نثر غالب صفحہ ۱۳۳ صفحہ ۱۰۹

علم و عمل صفحہ ۱۳۳ ، متفرقاتِ غالب [illegible]

طالع یار خاں

نواب محمد یوسف خاں عرف کلو خواص حمید الدین ناگوری اور شیخ عطاء اللہ بخاری کی اولاد سے تھے۔ ان کے صاحبزادے طالع یار خاں سے غالب کی گہری دوستی تھی، غالب اور دربار ٹونک کے درمیان جو تعلق قائم ہوا تھا اس میں ان کا اس اعتبار سے زیادہ دخل تھا کہ وہ وزیر الدولہ رئیس ٹونک کے مصاحب اور وزیر پورہ کے جاگیردار تھے طالع یار خاں کا مولد دہلی تھا لیکن انھوں نے علوم درسیہ اور فنون حرب کی تحصیل کے بعد ٹونک میں اقامت اختیار کر لی اور ۱۸۲۳ء میں وزیر الدولہ رئیس ٹونک کو فنون سپہ گری سکھانے پر مامور ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں ان کو خیال ہوا کہ وہ غالب سے فن بانک سے متعلق ایک اردو رسالہ کا فارسی میں ترجمہ کرائیں، اس سلسلہ کی تفصیل منشی تفضل حسین خاں کے نام ایک خط میں ملتی ہے جسے غالب نے لکھا تھا، غالب لکھتے ہیں:

"طالع یار خاں میرے دیرینہ دوست ہیں۔ اب کی مرتبہ انھوں نے ایک بار گراں میرے کاندھوں پر ڈال دیا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میں اردو کی ایک عبارت کا فارسی میں ترجمہ کروں، یہ عبارت فن بانک سے متعلق پینچوں اور گروں پر مشتمل تھی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ کام نواب معلی القاب عالی جناب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کی خوشنودی کا باعث ہوگا۔ میں اس والا جاہ کے مائدہ کرم کا زلہ خوار ہوں اور شکر گزاری کو اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔ میں نے اپنے توسن قلم کو ترجمہ کی وادی تنگ میں چلایا ہے اور اپنی طرف سے دیباچہ اور خاتمہ تیار کیا اور اسے ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کر کے ان کے سپرد کیا ہے تاکہ وہ نواب

کی خوشنودی کے اظہار کا ذریعہ بن سکے۔"

طالع یار خاں انتہائی بذلہ سنج، حاضر جواب اور باسلیقہ قسم کے آدمی تھے، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے کچھ پہلے بقول غالب "ان کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لیکر آئے تھے۔ غدر کے سبب جا نہیں سکے، یہیں رہے، بعد فتح دہلی دونوں بےگناہوں کو پھانسی ملی" اس حادثہ نے طالع یار خاں کی کمر توڑ دی۔ غالب نے ان کے متعلق یہ غلط قیاس نہیں کیا ہے کہ "وہ ٹونک میں ہیں، زندہ ہیں، پر یقین ہے کہ مردہ سے بدتر ہوں گے۔"

وزیر الدولہ رئیس ٹونک نے ۱۸۶۲ء میں انتقال کیا، ان کے انتقال کے بعد طالع یار خاں کو کسی سے بھی اعانت اور دستگیری کی امید نہیں رہی، انھوں نے ٹونک سے ہجرت کی اور جون ۱۸۶۴ء کے لگ بھگ بھوپال پہنچ گئے۔ ابھی وہاں ان کے قیام اور معاش کا مسئلہ طے بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

(سبد باغ دو در ص ۱۳۱ نوائے ادب اکتوبر ص

عود ہندی ص ۱۶۳)

مرزا عباس بیگ

مرزا عباس بیگ، مرزا اکبر بیگ کے منجھلے صاحبزادے اور غالب کے حقیقی بھانجے تھے ان کے بھتیجے نواب آغا مرزا بیگ خاں سرور جنگ نے اپنی سوانح عمری میں ان کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ جوانی میں حد درجہ عیاش طبع، رنگین مزاج اور احباب پرست قسم کے انسان تھے۔ ان کو پڑھنے لکھنے کا شوق بہت کم تھا، اس کے باوجود انھوں نے انگریزی اس قدر سیکھ لی تھی کہ لکھنا پڑھنا آگیا تھا۔ فارسی کی بھی قدرے لیاقت تھی، جن دنوں مسٹر رام چندر نے عیسائی مذہب قبول کیا، یہ بھی ان کے شاگردوں میں شامل

ہو گئے ـــــــــــ !

مرزا عباس بیگ کے چچا مرزا افضل بیگ نے کلکتہ کے قیام کے دوران ایک عورت کو اپنے گھر ڈال لیا تھا، ان کا انتقال ہوا تو مرزا عباس بیگ نے اس عورت سے دوستی بڑھانا شروع کی۔ اس کا علم مرزا اکبر بیگ کو بھی ہو گیا جس پر مرزا عباس بیگ نے اس عورت کو ساتھ لیا اور پنجاب جا کر ایک راجہ کے ہاں ملازم ہو گئے۔ اس ملازمت کے دوران ان کو طرح طرح کی سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس اثنا میں راجہ نے ایک مرتبہ ان کی شرافت اور وفاداری کا امتحان لینا چاہا، جس پر انھوں نے ناراض ہو کر اس کی ملازمت ترک کر دی اور لاہور چلے گئے۔ جہاں سر ہنری لارنس نے ان کو کوتوال شہر مقرر کیا۔ بعد میں ان کی دلیری اور صاف گوئی کی بنا پر ان کی تنخواہ بھی بڑھا دی اور فیروز پور کا تحصیلدار مقرر کر دیا۔

فیروز پور کی تحصیلداری کے زمانے میں مرزا عباس بیگ نے سکھوں کے خلاف انگریزوں کی بڑی مدد کی۔ جنرل ایبٹ کو میدان جنگ سے زخمی حالت میں اٹھا لانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر تھا۔ اسی زمانے میں ڈپٹی کمشنر کے حکم پر ان کو ملازمت سے معطل کر دیا گیا اور وہ بردہ فروشی کے ایک مقدمے میں ملوث کیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے ملازمت کے زمانے میں رشوتوں سے جتنی کچھ رقم جمع کر رکھی تھی وہ سب مقدمے بازی کی نذر ہو گئی۔ اس سے بجائے اس کے کہ کوئی فائدہ ہوتا الٹا گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے، جس پر انھوں نے راتوں رات اونٹ کے ذریعہ ملتان کا سفر کیا، تاکہ جنرل ایبٹ سے اس معاملے میں مدد حاصل کریں۔ جنرل ایبٹ کی سعی و سفارش پر سر ہنری لارنس نے ان کا پروانۂ گرفتاری منسوخ ہی نہیں کیا بلکہ سر جرچ ڈ ٹیمپل کے دفتر بندوبست میں ملازمت بھی دلا دی۔

۱۸۵۷ء کی سعیٔ انقلاب کے وقت مرزا عباس بیگ ملا پور میں تحصیلدار تھے، ملا پور پر مجاہدوں نے یلغار کی تو انھوں نے اپنا تمام مال و اسباب اور سرکاری خزانہ جنرل ادھرم

کے پاس لکھنؤ روانہ کر دیا اور خود بلگرام جا کر روپوش ہو گئے اور انگریزوں سے خفیہ رابطہ قائم رکھا۔ اس کے بعد وہ فرخ آباد ڈپٹی کلکٹر بنا کر بھیجے گئے جہاں سے سیتا پور کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ پر چھ سو روپے ماہانہ پر ان کا تقرر عمل میں آیا۔ اسی کے ساتھ بڑی گاؤں کی اراضی بھی بطور جاگیر دی گئی۔ آخر عمر میں لکھنؤ کی اکسٹرا کمشنری کے عہدہ سے ریٹائر ہوتے اور وہیں رہائش اختیار کر لی۔

حکیم مرتضیٰ حسین فاضل کے بیان کے مطابق ۱۲۹۶ھ میں انتقال کیا۔

مرزا غالب کے کئی خطوط میں مرزا عباس بیگ کا ذکر آیا ہے۔ مرزا غالب نے ایک خط کے ذریعے مرزا عباس بیگ کے ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد ہونے اور غدر کے زمانے میں بلگرام میں روپوشی اختیار کرنے کی اطلاع دی ہے۔

مرزا غالب نے دعائے صباح کے عنوان سے ایک مثنوی مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی حضرت علی کی دعا صباح کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس مثنوی کا پہلا ایڈیشن غالب ہی کی زندگی میں نول کشور پریس میں طبع ہوا تھا۔ اس کے خاتمہ پر کاتب نے تحریر کیا ہے:

"دعائے ماثور و منقول از جناب امیر علیہ السلام مع ترجمۂ نثر و نیز ترجمۂ منظوم مرزا اسد اللہ خاں غالب موسوم بہ دعا صباح حسب الایمائے مرزا عباس بیگ صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ بہ مطبع نول کشور رونق طبع گردید بود بست و سوم شہر رجب سنہ یک ہزار دو صد و ہشت دو چار"

(کارنامہ سروری ص ۴۳ تا ص ۵۶، عود ہندی ص ۱۶

غالب کی ایک غیر معروف مثنوی نگار مئی ۱۹۳۱ء)

مفتی سید محمد عباس

مفتی سید محمد عباس کے والد سید علی اکبر شوستری مشہور محدث نعمت اللہ جزائری کے اخلاف میں سے تھے۔ سید علی اکبر شوستری کے والد سید محمد جعفر نے ۱۲۱۰ھ میں شوستر سے ہندوستان کا قصد کیا اور لکھنؤ پہنچ کر آصف الدولہ کی سرکار سے منسلک ہو گئے۔

مفتی سید محمد عباس لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سال ولادت ۱۲۲۴ھ ہے۔

مفتی سید محمد عباس نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر علمائے فرنگی محل میں مولوی عبدالقدوس اور مولوی عبدالقوی سے رجوع ہوئے۔ اور اس سلسلہ میں اتنی شہرت پائی کہ محمد علی شاہ نے ان کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ امجد علی شاہ نے برسر اقتدار آنے کے بعد ان کو طلب کیا اور مدرسہ دینیہ کے قیام کی خواہش کی جسے انہوں نے بکمال رضامندی پورا کیا۔ ایک مرتبہ سید العلما سید حسین کی طبیعت ناساز تھی اور وہ ظہر کا خطبہ پڑھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے اپنے تلامذہ کو اجازت دی کہ ان میں سے جو چاہے ان کی جگہ خطبہ پڑھ دے۔ اس کی کسی کو بھی ہمت نہیں ہوئی البتہ مفتی سید محمد عباس نے بعد اجازت منبر پر آکر خطبہ پڑھا اور مجلس کی صورت حال ہی بدل دی۔ خود سید العلما سید حسین نے ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ اس واقعہ کے بعد ان کے فضل و کمال کا چرچا ہو گیا۔ ۱۲۶۲ھ میں نواب امین الدولہ نے ان کے لئے محکمہ وزارت کا دارالافتا تجویز کیا پہلے تو وہ اس خدمت پر راضی نہیں ہوئے، لیکن جب واجد علی شاہ نے ان کو مجبور کیا تو آمادہ ہو گئے۔ اس موقع پر ان کو تاج العلما اور افتخار الفضلا کے خطابات سے نوازا گیا۔

جب اودھ کی ضبطی کے بعد واجد علی شاہ جلا وطن ہو کر لکھنؤ سے مٹیا برج چلے گئے تو انہوں نے مفتی محمد عباس کو بھی وہیں بلا لیا۔ اس اثنا میں انہوں نے

آگرہ، غازی پور، حسین آباد اور امروہہ کا بھی سفر کیا۔ علاوہ ازیں سانیور بھی آتے جاتے رہے۔ انہوں نے ۲۵ رجب ۱۳۰۶ھ کو انتقال کیا۔ اور غفراں مآب کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ جلال لکھنوی نے ان کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ کہا۔

قبلۂ دینم چو مفتی میر عباس آہ آہ   رفت از دنیا و فردوس بریں شد جائے دیں

خاک بر سر کرد سال رحلتش گفتہ جلال   عالم بے مثل ادیب بود قبلۂ تمنائے دیں

مفتی محمد عباس عربی، فارسی، اردو، نظم و نثر، حدیث، تفسیر، فقہ، رجال لغت، بیت غرض بے شمار علوم و فنون پر مکمل استدراک رکھتے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق انہوں نے تین سو سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد ایک سو سے کم نہیں ہے۔ عزیز لکھنوی نے تجلیات کے عنوان سے ان کی مکمل سوانح لکھی ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس و دبیر سے لے کر غالب تک سب ہی نے ان کے علمی اور ادبی تصرف سے فیض اٹھایا ہے۔ عزیز لکھنوی لکھتے ہیں

"ایک دن مفتی محمد عباس کی خدمت میں ذوالفقار الدولہ صاحب سلطان عالم واجد علی شاہ اختر اردو کا ایک نوحہ لے کر آئے اور کہا حضور اس پر اصلاح دیں۔ مفتی صاحب نے فرمایا کہ بھئی میں اردو کیا جانوں۔ جب انہوں نے بے حد اصرار کیا تو کہا اچھا پڑھیئے۔ ذوالفقار الدولہ نے جب یہ شعر پڑھا۔

شاہ جب مرنے چلے رن میں تو زینب نے کہا

اک لحد پہلو میں ہو بھائی بہن کے واسطے

فرمایا کہ پہلا مصرعہ یوں بدل دو "وقتِ رخصت شاہ سے زینب نہ اتنا کہہ سکیں"۔

اسی طرح ایک مرتبہ میر انیس مفتی صاحب کو اپنا ایک نو تصنیف مرثیہ سنا رہے تھے۔ جب یہ مصرعہ پڑھا "جب حملہ ور امام کریم النفس ہوئے"۔ مفتی صاحب نے تامل فرمایا اور میر صاحب سے کہا کہ بجائے اس مصرعہ کے یوں لکھ دیجئے تو

خوب ہے۔" جب حملہ ور امامِ مسیحا نفس ہوئے۔"

مفتی سید محمد عباس کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان میں سے سید مہدی شاہ کشمیری، حامد حسین نیشاپوری، سید ابوالحسن علی بن حضور الضوی، سید حیدر علی، مرزا محمد علی، سید محمد جون پوری، سید علی، سید علی جواد، اصغر حسین زنگی پوری سید علی حسین، سید محمد حسین، سید عابد حسین قیس، شیخ تفضل حسین، سید جواد بھیک پوری سید تفضل حسین رضوی، سید محمد مہدی، محمد عین القضات، محمد فاروق چڑیاکوٹی، شاہ محمد حسین الہ آبادی، سید ناصر حسین موسوی، شیخ فدا حسین قریشی، سید نجم الحسن، مرزا محمد مہدی، حکیم محمد مرزا، سید اولاد حسین امروہوی، احمد حسین امروہوی، اعجاز حسین امروہوی، سید حسین رضا بلگرامی، سید کرامت حسین، سید اکبر علی، میر خورشید علی نفیس اور سید علی حسن نے بڑی شہرت پائی۔

غالب اور مفتی محمد عباس میں مراسلت کا آغاز کب ہوا، اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ عزیز لکھنوی کے بیان کے مطابق غالب اور مفتی صاحب میں خط وکتابت ۱۲۷۱ھ میں شروع ہوئی تھی جب غالب نے ان کو قاطع برہان کا ایک نسخہ ارسال کیا تھا۔

سید مفتی عباس اردو، فارسی اور عربی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ انہوں نے زیادہ تر عربی اور فارسی میں لکھا ہے۔ عزیز لکھنوی نے اپنی تالیف تجلیات میں ان کا کچھ اردو کلام بھی درج کیا جس کا نمونہ یہ ہے۔

مفتی ہے کیوں نفس میں بہ حال صورتِ حیات — دیکھا ہے جیسے آب پہ نقشہ حباب کا
بردہ ہے بیت شعر تو وہ خال مشکبو — نقطہ کنار صفحہ پہ ہے انتخاب کا
غافل کو ہوش آتا ہے میرے کلام سے — ٹپکا ہے جو قلم سے عرق ہے گلاب کا
آنکھوں کا نور عالم پیری نے کھو دیا — گل کر دیے چراغ کہ ہے وقت خواب کا

غفلت کا یہ عالم ہے نہیں یاد وطن کی — کیا انس ہے اس جسم سے جانِ سفری کو
فت کی ہوا چلتی ہے یاں چار طرف سے — کس طرح بچاؤں میں چراغِ سحری کو

ہوش آیا جو جوانی میں تو پیری آئی — شب کو اس وقت کھلی آنکھ کہ کچھ رات نہ تھی

عباس روزِ حشر پکارے گا برملا — لوٹا مجھے بتوں نے دہائی خدا کی ہے

ممکن ہے آفتاب کی تصویر کھینچنا — پر نورِ آفتاب کی تصویر ہے کہاں

غفلت میں کس مزہ سے گزرتی تھی زندگی — جو لطف کمسنی میں اٹھایا وہ خواب تھا
وصلت کی شب کہ کچھ نہ ہوئی گفتگو بہم — ان کو غرورِ حسن تھا ہم کو حجاب تھا

مریں گے صبح تک امیدوارِ وصل اے گردوں
ابھی سے ماتمی کیوں پیرہن ہے شامِ ہجراں کا

(تذکرۂ بے بہا ص ۲۲۲ تا ص ۲۲۳ ، خطوطِ غالب ص ۸۵
شاعر سخن ص ۱۳۶ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے تعلیقات)

مرزا عبدالقادر رامپوری

مرزا عبدالقادر رام پوری ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو بول چال میں دہلی کی زبان اور روزمرہ کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ان کے والد محمد اکرم آشنا دہلی کے رہنے والے تھے لیکن ان کی ولادت ۱۱۹۵ھ میں بمقام رامپور ہوئی۔ یہیں انہوں

نے مولانا رحم علی اور مفتی شرف الدین وغیرہ سے علوم درسیہ کی تکمیل کی اور پھر سرکار انگریزی میں ملازم ہوکر مراد آباد کی صدر الصدوری کے درجے تک پہونچے۔ اس کے ایک طویل عرصہ کے بعد حاکم بالادست اور ان میں اختلاف ہوگیا جس پر انہوں نے دل برداشتہ ہوکر ملازمت ترک کردی اور عزلت گزیں ہوگئے اور رجب ۱۲۹۵ھ میں بمقام رامپور انتقال کیا۔

مرزا عبدالقادر رامپوری کو ادیبوں سے ملنے اور سیر و سفر کرنے کے بے انتہا شوق تھا۔ انہوں نے اپنے روزنامچہ میں ملک کے مختلف علاقوں کی سیاحت، مشہور عالموں کی ملاقات اور مختلف شاعروں کی صحبت کا حال لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی دہلی میں بھی آمد و رفت رہی تھی۔ قادر بخش صابر نے اپنے تذکرہ میں ان کو فاضل، جلیل القدر اور عالم بے بدل کے علاوہ ظرافت پسند بھی بتایا ہے۔ اس کی تائید حالی کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے۔ حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے۔

"ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف اور خوش مذاق فاضل تھے۔ مرزا سے کہا آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے موزوں کرکے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کر حیران ہوئے اور کہا کہ حاشا یہ میرا شعر نہیں ہے۔ انہوں نے اصرار کیا، آخر کو مرزا سمجھ گئے کہ مجھ پر اس پیرایہ میں اعتراض کرتے ہیں اور جتاتے ہیں کہ تمہارے اس قسم کے شعر ہوتے ہیں۔"

مرزا عبدالقادر رامپوری نے اپنے روزنامچہ میں غالب کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً وہ ان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ غالب کے ایک خط میں ان کا ذکر انتہائی احترام کے ساتھ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اور غالب میں مراسم تھے۔ اور ان کی

ابتدا غالب کے سفر کلکتہ سے پہلے ہو چکی تھی۔

جن دنوں غالب اپنی پنشن اور نواب شمس الدین خاں کے مظالم کے خلاف داد طلبی کے لئے کلکتہ پہنچے۔ وہاں مشاعروں کا زور تھا۔ غالب نے بھی ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی جس پر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور قتیل کے حوالے آئے۔ غالب خسرو کے علاوہ کسی کو کیا خاطر میں لاتے۔ قتیل کا نام سن کر آتش زیر پا ہو گئے۔ بدمزگی اور تلخ کلامی نے باقاعدہ مکابرہ کی صورت اختیار کرلی۔ اس کی تفصیل غالب نے یوں لکھی ہے۔

"پانچ ہزار آدمی فراہم تھے اور جو اعتراض مجھ پر کئے تھے اس میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ "ہمہ عالم" غلط ہے یعنی ہمہ کا لفظ، عالم کے ساتھ ربط نہیں پا سکتا۔ قتیل کا حکم یوں ہے۔ عرض کیا گیا کہ حافظ کہتا ہے۔

ہمہ عالم گواہِ عصمت اوست

سعدی کہتا ہے ؎

عاشقم بر ہمہ عالم کہ ہمہ عالم از اوست

غرض کہ اس مکابرہ نے طول کھینچا اور غالب کو مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر بطور معذرت نامہ ایک مثنوی لکھنا پڑی جس کا نام بادِ مخالف رکھا گیا۔ نواب علائی نے اس ہنگامہ اور مخالفت کا باعث عبدالقادر رام پوری کو قرار دیا ہے۔ یہ بات درست ہو یا نہ ہو بہرحال یہ واقعہ ہے کہ غالب بادِ مخالف کی تصنیف کے باوجود اپنے نظریہ اور رائے پر اڑے رہے انہوں نے اپنی مثنوی کی نقلیں مختلف ادبا کے پاس اظہارِ رائے کے لئے بھیجیں۔ ایک نسخہ مولوی عبدالقادر رام پوری کو بھی ارسال کیا۔ چنانچہ محولہ خط ہی میں لکھتے ہیں۔

"ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال و نظائر کے پاس بھیجی گئی اگر یہ لوگ جگہ پاتے (اعتراض کی گنجائش ہوتی) تو میری

کھال ادھیڑ ڈالتے ۔

امیر مینائیؒ نے مولوی عبدالقادر رام پوری کے متعلق بتایا ہے کہ وہ عربی، فارسی، اردو، بھاکا اور مرہٹی سب زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ کلیات ان کا گم ہے۔ خود مولوی بسمل اور نے اپنے روزنامچہ میں اپنی تصانیف کی تعداد اٹھائیس بتائی ہے لیکن یہ تصانیف ناپید ہیں۔ قادر بخش صابر کے بیان کے مطابق مولوی عبدالقادر رام پوری گاہ گاہ ریختہ اردو ہے قدیم رضم پر کہتے تھے۔ ان کا تخلص غمگین تھا۔ ان سے تین شعر درج کئے جاتے ہیں۔

جو مے رہی نہ تو شیشہ جھکا کے ساقی نے
کہا یہ رندوں سے لیجے سلام شیشے کا،
کر نہ سکا سامنے منہ اس کے تو ہرگز
اب ہم سے ہوا چاہے ہے گھٹ گھٹ کے برابر
عادت نے اپنے ہاتھوں کے ہم کو نہیں امید
لیٹے رہیں نماز تک بھی کفن میں ہم،

(انتخاب یادگار صہ۳۲، گلستان سخن دوم صہ۱۶۱،
صہ۱۶۱، دستور الفصاحت صہ۹۳، نگار فروری رام پور
۱۹۶۳ء، عود ہندی صہ۳۲، حیات مومن صہ۲۱۴)

مرزا عبداللہ بیگ خاں

مرزا عبداللہ بیگ خاں، مرزا فوقان بیگ خاں کے صاحبزادے اور غالب کے والد تھے۔ ان کی ولادت دہلی میں ہوئی۔ ان کو ان کے خاندان میں مرزا دولہا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مرزا فوقان بیگ خاں جب تک زندہ رہے مرزا عبداللہ بیگ خاں کو

کسی قسم کی فکر نہیں ہوتی، ان کا انتقال ہو گیا تو مرزا عبداللہ بیگ خاں نے تلاش روزگار میں دہلی کی سکونت ترک کر دی اور امیر مینائیؔ کے بیان کے مطابق مہاراجہ جے پور کی خدمت میں پہنچ کر ان کے ملازم ہو گئے۔ اسی دوران غلام حسین کمیدان کی صاحبزادی عزت النساء بیگم سے ان کا عقد ہو گیا جس پر انھوں نے مہاراجہ جے پور کی ملازمت چھوڑ دی اور خانہ داماد کی حیثیت سے آگرہ میں رہنے لگے۔

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا قوقان بیگ خاں کو شاہان دہلی کی طرف سے پرگنہ پہاسو بطور جاگیر ملا تھا۔ ان کے انتقال کے وقت جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا، اس کی وجہ سے پرگنہ پہاسو کی جاگیر جاتی رہی ——— اور مرزا عبداللہ بیگ خاں معاش کی فکر میں سرگرداں رہنے لگے۔ غالب نے لکھا ہے:

"باپ میرا مرزا عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر ہوا۔ بعد چند روز حیدرآباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہو گیا۔ تین سو سوار کی جمعیت کے ساتھ ملازم رہا، کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی، عبداللہ بیگ خاں بہادر نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا"

مرزا عبداللہ بیگ خاں کو راؤ بختاور سنگھ کا ملازم ہوتے چند ہی دن گزرے تھے اور ان کو مناسب حال نوکری نہیں دی گئی تھی کہ راج گڑھ کا معرکہ پیش آگیا۔ حالیؔ کے بیان کے مطابق:

"ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لیے بھیجی گئی۔ اس کے ساتھ مرزا عبداللہ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا، وہاں پہنچتے ہی ان کے گولی لگی اور وہیں ان کا انتقال ہو گیا اور راج گڑھ میں دفن ہوئے"

غالب کے ایک اور خط سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ راج گڑھ کا معرکہ ۱۸۰۲ء میں وقوع پذیر ہوا تھا اور اسی میں مرزا عبداللہ بیگ خاں کام آئے تھے۔ غالب نے ۱۸۶۰ء میں راجہ شیو دھان سنگھ والی الور کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے ایک شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست　　　　در خاک راج گڑھ پدرم را بود ضرور

مرزا عبداللہ بیگ کے مارے جانے کے بعد راجہ بختاور سنگھ والی الور نے دو گاؤں اور کسی قدر روزینہ ان کے دونوں لڑکوں یعنی غالب اور ان کے بھائی مرزا یوسف خاں کی پرورش کے لئے مقرر کر دیا۔ جس کے متعلق یہ بات ہنوز تحقیق طلب ہے کہ یہ گاؤں اور یہ وظیفہ کب اور کیوں مسدود ہوا؟

(یادگار غالب ص۱۱، کلیات نثر ص۱۵۴
انتخاب یادگار ص۲۴۰، آجکل فروری ۶۲ء
کلیات نظم فارسی دوم ص۳۴۶)

نواب سیّد عبداللہ خاں

نواب سید عبداللہ خاں، نواب غلام محمد خاں کے صاحبزادہ اور یوسف علی خاں ناظم والی رام پور کے چچا تھے، جن دنوں ان کے والد نواب غلام محمد خاں کو آصف الدولہ نے شکست دی اور انگریزوں نے ان کو بے دخل کر کے رامپور چھوڑنے پر مجبور کیا وہ لکھنؤ چلے آئے اور یہاں سے زیارت حرمین شریفین کے لئے روانہ ہوتے۔ اس دوران نواب سید عبداللہ خاں کا بچپن لکھنؤ میں گزرا۔ جب کسی قابل ہوتے تو سرکار انگریزی کی ملازمت اختیار کر لی اور اپنی ذاتی صلاحیت اور کوشش کی بنا پر صدرالصدور کے عہدہ تک پہنچے۔

نواب سید عبداللہ خاں کی بیوی، مرشد زادہ مرزا محمد شاہ رخ کی رشتہ دار تھیں اس لئے ان کو لال قلعہ سے بھی تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ امیر مینائی نے ان کے تنومند اور قوی القوی ہونے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ دریائے بیاس میں ایک کشتی بے قابو ہو کر بہی جاتی تھی، اس کو روکنے کے لئے ملاحوں نے رسہ پھینکا لیکن کشتی قابو میں نہیں آسکی، نواب سید عبداللہ خاں نے رسہ پر پاؤں رکھ دیا پھر اس کشتی کو جنبش نہیں ہوئی اور ملاحوں نے اس پر قابو پا لیا۔

نواب سید عبداللہ خاں ایک طویل عرصہ تک میرٹھ کے صدر الصدور رہے۔ غالب کا ان کے نام پنج آہنگ میں ایک خط شامل ہے، اس سے ان کے اور غالب کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ غالباً ان ہی کے مشورہ پر ان کے برادرزادہ یوسف علی خاں ناظم نے فارسی غالب سے پڑھی تھی۔ وظیفہ حسن خدمت پر علیحدہ ہونے کے بعد انھوں نے میرٹھ ہی کو وطن بنا لیا اور وہیں رہنے لگے۔

امیر مینائی نے ان کی عمر ستر برس بتائی ہے، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب سید عبداللہ خاں کو تپ آئی اور انھوں نے ۲ محرم ۱۲۷۳ھ کو انتقال کیا اور درگاہ چشتی پہلوان میں مدفون ہوئے۔

سید عبداللہ خاں کا کلام دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ وہ ظریف تخلص کرتے تھے۔ ان کے پوتے صاحبزادہ محمد رضا علی خاں نے امیر مینائی کو اس غزل کا ایک شعر سنایا تھا جو انھوں نے مین پوری کے زمانۂ قیام میں کہی تھی۔

منحصر تجھ پر شفاعت ہے، بھلا جائیں کہاں
اے شفیع عاصیاں ہم تیرا داماں چھوڑ کر

(انتخاب یادگار صفحہ ۲۱، بہادر شاہ کا روزنامچہ صفحہ ۲۲۔
کلیات نثر غالب (پنج آہنگ صفحہ ۲۱۸)

میر احمد حسن عرشی

میر احمد حسن عرشی، سید اولاد حسن قنوجی کے صاحبزادے اور والا جاہ نواب صدیق حسن خاں کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۱۹ رمضان ۱۲۴۶ھ ہے انھوں نے ابتدائی تعلیم قنوج میں حاصل کی، پھر بدایوں، کان پور، فرخ آباد، علی گڑھ، بریلی اور دہلی پہنچ کر وہاں کے اکابر علما سے درس لیا اور شیخ صالح عبدالغنی، سید فارقی مجددی اور مولانا عبدالغنی مدنی سے علوم کتاب و سنت کی تکمیل کی۔

میر احمد حسن عرشی کو علوم و فنون کی تحصیل کے علاوہ، سپہ گری کا بھی شوق تھا اور وہ اس معاملہ میں اپنا مدِ مقابل نہیں رکھتے تھے۔ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران قنوج کے رہنے والوں پر مصیبت آئی تو انھوں نے نہ صرف ان کے جان و مال کی حفاظت کی بلکہ ان کو ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ رکھا۔

میر احمد حسن عرشی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ سعادت حج سے بہرہ یاب ہوں اس سلسلے میں انھوں نے دو تین مرتبہ ارادہ بھی کیا، لیکن ان کے ہمراہ ان کی والدہ بھی جانا چاہتی تھیں، اس لئے انھوں نے والدہ کے چلنے تک اپنے ارادہ کو ملتوی رکھا، لیکن بعض وجوہ کی بناء پر ان کی والدہ تیار نہیں ہو سکیں، جس پر میر احمد حسن عرشی نے اکیلے ہی حج پر جانے کا فیصلہ کیا اور ۱۸۶۰ء میں بڑودہ پہنچ کر مولانا غلام حسین قنوجی کے مکان پر مقیم ہوئے۔ اسی اثنا میں خارش کی تکلیف پیدا ہوئی، اسی کے ساتھ بخار اور اسہال بھی لاحق ہو گیا اسی حالت میں وہ بیس روز بیمار رہ کر ۹ رجمادی الاول ۱۲۷۷ھ کو انتقال کر گئے اور بڑودہ میں میں مدفون ہوئے۔ محمد عباس رفعت بھوپالی نے ان کے انتقال پر یہ قطعہ تاریخ لکھا:

عرشیٔ عالی گہر احمد حسن — در طفیل مصطفےٰ مغفور باد
رخت بربست از جہاں سوئے بہشت — زیر طوبیٰ ہم نشین حور باد

گفت رفت از پئے تاریخ او | با امام المتقین محشور باد

غالب کو میر احمد حسن عرشی کے مرنے کی اطلاع قاضی عبدالجمیل بریلوی کے ایک خط سے ملی لیکن غالب اس کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے۔ انھوں نے قاضی عبدالجمیل بریلوی سے استفسار کیا:

"مولوی احمد حسن عرشی کے فراق کو میں نہیں سمجھا کہ کیوں واقع ہوا، بلکہ یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ اور وہ یک جا کہاں تھے اور کب تھے"

میر احمد حسن عرشی کو پڑھنے لکھنے کے علاوہ کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اردو فارسی اور عربی پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی والا جاہ نواب صدیق حسن خاں نے ان کا کلام جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کرایا تھا جو اب نہیں ملتا ہے۔ ان کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

صبحدم چاک گریباں میزنم | بر چراغ مہر داماں می زنم
از پئے عیش و نشاط بزم عشق | زخمہ بر تار رگ جاں می زنم
اشک گلگوں چوں ہمی آید بہ چشم | نالہ گلگشت گلستاں می زنم
چوں بدست آوردہ ام مینائے دل | ساغر گردون گرداں می زنم

چشم تو بہ ایمائے سخن عشق سراید | از ضعف چشم مگر طاقت گفتار ندارد

بردہ در سینۂ من سوختۂ داغے | افروختہ بر مشہد پروانہ چراغے
دل بہ قفس از غم گلشن بہ فغان است | در گوشۂ عزلت نتواں یافت فراغے

اُردو کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مجھے خوشی ہے تمہارے عشوہ ہائے پیہم کی | رہے نہ کوئی ستم منتظر امتحاں کے لئے

کیا اک بات میں جامے سے باہر شب وصل اس نے جب مجھ سے حیا کی
خود آرائی نہ چھوڑیں گے یہ کافر خدائی یوں تو برحق ہے خدا کی

اتنی ہی آرزو ہے ہمیں تجھ سے اے فلک یہ ان کی اک نہیں بھی نہ ہو وے جو ہاں نہ ہو
وہ وضع احتیاط یہ نسل بہار ہے گلبانگ شوق زمزمہ خیز فغاں نہ ہو

(ماثر صدیق اول
خطوط نواب ۵۶ء
علمائے ہند ص ۱۵ سنہ ۲ خم خانہ جاوید جنم ص ۹۹
شمع انجمن ص ۳۲۲ ص ۳۲۱)

مولوی غیاث الدین عزت

مولوی غیاث الدین کو ان کی تالیف غیاث اللغات کی وجہ سے قبول عام حاصل ہے۔ وہ مولوی شریف الدین کے صاحبزادہ تھے اور عزت تخلص کرتے تھے۔ ان کا سال پیدائش ۱۲۰۰ھ اور مولد رام پور ہے۔ انھوں نے کتب درسیہ مولوی غلام جیلانی رفعت سے پڑھیں، طب میں مولوی نورالنبی تمیذ شاہ عبدالحق محدث دہلوی سے استفادہ کیا۔ شاعری میں عنبر شاہ خاں عنبر اور کبیر خاں تسلیم سے تلمذ تھے۔

تلاش معاش میں لکھنؤ بھی گئے۔ غوث محمد خاں والی جاورہ نے ان کو ایک کتاب کے صلہ میں ایک شخص قطب الدین کی معرفت ایک ہزار روپے بھجوائے اور کہلوا بھیجا کہ ان روپوں سے ایک کنواں بنواتا ہوں تاکہ آپ کو بھی ثواب ملے۔ ان کی تصانیف کی شہرت ہوئی تو یوسف علی خاں والی رام پور نے ان کو اپنے ملازمین میں شامل کرلیا اور معقول رقم بطور وظیفہ مقرر کردی لیکن وہ یہ رقم کتابوں کی

خریداری اور ضرورت مندوں کی حاجت روائی پر صرف کر دیتے تھے۔

۱۲۶۱ھ میں مولوی غیاث الدین نواب کلب علی خاں کی اتالیقی پر مقرر کئے گئے۔ اس دوران انھوں نے نواب کلب علی خاں کی ذہنی اور فکری تربیت کے لئے کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں خلاصۃ الانشار رسالہ عروض و قافیہ، افسانۂ باغ و بہار، شرح مثنوی غنیمت، شرح سکندر نامہ، شرح ابو الفضل، شرح گل کشتی، شرح بدر چاچ مجربات غیاثی، ازالہ اغلاط عربی و فارسی، خواص الادویہ، شرح گلستاں، قصہ گل و گینداور منتخب العلوم مشہور ہیں۔

مولوی غیاث الدین نے اڑسٹھ برس کی عمر ۱۲۶۸ھ کے لگ بھگ انتقال کیا۔ وہ اپنی تالیف غیاث اللغات کی وجہ سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ اسے انھوں نے دس برس کی محنت کے بعد ۱۲۴۲ھ میں مکمل کیا تھا اور یہ پہلی مرتبہ مطبع میر حسن رضوی لکھنوی میں ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے شائع ہوتے ہی اس وقت کے اکثر علمی اور ادبی حلقوں میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ سب سے زیا مخالفت غالب نے کی۔ انورالدولہ شفق کے نام وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"غیاث اللغات ایک نام موقر و معزز جیسے الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی، آپ جانتے ہیں یہ کون ہے، ایک معلم فرمایہ، رام پور کا رہنے والا، فارسی سے ناآشنائے محض، اور صرف و نحو میں ناتمام، انشائے خلیفہ و منشیات مادھو رام کا پڑھانے والا، چنانچہ دیباچہ میں اپنا ماخذ بھی اس نے خلیفہ شاہ محمد و مادھو رام و غنیمت و قتیل کے کلام کو لکھا ہے۔ یہ لوگ راہ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنیوالے یہ فارسی کو کیا جانیں"

مولوی غیاث الدین کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

زاہد بھی خانقاہ میں بدمست ہوگیا
کیفی کو میرے نشہ میں سرشار دیکھ کر

اتنی بے مہری تو اے ماہ جبیں خوب نہیں
ہم سے اجتناب میں پیاری نہیں خوب نہیں

بے چین کر دیا مجھے اک دم میں اس طرح
آنکھوں کو تیرے کس نے یہ جادو دکھا دیا

پھرتے ہو روٹھے ہم سے نہیں ماجرا ہوا
ہم جانتے ہیں تم کو کسی نے بتا دیا

(انتخاب یادگار ص ۲۲۷ ، ص ۲۲۶
تذکرہ کاملان رامپور ص ۳۰۵ ، ص ۳۰۸
خطوط غالب ص ۳۵۶)

مرزا یوسف علی خاں عزیز

مرزا یوسف علی خاں عزیز کا آبائی وطن بنارس تھا لیکن ان کے والد مرزا نجف علی خاں جنون کسی بنا پر وہاں کی سکونت ترک کر کے علی گڑھ میں آباد ہو گئے۔ دہلی کے ...ن میں مدتوں سررشتہ داری اور تحصیلداری کے عہدوں پر کام کرنے کے بعد ...۱۸ء میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال پر ان کی تمام جائیداد یوسف علی خاں عزیز کے ہاتھ لگی لیکن وہ اس کو احتیاط سے صرف نہیں کر سکے جس کے نتیجہ میں ان کو بہت جلد تلاش معاش میں نکلنا پڑا۔

عبدالغفور نساخ نے ان سے قیام دہلی کے دوران ملاقات کی اور بتایا کہ وہ دہلی ... اسکول میں معلم ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ غالب

نے ان کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مرزا یوسف علی خاں عزیز
بلی ماراں میں ایک ہندو رئیس کے لڑکوں کو بھی پڑھایا کرتے تھے۔
عبدالغفور نساخ ہی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علی خاں عزیز نے
انیس و دبیر کے مرثیوں میں بہت سی غلطیاں نکالی تھیں اور ان کے بہت سے مرثیوں کا
جواب لکھا تھا۔ ان کو مرثیہ گوئی اور شعر خوانی کی بھی کافی مشق تھی جس کی بنا پر غالب نے انکو
حکیم احسن اللہ خاں کے حوالے کیا جن کی وساطت سے انھوں نے بہادر شاہ ظفر سے
خلعت چار پارچہ اور گوشوارہ پایا اور سراج الشعرا اور سراج الذاکرین کہلانے لگے۔ ۱۸۵۷ء
تک ان کو قلعہ معلی سے تیس روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ بہادر شاہ ظفر کے رنگون جلاوطن
ہو جانے کے بعد وہ وظیفہ مسدود ہو گیا۔ محض معلمی پر گزر اوقات ممکن نہیں تھی۔ ناچار
یوسف علی خاں عزیز نے بھوپال کا قصد کیا اور وہیں ۱۲۲۹ھ میں راہی قضا ہوئے

نساخ نے یہ شعر نقل کئے ہیں:

بدطالعی سے نیک نہ ہوگا مآل کار — بگڑی ہی میں کوئی کام بنایا نہ جائے گا
ناصح کی ناتوانی میں ہم سن کے کیا کریں — سر ان کے آستاں سے اٹھایا نہ جائے گا
ہم یہ کہ اپنی موت کو تم بن طلب کریں — تم وہ کہ ہم کو تم سے بلایا نہ جائے گا

(سخن شعرا ص ۳۲۶،
خمخانۂ جاوید ص ۵۸۶، ص ۵۸۵،
گلستان سخن ص ۳۶۵، ص ۳۶۶)

عزیز الدین

عود ہندی میں ایک خط مولوی عزیز الدین کے نام ملتا ہے۔ اسے غلام رسول
خطوط غالب دوم میں نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ عزیز

کون صاحب تھے ۔" عبدالغفور نساخ نے اپنے تذکرہ میں عزیزالدین کے مختصر مگر جامع حالات لکھے ہیں ، اسی طرح گلستانِ سخن بھی ان کے ذکر سے خالی نہیں ۔

عزیزالدین ' مولوی اساس الدین کے بیٹے اور اپنے دَور کے مشہور عالم حافظ ابوالمویدخاں کے پوتے تھے ۔ قادر بخش صابر نے اپنا تذکرہ ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء میں مکمل کیا ہے ۔ اس میں وہ عزیزالدین کی عمر تیس سال بتاتے ہیں ۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ عزیزالدین ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے ۔ ان کا اصل وطن بدایوں تھا لیکن انھوں نے اپنے والد اور بھائی سعیدالدین سعید کے ہمراہ دہلی میں سکونت اختیار کرلی تھی ۔

عزیزالدین کے بھائی سعیدالدین سعید زین العابدین خاں عارف کو اپنا کلام دکھاتے تھے ۔ ان کی وجہ سے عزیزالدین نے بھی شاعری میں دلچسپی لینا شروع کردی ۔ کچھ دنوں کی مشق کے بعد اپنے نام کے جزو عزیز کو بطور تخلص لکھنا شروع کیا لیکن بعد میں صادق تخلص کرکے غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے ۔

اس کے کچھ دنوں بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوگیا جس پر وہ اپنا تمام مال واسباب ' سازوسامان اور ذاتی مکان چھوڑکر بدایوں چلے گئے ۔ جب کچھ امن و امان کی صورت ہوئی تو غالب سے دہلی کے حالات معلوم کرنا چاہے ۔ غالب نے لکھا :

"کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو ، دہلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسے آگے تھی ۔ قاسم جان کی گلی میر خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک بے چراغ ہے ۔ ہاں اگر آبادی ہے تو یہ ہے کہ غلام حسین خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاءالدین خاں کے کمرہ میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں ۔"

غالب کے اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیزالدین نے غالب کے پاس کوئی محضر بھیجا تھا جس پر صدرالدین، ایزد بخش، تراب علی، حکیم احسن اللہ خاں، غلام نجف خاں بہادر بیگ اور نبی بخش خاں کی مہریں ہونا تھیں۔ غالب نے اس کے جواب میں اطلاع دی

"مولوی صدرالدین صاحب لاہور، ایزد بخش، تراب علی، ان لوگوں سے میری ملاقات نہیں، میں نے آپ مہر کر دی، حکیم احسن اللہ خاں اور میاں غلام نجف اور بہادر بیگ اور نبی بخش خاں ساکن دریبہ ان کی مہریں ہوگئیں، محضر آپ کے پاس بھیجتا ہوں"

مالک رام نے عزیزالدین کو عالم و فاضل شخص بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وہ کچھ دنوں پیلی بھیت میں منصف رہے، مالک رام ہی کے بیان کے مطابق عزیزالدین کے انتقال کی تاریخ ۲۵ نومبر ۱۸۹۳ء مطابق ۱۶ جمادی الاول ۱۳۱۱ھ ہے، یہ چند شعر ان کے نتائج افکار سے ہیں:

اس تنگ نائے دہر میں ہم جس کو اے عزیز ۔۔۔ دلدار سمجھے تھے وہ دل آزار ہو گیا

رہے تا بعد مردن بھی علامت جذب کی باقی ۔۔۔ بنایا سنگ مقناطیس سے صادق کے مدفن کو

ہم دم ذبح تجھے بھر کے نظر دیکھ تو لیں ۔۔۔ کاش کہ تیز ترا خنجر خوں خوار نہ ہو

لے گئی دل اک نگہ میں اسکی چشم نیم خواب ۔۔۔ مست ہم سمجھے تھے اس کو پر بہت ہشیار ہے

اک نگاہِ ناز سے ہے کام اپنا سب تمام ۔۔۔ قتل کرنے کو مرے کیا تیر و پیکاں چاہیے

(سخن شعرا صفحہ ۳۲۷، گلستان سخن دوم صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۱

خطوط غالب دوم صفحہ ۳۳۶، تلامذۂ غالب صفحہ ۱۹۳)

عزیز صفی پوری

آصف الدولہ نے اپنے دارالانشا کی از سر نو تنظیم کرنے کے بعد فیض محمد ابن خواجہ احمد

کو میر منشی کی خدمت سپرد کی۔ فیض محمد کی اولاد میں منشی رونق علی نے نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں، منشی ثاقب علی خاں نے غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں اور منشی محمد یحییٰ علی خاں نے محمد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے زمانے میں اسی عہدہ پر نیک نامی کے ساتھ کام کیا۔ آخر الذکر، محمد ولایت علی خاں عزیز صفی پوری کے والد تھے۔

عزیز صفی پوری ۸ مارچ ۱۸۴۳ء کو صفی پور میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے نانا شیخ محبوب عالم کی سکونت تھی، ان کے والد منشی یحییٰ علی خاں اور چچا منشی احمد علی خاں لکھنؤ میں رہتے تھے، اس لیے ان کا بچپن لکھنؤ ہی میں گذرا۔ اسی زمانے میں انھوں نے پہلی مرتبہ غالب کا نام سنا اور ان کے شعری و نثری کمالات سے آگاہ ہوئے۔ خود اپنی تصنیف سوانح اسلاف میں لکھتے ہیں:

"واجد علی شاہ کے عہد میں جب میں نو دس برس کا تھا، سید احمد حسین میکش نوجوان۔ بصورت غالب کے شاگرد لکھنؤ میں آئے تھے اور جناب والد ماجد مغفور اور عم مرحوم منشی احمد علی سے اور ان سے رابطہ تھا اور اکثر یہیں بیٹھے رہتے تھے عم مرحوم منشی احمد علی نے غالب کی چار غزلیں ایک بیاض میں لکھ رکھی تھیں"

یہ ان کا غالب سے پہلا تعارف تھا۔ ابھی ان کی عمر بارہ تیرہ برس کی تھی کہ پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہر بڑے سے بڑے شہر اور چھوٹے چھوٹے علاقے میں آزادی کی روح جاگ اٹھی۔ انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد شہر کے شہر قید خانوں اور پھانسی گھروں میں تبدیل کر دئے۔ شیوخ و اکابر کو بھی گرفتار کیا جانے لگا۔ منشی محمد یحییٰ خاں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ لکھنؤ سے نکل کر صفی پور چلے جائیں۔ صفی پور آنے کے بعد عزیز صفی پوری نے مولوی لیاقت حسین، مولوی محمد علیم مولوی نصرت علی اور مولوی رضا علی سے عربی اور فارسی علوم کی تحصیل کی اور نظم و نثر سے دلچسپی لینے لگے جس پر ان کو مشورہ دیا گیا کہ "دہلی میں اسد اللہ خاں غالب فارسی کے استاد ہیں، ان

سے خط و کتابت کے ذریعے اصلاح لی جاتے "عزیز صفی پوری نے بچپن میں سید احمد حسین میکش کو دیکھا تھا۔ چنانچہ ان ہی کی وساطت سے غالب سے فارسی نظم و نثر کی اصلاح کی درخواست کی جسے غالب نے قبول کر لیا اور ان کو اطلاع دی کہ میر احمد حسین میکش کو انگریزوں نے مار ڈالا ہے۔ جس پر عزیز صفی پوری نے اپنی پہلی تصنیف پنج رقعہ اصلاح کے لئے غالب کو بھجوائی۔ غالب نے اسے پڑھ کر جواباً تحریر کیا:

"خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں، نگارش تمہاری پنج رقعہ سابق کی تحریر سے لفظاً و معناً بڑھ کر ہے۔ اس میں یہ معانی نازک اور الفاظ آبدار کہاں، مگر ایک رو سے تمہیں آگاہ کرتا ہوں کہ یہ نثر ظہوری کی نہیں ہے۔ ارادت خاں تخلص واضح عالم گیری سرداروں میں سے ایک شخص تھا۔ مینا بازار اور پنج رقعہ اس کی فکر کا نتیجہ ہے۔ توالی کثرات کی طرز ایجاد اسی کی ہے۔ موجد سے مقلد بہتر نکلا، یعنی تم نے خوب لکھا" نقاش نقش ثانی بہتر کشد از اول"

عزیز صفی پوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تین سال تک غالب سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں اس سلسلہ کو موقوف کر کے حضرت خادم صفی پوری کے حلقہ ارادت میں شمولیت اختیار کر لی اور آزادانہ بسر کرنے لگے۔

حضرت خادم صفی پوری نے ان کو منشی کا خطاب دیا تھا۔ اس خطاب نے اتنی شہرت پائی کہ وہ اپنے اہل خاندان کے علاوہ ہر خاص و عام میں "منشی جی" کے نام سے پکارے جانے لگے۔ ان کو اپنے مرشد سے ایسا عشق اور ایسی محبت تھی کہ انھوں نے سات روپے ماہانہ پنشن پر اپنی زندگی گذار دی لیکن اپنے مرشد کے در سے الگ ہونا پسند نہیں کیا۔ عزیز صفی پوری نے ۱۳ رمحرم ۱۳۴۷ھ مطابق ۲۰ رجولائی ۱۹۲۸ء کو ۸۸ سال کی عمر میں انتقال کیا اور اپنے مرشد کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

عزیز صفی پوری کی تصانیف کی تعداد چالیس سے زائد ہے ۔ ان میں دیوان ولایت دیوان عزیز، انوار تجلی، نعت محبوب، ولائے الصنائع، اعجاز التواریخ، ذکر جمیل، حسرت دل، خیبر جبیر، اعجاز محمدی، فتح مبین، ماہ شب افروز، پنج رقعہ، ولایت، ارمغان، نظم دلفریب اور سوانح اسلاف نے زیادہ شہرت پائی ۔ ان کے اردو اور فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے

دو عالم بہ کاکل گرفتار داری
بہ ہر مو ہزاراں سیہ کار داری
جمالِ درخشندہ برق تجلی
لب نوش دارو ئے بیمار داری
روائے تو بے زخم در خون پنہاند
کہ نادید عشاق بسیار داری
عزیز اللہ اللہ کہ از کفر عشقش،
نہاں در تہہ خرقہ زنّار داری

ہر چند کہ آگاہم، شوریدہ و گم راہم
در جوشش انا الحق، دیوانہ چنیں باید
چوں شمع برافروزد، شب تا بہ سحر سوزد
گریاں بہ گداز آید پروانہ چنیں باید
صد دیر و حرم جوشد، از ہر در و دیوارش
در مشرب ما رنداں میخانہ چنیں باید

شراب عشق در پیمانہ کردی
بیک پیمانہ ام مستانہ کردی

بیک غمزہ مرا از خود رُبودی
بیک عشوہ مرا دیوانہ کردی
بہ افسونِ نظر دادی فریبم!
بہ رسوائی مرا افسانہ کردی
بہ محفل شمع گشتی گل بہ گلشن
ستم بر بلبل و پروانہ کردی

الفت زندگی نہیں جاتی، جان بے عشق دی نہیں جاتی
جائے گی ایک دن فراق میں جان کیا ہوا گر ابھی نہیں جاتی
جان جائے تو آرزو جائے یہ بلا جیتے جی نہیں جاتی
ہوش جاتے ہیں جب وہ آتے ہیں دل کی حالت کہی نہیں جاتی
کیا کہوں اپنا ماجرا ہے عزیز دل گیا بے خودی نہیں جاتی

(سوانح اسلاف ص۱۱۸، تذکرہ ص۱۳۳ دیباچہ مخزن ولایت

تلامذہ غالب ص۲۳۶ • نقوش مکاتیب نمبر جلد اول ص۱۰۱

آجکل اپریل ۱۹۶۳ء)

شیخ عطا حسین مارہروی

شیخ عطا حسین مارہروی حکیم نجف علی مارہروی کے صاحبزادے تھے، جن کا سلسلۂ نسب دسویں پشت میں حضرت خواجہ حسن ملتانی تک پہنچتا ہے۔ المشاہیر کے مؤلف نے ان کو خوش مزاج نیک خو، بذلہ سنج اور لطیفہ گو بتایا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ان کی عربی اور فارسی کی اعلیٰ استعداد تھی۔ وہ ہر شخص کے ساتھ خلوص و نیاز

اور دلسوزی سے ملتے ۔ عزیز و آشنا کی تکلیف دیکھ کر دل بھر آتا تھا اور آبدیدہ ہو جاتے تھے ۔

شیخ عطا حسین عطا کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی ، اس سلسلہ میں ان کو غالب سے تلمذ تھا ۔ غالب ان کے نہ صرف قدرشناس تھے بلکہ ان کو پرگو اور مشاق نظم گو بھی تسلیم کرتے تھے ۔ شیخ عطا حسین عطا کا ذریعہ آمدنی معلمی تھا ۔ اس کے علاوہ زمینوں کی آمدنی سے بھی معقول رقم حاصل ہو جاتی تھی ۔ ان کے خاندان میں ان کی ایک بیوی اور ایک لڑکا حسن عسکری شامل تھا ، حسن عسکری سے متعلق سلسلہ عمالیہ کے مؤلف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس درجہ قوی ہیکل اور دیوپیکر تھا کہ اس کے سامنے ہندوستان کے نامی گرامی پہلوان ہیچ نظر آتے تھے ۔ وہ عین جوانی میں انتقال کر گیا ۔ اس صدمے سے شیخ عطا حسین عطا کی صحت جواب دے گئی ۔ وہ بیوی ، نوجوان بہو اور اکلوتی پوتی کو دیکھ کر جینے لگے ۔ اسی دوران انھوں نے اپنے بیٹے کا غم غلط کرنے کے لئے اپنی بیوی کے بھانجے کو متبنیٰ بنا لیا ۔ جب یہ بھانجہ پڑھ لکھ کر کسی قابل ہوا تو اس کے والدین نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا اور زبردستی اٹھا کر لے گئے ۔ اس واقعہ کا شیخ عطا حسین عطا رکے دل پر بہت زیادہ اثر ہوا اور انھوں نے شکایت صحابت کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی اور اسے غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا ۔ غالب نے اس مثنوی کا ذکر چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

”یہ مثنوی تو میرے واسطے ایک مرثیہ ہو گئی ہے ۔ اس بزرگوار کے جگر میں کیا کیا گھاؤ پڑے ہوں گے تب یہ تراوش خوننابہ ظہور میں آئی ہو گی ۔ مزہ یہ ہے کہ عنوان بیان سے حق بجانب انھیں کے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اصل کار میری نظر میں نہیں اور حقیقت حال مجھ پر مجہول ہے ، اس واسطے انجام و آغاز ، اندازہ و انداز کچھ نہیں سمجھ سک

اصلاح کو آپ بہ نظر اصلاح ملاحظ فرمالیں، میں نے حسب دستور اپنے ہر جگہ منشائے اصلاح لکھ دیا ہے"

اس مثنوی کے نام سے اس کا سال تصنیف برآمد ہوتا ہے - یہ مثنوی بڑی طویل ہے، ہم اس کے چند شعر درج کرتے ہیں -

ہمد مو کس لئے یہ کاوش ہے ۔۔۔ کون سے بغض کی نزادش ہے

میں تو تعظیم میں رہوں سرگرم ۔۔۔ تم کو اس کی بھی نہ آئے شرم

میرے آزار پر کمر بندی ۔۔۔ اللہ اللہ اے خردمندی

عوض خدمت زن و اطفال ۔۔۔ خوں مرا تم کیوں ہوا ہے حلال

اے سر سروران دولت مند ۔۔۔ کون کرتا ہے یہ طریق پسند

اٹھ کے کیوں آئے تھے لڑائی کو ۔۔۔ دیکھتے خوردی اور بڑائی کو

گھر پہ چڑھ آنا طرفہ تھا مضموں ۔۔۔ مرضی فطرت اور تھا یہ جنوں

ورنہ یہ کیا رموز دانش تھا ۔۔۔ یہ تو صاحب قصور دانش تھا

کہو کیا عقل تھی یہ فرماؤ ۔۔۔ اپنے دل میں ذرا تو شرماؤ

اس مثنوی کا چرچا ہوا تو ایک بار پھر خانہ جنگی کا باب کھل گیا اور شیخ عطا حسین عطا کے عزیز و اقارب ان پر طنز و تشنیع کرنے لگے جس کی وجہ سے ان کی طبیعت اتنی گری کہ وہ آخر وقت تک سنبھل نہ سکے اور اسی عالم میں ۷، ذی الحجہ ۱۲۹۶ھ کو انتقال کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :

کہیں جو شیشۂ مے ساقیا فرا ٹوٹا — تو جانیو کہ مرا دل ہزار جا ٹوٹا
مصاحب آئینہ ٹھہرا ہے اس خودآرا کا — اب اپنی دید کا بھی اس سے آسرا ٹوٹا
کسی کا بال بھی ٹوٹے تو سانس لیتا ہے — یہ میرا شیشۂ دل تھا کہ بے صدا ٹوٹا
مری شکستہ دلی کی دلیل ہے یہ عطا — کہ ہے ردیف غزل میں بھی جا بجا ٹوٹا

(المشاہیر ص۲۳۶، ص۲۳۹ ص۲۸۰
تلامذۂ غالب ص۲۳۸، ص۲۳۹
قومی زبان کراچی جولائی ۶۶ء)

نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ

نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ۔ نواب امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو کے صاحبزادے تھے۔ ان کی والدہ ولی النساء بیگم نواب غضنفر الدولہ محمد وزیر بیگ عرف مینڈھو خاں رسالدار اودھ کی صاحبزادی تھیں۔ علائی کی تاریخ پیدائش ۲۵ اپریل ۱۸۳۲ء مطابق ۴، ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ اور مولد دہلی ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی غالب نے کی جس کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد ترکی عربی اور فارسی میں ملکہ پیدا کر لیا علاوہ ازیں اردو اور فارسی میں شعر بھی کہنے لگے۔ غالب نے ان کے لیے شمسی تخلص تجویز کیا لیکن ان کے خیال میں اس تخلص کی تصحیف لشمی سے ہو سکتی تھی۔ وہ اسے قبول کرنے کی بجائے اس پر معترض ہوتے۔ جس پر غالب نے لکھا؛

"تخلص تمہارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔ پشیمی کو بہ تکلف اس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ۔ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کی خ کو جیم فارسی سے بدل دو، بنی کو بہ تقدیم موحدہ علی النون لکھو، یہ وسواس دل سے دور کرو۔ رہرو ایک اچھا تخلص ہے۔ ستون اس کی تصحیف ہے۔ تمہارے واسطے بہ مناسب اسم عالی تخلص خوب تھا۔ مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گذر چکا ہے۔ ہاں نامی سامی یہ دو تخلص بھی خوب ہیں، مولانا فائق کی پیروی کرو، مولانا لائق کہلاؤ۔ اگر کہو گے کہ اس ترکیب سے لفظ نالائق پیدا ہوتا ہے، مولانا شائق بن جاؤ،

ہنسی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقت واجبی سنو، نسیمی تخلص ہے خماسی بروزن ظہوری و نظیری اچھا ہے۔ اگر بدلنا منظور ہے تو نامی سامی رہرو، شیون یہ چار تخلص رباعی بروزن عرفی و غالب اچھے ہیں۔ ان میں سے ایک تخلص قرار دو، میرے نزدیک سب سے بہتر تمہارے واسطے خاص فخری تخلص ہے کہو گے کہ آزاد پور کے باغ میں ایک آم کا نام فخری ہے . . . . بھائی موبد تخلص نیا ہے، اگر یہ پسند آجائے تو یہ رکھو"

غالب، نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو بے حد چاہتے تھے۔ ایک سند بھی لکھ کر دی تھی، جس کے ذریعہ ان کو اپنے بعد فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا تھا۔ سند کے الفاظ یہ ہیں:

"میں نے دبستان فارسی کا تم کو جانشیں قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اسی برس کی عمر ہوئی ہے اور جانا کہ میری زندگی بر سبیل کیا مہینوں کی نہ رہی، شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیتوں، ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے، دس بیس دن کی بات رہ گئی

ہے، اپنے ثبات حواس میں اپنے دستخط سے یہ توقیع تم کو لکھے دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو۔ چاہئے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے، ویسا تم کو جانیں اور جیسا مجھ کو مانتے تھے ویسا تم کو مانیں "

نواب علاء الدین احمد خاں علائی کی شادی نجیب الدولہ کے پوتے جلال الدین احمد خاں کی صاحبزادی شمس النساء بیگم سے ۱۸ ارفروری ۱۸۵۵ء مطابق ۳۰ جمادی الاول ۱۲۷۱ھ کو ہوئی تھی۔ شمس النساء بیگم کے بطن سے ان کے پانچ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ پہلا بیٹا یحییٰ پیدا ہونے کے کچھ دنوں بعد مر گیا تو غالب نے اس کی رحلت کی تاریخ لکھی۔ علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

ان دنوں میں کہ سب طرح کے رنج و غم فراہم ہیں۔ ایک داغ جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سبحان اللہ میں نے اس کی صورت بھی نہ دیکھی، یا ولادت کی تاریخ ستی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی ..... بارے ایک قطعہ درست ہوا۔ مگر تمہاری زبان سے یعنی گویا تم نے کہا ہے، پانچ شعر ہیں۔ تین زاید دو موضح مدعا، لیکن میں نہیں جانتا کہ تعمیہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔ ہاں اغلاق تو البتہ ہے، تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوح مزار پر کھدوانے کے قابل ہو۔

در گریہ اگر دعویٰ ہم چشمی ما کرد — بینی کہ شود ابر بہاری خجل از ما
ناچار بگریم شب و روز کہ ایں سیل — باشد کہ برد کالبد آب و گل از ما
گفتی کہ نگہدار دل از کشمکش غم — خود گرد برآورد غم جاں گسل از ما
یحییٰ شدہ از شعلۂ سوز غم ہجرش — چوں شمع دود دود لبِ منفعل از ما
غم دیدہ نسیمے بپئے تاریخ وفاتش — بنوشت کہ در داغ لب سوختہ دل از ما

ما کے عدد ۴۱، دل کے عدد ۳۴ - ما میں سے دل گیا، گویا ۴۱ میں سے ۳۴ گئے - باقی رہے سات، وہ داغ پسر پر بڑھاتے ۱۲۷۴ھ ہاتھ آتے -''

جب نواب امین الدین احمد خاں کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ لوہارو کا انتظام، درست کرنے کے قابل نہیں رہے تو اہل خاں نے نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو ان کا جانشین تسلیم کرتے ہوئے گدی پر بٹھا دیا - "ریاست خداداد" اس واقعہ کی تاریخ ہے - اس طرح ۱۵ راگست ۱۸۷۴ء کو وائسرائے لارڈ بروک نے علائی کو فخر الدولہ، دلاور الملک اور رستم جنگ کے خاندانی خطابات اور اختیارات تفویض کر دئے۔

نواب علاؤ الدین احمد خاں کو اپنی زندگی میں کبھی بھی انتظامی امور سے سابقہ نہیں پڑا تھا - ان کی شاہ خرچیوں نے آمدنی اور خرچ کا توازن بگاڑ دیا، جس کے نتیجہ میں ریاست کی مالی اور اقتصادی حالت روز بروز تباہ ہوتی چلی گئی - جب ریاست پر ایک لاکھ روپے سے زاید رقم کا قرض چڑھ گیا تو حکومت انگریزی نے دخیل ہو کر نواب علاء الدین خاں علائی کو ریاست سے بے دخل کر دیا اور ان کی جگہ ان کے صاحبزادے سر امیر الدین احمد خاں سربراہ بنائے گئے -

نواب علاء الدین احمد خاں علائی کو لکھنے پڑھنے کے علاوہ کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں تھی - وہ جب دہلی میں اپنے مکان واقع بلّی ماراں میں رہا کرتے تھے، کبھی کبھی جلسہ شطرنج ہوا کرتا تھا - انھوں نے لوہارو میں فخر المطابع کے نام سے ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا تھا، جہاں سے علمی و ادبی کتابیں شائع ہوتی رہتی تھیں، اسکے باوجود علائی نے اپنی کوئی علمی یادگار چھوڑی نہ اپنا دیوان چھپوایا - ان کی تاریخ وفات ۳۱ راکتوبر ۱۸۸۴ء مطابق ۱۱ر محرم ۱۳۰۲ھ ہے - انکے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

اللہ رے بے ثباتی عمر فنا پسند　　　بجھتا ہے یہ چراغ پلک کی ہوا کے ساتھ

دہاں پذیر درد اگر ہے تو خاک ہے
دل جان کیوں نہ درد کے بدلے دوا کیساتھ
شکوہ ہے کیوں قبول ہیں گر ہو مضائقہ
آخر کسی کا نام تو لوں میں دعا کیساتھ

دنیا کی خیر و خوبی میں بیل ونہار لو
کب جانتی ہے خلق کہ کیوں کر گذر گئے
راتیں جو تھیں تمام ہوئیں ناؤ نوش میں
دن یوں کٹے کہ گھر سے ادھر سے اُدھر گئے
جب عافیت کا قافیہ ہوتا ہے تنگ تر
روتے ہیں ان دنوں کو کہ ہائے کدھر گئے

جس جا کہ تھا ترانۂ بلبل نشاط خیز
اس جا پر آج دل شکن آواز زاغ ہے

(تلامذۂ غالب ص ۲۳۲ تا ص ۲۴۳، ادبی خطوط غالب ص ۲۶۹ تا ص ۲۴۳
کلیات نظم غالب سوم ص ۳۰۶، خطوط غالب دوم ص ۹۳، ص ۹۶ وغیرہ)

عبداللہ خاں علوی

عبداللہ خاں علوی غالب کے فارسی گو معاصرین میں سے ایک تھے۔ غالب نے اپنی ایک غزل کے قطعہ میں ان کو اس طرح یاد کیا ہے:

ہندرا خوش نفسانند سخن ور کہ بود
بادِ در خلوت شاں مشک فشاں ازدم شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی و انگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بہ شمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شاں

عبداللہ خاں علوی کے حالات بہت کم تذکروں میں ملتے ہیں، ریاض الفردوس

کے مولف نے ان کو خورجہ کا رہنے والا بتایا ہے اور اس امر کی صراحت کی ہے کہ وہ بچپن ہی میں دہلی چلے آئے تھے اور دہلی ہی ان کا وطن بن گیا تھا۔

سرسید احمد خاں نے ان کی علمی بزرگی کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ خاں علوی اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث ہر فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے، قادر بخش صابر نے بھی اپنے تذکرہ میں ان کے علم و فضل کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کو "خاتم نبوت سخن" قرار دیا ہے۔

جب دہلی والوں پر دہلی تنگ ہونے لگی تو عبداللہ خاں علوی بھی دوسرے بعض مشاہیر کی طرح اس سے دل برداشتہ ہو گئے اور تلاش معاش میں یورپ کا قصد کیا۔ جہاں ایک انگریز نے ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر ان کی قدردانی کی اور چند سے اوقات ان کی صحبت میں گزارے۔ عبداللہ خاں علوی نے اس سے جدا ہونے کے بعد طبابت شروع کی اور اس میں اس قدر کمال حاصل کیا کہ گردونواح کے رہنے والے ان کے گرویدہ ہو گئے۔ اسی اثناء میں فرخ آباد کے علاقے شمس آباد کے رئیس مرزا دولھا نے ان کو اپنی رفاقت میں لے لیا اور درخواست کی کہ وہ اسی کے ساتھ رہیں، جس پر عبداللہ خاں علوی نے اسی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس عرصہ میں کئی موزوں طبع ان کے فیض سخن سے پایۂ شاعری کو پہنچے اور ہزاروں بندگان خدا نے شفا پائی۔

کچھ دنوں بعد عبداللہ خاں علوی پر بیماری نے یورش کر دی اور اس مرض نے اس درجہ طول کھینچا کہ وہ کئی مہینہ تک فریش رہنے پر مجبور رہے۔ اور اسی بیماری کے عالم میں ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ مولانا امام بخش صہبائی ان کے تلامذہ میں سے تھے۔ انھوں نے ان کے انتقال پر مندرجہ ذیل قطعہ کہا:

علوی کہ چو روئداد کس در د سخن | چوں رو نہ رسیدہ کس بہ فریاد سخن
ناگہ ز جہاں رخت اقامت بر بست | ہاتف گفتا فتاد بنیاد سخن

نساخ نے اپنے تذکرہ میں عبداللہ خاں علوی کا سال انتقال ۱۲۶۳ھ اور مدفن شمس آباد بتایا ہے۔ گلستانِ سخن کے مولف کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نظم و نثرِ فارسی کے علاوہ ریختہ میں بھی فکر کرتے تھے۔

نساخ نے اپنے تذکرہ میں ان کے تین شعر نقل کئے ہیں، اسی طرح صابر کے تذکرہ میں ان کے پانچ شعر ملتے ہیں۔ اسی تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھی دو چار شعر ریختہ بھی موزوں کر لیتے تھے۔ لیکن ان کی تمام تر شاعری فارسی سے عبارت ہے۔ ان کا نمونۂ کلام یہ ہے:

مضموں کا فکر کیا کریں اس کی سخن میں ہم
گم ہیں خیال تنگیٔ کنج دہن میں ہم

کیا دم تھا کل جو دیکھ کے یارب نسیم صبح
غنچے کی طرح پھول گئے پیرہن میں ہم

دل غم سے تنگ سینہ سراپا الم سے خوں
لائے ہیں ایک غنچہ مگر اس چمن میں ہم

مت پوچھ ہم نشیں کہ یہ راتیں فراق کی
کس طور سے ہیں کاٹتے رنج و محن میں ہم

چھوٹے کمر کی فکر کی جو پیچ و تاب سے
الجھے خیال زلف شکن در شکن میں ہم

(ریاض الفردوس ص ۱۱۸، سخن شعرا ص ۳۳۴، گلستان سخن ص ۲۲۵ تا ص ۲۲۶، کلیات نظم غالب، تذکرہ اہل دہلی ص ۱۹۱ تا ص ۱۹۲)

نواب میر علی نقی خاں

نواب میر علی نقی خاں، نواب ذوالفقار خاں کی اولاد میں سے تھے۔ ان کی سکونت دہلی ہی میں تھی لیکن وہاں ان کی قدر افزائی نہیں ہوئی اور ان کو کوئی مناسب ذریعہ معاش نہیں مل سکا، جس پر بددل ہو کر انھوں نے ۱۸۵۴ء کے لگ بھگ ترک وطن کا فیصلہ کیا اور اس سلسلہ میں غالب سے درخواست کی کہ وہ ان کے لئے ریاست جے پور میں کوشش کریں۔ ان دنوں غالب کے ایک شاگرد سید بدرالدین کاشف المعروف فقیر کا تعلق ریاست جے پور سے تھا۔ غالب نے ان سے نواب میر علی نقی خاں کی پُرزور سفارش کی اور لکھا:

"نواب میر علی نقی خاں صاحب آپ سے ملیں گے، یہ بہت عالی خاندان ہیں، نواب ذوالفقار خاں اور نواب اسد خاں کی اولاد ہیں اور تمہارے ماموں نواب محمد میر خاں کے بڑے دوست ہیں۔ اب نوکری کی جستجو میں نکلے ہیں۔ آپ ان کی تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور راج کا حال سب ان پر ظاہر کریں اور اہالی سرکار سے ان کو ملوا دیں کیا خوب ہو کہ اس سرکار میں نوکر ہو جائیں اور اگر نوکری کی صورت نہ بنے تو راج سے ان کی رخصت بہ آئین شائستہ عمل میں آئے۔ نواب اسد خاں عالمگیر کے وزیر تھے اور فرخ سیر ان کا بٹھایا ہوا تھا۔ جب فرخ سیر نے ذوالفقار خاں کو مار ڈالا تو از روئے کتب تواریخ ظاہر ہے کہ سلطنت کیسی برہم ہوگئی اور خود فرخ سیر پر کیا گذری۔ قصہ کوتاہ ان کی تقریب میں جو مدارج آپ کریں گے اور جس قدر آپ ان کی بہبود میں کوشش کریں گے احسان مجھ پر ہوگا۔"[۱۲]

اس وقت ریاست جے پور کے سیاسی اور داخلی معاملات بے طرح الجھے ہوئے تھے جن کی بنا پر نواب میر علی نقی خاں کو کامیابی نہیں ہو سکی۔ اس صورت حال کی اطلاع سید بدرالدین کاشف الحروف فقیر نے غالب کو دے دی اور کہا کہ وہ اسے نواب میر علی نقی خاں پر واضح کر دیں۔ اس کے جواب میں غالب نے ان کو لکھا:

"نواب علی نقی خاں کے خط کے جواب میں جو آپ نے مجھ کو لکھا تھا، وہ مجھ کو یاد رہے گا جب نواب صاحب آجائیں گے میں انکو سمجھا دونگا"

(خطوط غالب دوم ص ۳۶۳)

علی بخش خاں

علی بخش خاں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران انگریزوں کی بڑی خیر خواہی کی تھی اور ان کو مجاہدوں کی گرفت سے بچایا تھا، انھوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد علی بخش خاں کو ان کی خدمات کے صلہ میں نہ صرف پانچہزار روپے کی خلعت، تلوار اور گھوڑی دی تھی بلکہ ضلع مرادآباد میں تین ہزار چودہ روپے سالانہ کی جاگیر سے بھی سرفراز کیا۔

علی بخش خاں، شیخ محبوب بخش کے صاحبزادے اور شیخ امان اللہ کے پوتے تھے۔ ان کا مولد نجیب آباد اور تاریخ تولد ۱۴، شوال ۱۲۲۸ھ ہے۔ ان کے اہل خاندان ریاست رام پور کے دیرینہ خدمت گذار تھے۔ نواب کلب علی خاں نے اپنے تخت نشین ہونے کے چند ہی دنوں بعد ان کی خدمت گذاریوں پر نظر کرتے ہوئے ان کو چالیس ہزار روپے کی خطیر رقم بطور انعام دی۔

غالب کی رام پور میں آمد و رفت رہتی تھی۔ وہ یہاں کے اکثر لوگوں سے واقف ہو چکے تھے اور بہت سوں سے تحریری اور تقریری ارتباط بھی پیدا کر لیا تھا۔ علی بخش خاں سے بھی ان کا تفصیلی تعارف ہو چکا تھا۔ چنانچہ غالب نے ایک مرتبہ حسن علی

خاں کے بیٹوں سے متعلق ان سے سفارش کی، جس کا علم نواب کلب علی خاں کو بھی ہو گیا اور وہ غالباً ناراض ہوئے - غالب کو اس واقعہ کی اطلاع ملتے ہی انھوں نے یوں معذرت ظاہر کی :

" لازم کر لیا ہے کہ بے ہودہ گذارش نہ کروں اور کبھی کسی کی سفارش نہ کروں، بھائی حسن علی خاں کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں کو لکھا اس کو میں سپارش نہ سمجھا تھا - "

نواب کلب علی خاں، علی بخش خاں کا بڑا خیال رکھتے تھے - جب علی بخش خاں اپنے انتقال سے کچھ دن پہلے بیمار ہوئے تو نواب کلب علی خاں نے بہ نفس نفیس ان کے مکان جا کر ان کی عیادت کی - علی بخش خاں نے ۱۲ محرم ۱۲۸۴ھ کو انتقال کیا اور مولانا جمال الدین کے احاطہ مزار میں دفن ہوئے - ایک شخص آل محمد مارہروی نے ان کے انتقال پر یہ قطعہ تاریخ کیا -

علی بخش خاں مرد نامی گذشت ۔۔۔ بیاد زششس فضل رب غفور
بتاریخش آل محمد نوشت ۔۔۔ شدہ جنتی نائب رام پور

(اخبار الصنادید ص۱۴۱، تذکرہ کاملان رام پور ص۳۲۶
مکاتیب غالب ص۲۱)

علی بہادر ثانی

باندہ کے حکمرانوں کی تاریخ بہت دلچسپ ہے - وہ سب کے سب نومسلم تھے - بعض مورخوں نے ان کے حالات میں جو تفصیل بہم پہنچائی ہے - اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷۲۵ء میں پنا کے راجہ چھترسال نے پیشوا باجی راؤ سے محمد خاں بنگش صوبہ دار الہ آباد کے مقابلہ کے لئے مدد طلب کی تھی - جس پر باجی راؤ چھترسال

کی امداد کے لیے پہنچ گیا۔ اسی اثنا میں اس نے چھتر سال کی ایک لڑکی مستانی سے بھی شادی کر لی جسے محمد خاں بنگش کے لشکریوں نے بطور یرغمال رکھ لیا تھا، مستانی کے بطن سے پیدا ہونے والے لڑکے کا نام شمشیر بہادر تھا۔ یہی شمشیر بہادر باندہ کے حکمرانوں کے مورث اعلیٰ تھے۔

باجی راؤ کے انتقال کے وقت شمشیر بہادر کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ سرداران ریاست نے ان کو جانشین اور ہندو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس پر پیشوا بالا جی نے باندہ کا علاقہ دے کر ان کی مدد معاش مقرر کر دی۔ شمشیر بہادر پیشوا باجی راؤ کے چوتھے بیٹے اور پیشوا بالا جی کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھوں نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کی جانب سے نمایاں خدمات انجام دیں وہ مرہٹوں کی ہزیمت کے بعد دکن کی طرف فرار کر رہے تھے کہ راستہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادہ علی بہادر اول والی باندہ تسلیم کیے گئے۔ غلام قادر روہیلہ کی گرفتاری ان ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کے صلہ میں شاہ عالم نے ان کو چند اضلاع بطور انعام دیئے۔ ان کے انتقال پر ان کے صاحبزادہ شمشیر بہادر نے پونا سے باندہ پہنچ کر نظم و نسق سنبھالا۔ ۱۸۰۴ء میں انگریزوں نے ان سے باندہ کی ریاست لے کر چار لاکھ روپے سالانہ مقرر کر دیے۔ شمشیر بہادر ۳۱ اگست ۱۸۲۲ء کو لاولد فوت ہوئے۔ جس پر ان کا سوتیلے بھائی ذوالفقار بہادر گدی پر بیٹھے ۱۸۵۰ء میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے علی بہادر ثانی نے ان کی جگہ سنبھالی۔ یہی علی بہادر ثانی غالب کے ممدوح تھے۔ ان ہی کے بارے میں غالب نے لکھا ہے:

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامہ میں علی بہادر ثانی نے کئی انگریزوں کی جانیں بچائیں، لیکن بعد میں مجاہدوں نے ان کو اپنا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا - اس خطا پر انگریزوں نے ان کی ریاست ضبط کر لی اور جلا وطن کر کے اندور بھیج دیا جہاں چار لاکھ روپے سالانہ کی بجائے ان کو صرف تین ہزار روپے دیئے جانے لگے علی بہادر ثانی کسی کام سے بنارس گئے تھے کہ ۲۴ اگست ۱۸۷۳ء کو انکا انتقال ہو گیا

غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بہادر اوّل کی بیوی اور غالب کی ممانی دونوں حقیقی بہنیں تھیں - غالب نے انوار الدولہ شفق کے نام اس تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا ہے :

" میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا کہ نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور سند نشین حال کا چچا تھا - وہ میرا ہم شیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی کا اور اس نے اپنی پھوپھی کا دودھ پیا تھا - "

تذکرہ نویسوں نے علی بہادر ثانی کی شاعری کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ علی تخلص کرتے تھے - ان کو مرزا عباس بیگ، عباس بریلوی کے علاوہ منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی سے تلمذ تھا - تذکرہ نادر کے مولف کے بیان کے مطابق ان کا ایک دیوان بھی شائع ہوا تھا - ان کی ایک مثنوی مہر و ماہ بھی ۱۲۶۷ھ میں مطبع محمدی کانپور سے شائع ہوئی تھی، ان کے چند شعر یہ ہیں :

ہمیں سمجھتے ہیں کہ اس رنگ سرخ کی تہہ کو
عتاب چہرے سے ظاہر ہے پیار ہے دل میں

خیال زلف میں ہے رنج بے حساب میں روح
بلا میں ہے دل آشفتہ پیچ و تاب میں روح

بغیر ابر کے برسے ' نہ جائے گی گرمی
رلاؤ شوق سے مجھ کو بخار ہے دل میں

(خم خانۂ جاوید جلد سوم ص۲۰۱ ، ص۲۰۲ ،
یادگار ضیغم ص۵۲ ، سخن شعراء ص۳۳٦
خطوط غالب ص۲۵۱ ، آجکل فروری ۱۹۵۵ء)

عیشی ، طالب علی خاں

غالب نے چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں حضرت شاہ عالم مارہروی سے مخاطب ہوتے ہوئے حاشا ، حاش اللہ کے لفظوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ :

" اسے یا اسلوب نے ازراہ تصرف بمعنی زنہار قرار دیا ہے ، یعنی تاکید اگر منفی پر آئے تو نفی کی تاکید اور مثبت پر آئے تو اثبات کی تاکید "

اسی کے ساتھ وہ لکھتے ہیں :

" میں کسی حکم کا استعمال نہیں کرتا ، جب تک اہل زبان کا کلام میں نہیں دیکھتا ، عیشی بے چارہ لائق اس کے نہیں کہ مستند علیہ ٹھہرے ، مگر یہ لفظ غلط نہیں لکھا ہے اس غریب نے "

عیشی کسی معروف و مشہور ادبی شخصیت کا نام نہیں ہے ۔ تذکرۃ المشاہیر کے مؤلف نے ان کا نام طالب علی لکھنوی بتایا ہے ۔ عبدالغفور نساخ کے بیان کے مطابق وہ علی بخش خاں لکھنوی کے صاحبزادے تھے اور شاعری میں ان کو مرزا قتیل سے تلمذ تھا ۔ بعض تذکرہ نویس ان کو مصحفی کے تلامذہ میں شمار کرتے ہیں ۔ ان کی تصانیف میں دیوان فارسی و ریختہ اور نظم و نثر فارسی و اردو قابل ذکر ہیں ۔ ان کی ایک اور تصنیف سرو چراغاں کا بھی پتہ چلتا

ہے - ایف فیلن اور کریم الدین ان کو فارسی میں مرزا قتیل اور اردو میں مصحفی کا شاگرد بتاتے ہیں - ان کا انتقال عین جوانی میں ہوا - ان کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :

کون پابند جنوں فصل بہاراں میں نہ تھا
اس برس ننگ جوانی تھا جو زنداں میں نہ تھا

دل گرفتہ ہوں کروں گا ہو کے میں آزاد کیا ؟
مجھ کو یکساں ہے چمن کیا خانۂ صیاد کیا

ڈبوئیں انگلیاں کس بے گنہ کے خون میں تم نے
کہ جس کا رنگ ہے رشکِ گلِ شاداب ناخن پر

سخن اس کے عجائب لطف لکنت میں دکھاتے ہیں
نزاکت سے زباں پر حرف کیا کیا لڑکھڑاتے ہیں

تنِ تنہا مبادا منزلِ ہستی میں رہ جاؤ
اٹھو بیشی عدم کو قافلے یاروں کے جاتے ہیں

(سخن شعرا ص ۳۴۳ ، طبقات الشعرائے ہند ص ۴۳۲

تذکرۃ المشاہیر ص ۳۱ ، عودِ ہندی ص ۴۳)

زین العابدین خاں عارف

زین العابدین خاں عارف ، غالب کی بیوی کے حقیقی بھانجے تھے ، ان کے والد کا نام شرف الدولہ غلام حسین خاں بہادر سہراب جنگ تھا جو نواب فیض اللہ خاں بہادر کے بیٹے

اور نواب قاسم جان برادر عارف جان کے پوتے تھے۔

عارف ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ بنیادی بیگم اپنے شوہر سے علیحدہ رہتی تھیں انہوں نے ہی اپنے بیٹے کی تمام تر تربیت کا بوجھ سنبھالا اور تعلیم کے تمام مراحل گھر پر ہی طے کرا دیئے عارف نے دوسرے علوم و فنون کے علاوہ خط نسخ میں بھی ضروری استعداد بہم پہنچائی اور اس سلسلے میں بہادر شاہ ظفر کے استاد یاقوت رقم خاں ثانی، میر جلال الدین خوشنویس کے شاگرد ہوئے اور ان سے ایک سال کے اندر اندر استادی کی سند حاصل کر لی۔

عارف کے والد مسرور اور نانا معروف تخلص کرتے تھے۔ اس بنا پر عارف نے ابتدا ہی سے شاعری میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ اس وقت دلی میں شاہ نصیر کا طوطی بولتا تھا اور ان کی سنگلاخ اور مشکل زمینیں خاص و عام سب کے لیے طرز فکر بنی ہوئی تھیں۔ عارف بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے اور چند ہی دنوں کی مشق میں "مطلع مہر سعادت" کے عنوان سے ان کے رنگ کا ایک دیوان مرتب کر لیا۔ جب شاہ نصیر چندو لال شاداں کی دعوت پر حیدر آباد چلے گئے تو عارف نے اپنا کلام غالب کو دکھانا شروع کیا۔ غالب کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہی تھی انہوں نے عارف کو اپنا متبنیٰ کر لیا تھا۔ انہوں نے عارف کی شعری تربیت پر ضروری توجہ ہی نہیں دی بلکہ ان کو شاہ نصیر کے رنگ سے اس قدر دور کر دیا کہ وہ اپنے سابقہ کلام کو لغو ہی قرار دینے لگے۔

عارف نے دو نکاح کئے تھے۔ ان کی پہلی بیوی نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو کی صاحبزادی نواب بیگم تھیں۔ سنتوانسہ بچہ ہونے پر زچگی کے دوران ان کا انتقال ہو گیا تو عارف نے دوسرا نکاح مرزا محمد علی بیگ بخارائی کی صاحبزادی بستی بیگم سے کیا۔ بستی بیگم ہی کے بطن سے ان کے دو لڑکے مرزا باقر علی خاں کامل اور مرزا حسین علی خاں پیدا ہوئے جن کی پرورش غالب نے کی۔

عارف کو اپنی بیوی بستی بیگم سے بے حد محبت تھی۔ وہ اپریل ۱۸۵۱ء میں یا اس سے کچھ پہلے بیمار ہوئیں۔ غالب نے مرزا ہرگوپال نبی بخش حقیر کو اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ۔۔۔

"تین مہینہ سے کھانسی اور تپ میں گرفتار ہے۔ خدا اس پر اور اس کے بچوں پر رحم کرے

اور اس کو بچا لے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر یوں سمجھو کہ اگر بچ جائے تو مردہ جیا۔"

اس خط کے چند دنوں بعد بنتی بیگم کو افاقہ ہو گیا اور ان کے مرض کی صورت خطرناک نہیں رہی لیکن وہ زندہ نہیں رہ سکیں۔ مالک رام کے قول کے مطابق جنوری ۱۸۵۲ء میں وہ روگرو سے ان کا انتقال ہو گیا۔ عارف اپنی بیوی کے انتقال سے پہلے ہی سے بیمار چلے آرہے تھے۔ غالب کے قول کے مطابق عارف کو رعاف ہوا۔ رعاف میں ناک سے لہو آتا ہے۔ مگر اس کو منہ سے لہو آیا۔ ناک سے تھوڑا، اور منہ کا کیا حال تھا گویا مشک کا دہانہ کھول دیا ہے۔ ایک ہفتہ میں خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ دس سیر خون نکلا، سیاہ بدبودار۔" بہرحال بنتی بیگم کے انتقال نے ان کو اور بھی پست اور نڈھال کر دیا اور جلد ہی تشویشناک صورتِ حال تک پہنچ گئے۔ موت سے چند روز پہلے خون کی قے ہوئی۔ غالب ان کی عیادت کو گئے تو یہ شعر سنایا۔

آنکھوں میں دم ہے شکل چراغ سحر ہوں میں
لوگ رہی ہے جان کو کیا انتظار ہے

عارف کا انتقال جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۷ سال تھی۔ ان کی جواں مرگی پر غالب نے اپنا مشہور مرثیہ "لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور" لکھا۔ نساخ نے تاریخ وفات نکالی۔

سال نرگسش چوں از خرد جستم؛
خلد اعلیٰ مقام عارف گفت

۱۲۶۸ھ

عارف کا دیوان اب تک شائع نہیں ہوا ہے۔ اس کا ایک نسخہ رامپور لائبریری کا، ایک ہندو یونیورسٹی بنارس اور ایک کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔ ان کا کچھ کلام حمیدہ سلطان کے تذکرہ میں بھی ہے۔ عارف نے غالب کی غزلوں پر تضمینیں ہی نہیں کہیں بلکہ ان کی غزلوں پر غزلیں بھی کہیں۔ ان کے دیوان میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

ان کا نمونۂ کلام یہ ہے :-

رسوا ہوا تو اہلِ وفا میں ہوا عزیز
اچھا ہوا وہ حق میں مرے جو بُرا ہوا

کیونکر رفو کرے گا مرے جیب بخیہ گر
باقی خدا کے فضل سے اک تار بھی نہیں

سب سے بہتر ہے کہ مجھ پر مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو

دھوکہ میں آکے باغِ جناں میں چلے گئے
دل میں گمانِ کوچۂ جاناں کیے ہوئے

پھرتا ہوں ساتھ گھر لیے خانہ بدوش ہوں
جب تک نہ میں ملوں تو مرا کس کو گھر ملے
آغازِ دردِ ہجر کے انجام کو نہ پوچھ
یہ ابتدا ہے وہ کہ نہ جس کی خبر ملے

مانا یہ ناصحا کہ نہ اس سے ملا کریں
بہتر تو ہاں یہی ہے مگر دل کو کیا کریں
تکلیف آپ آنے کی کیوں آشنا کریں
بیٹھے ہوئے وہیں مرے حق میں دعا کریں
خود ہیں خجل کہ جیتے رہے اس کے ہجر میں
اپنا یہ منھ نہیں ہے کہ اس سے گِلا کریں

(ماہِ نو فروری ۱۹۳۹ء ، ذکرِ غالب ص ۱۷۹ ،
خم خانۂ جاوید جلد پنجم ص ۵۰۹ ص ۵۱۰ ، نادراتِ غالب ص ۱۰۶ ص ۱۰۷
گلستانِ سخن دوم ص ۱۹۸ ، سخن شعراء ص ۳۳۱)

حکیم غلام نجف خاں

حکیم غلام نجف خاں ابن حافظ مصلح الدین خاں بدایوں کے ایک قصبہ شیخوپورہ کے فاروقی

خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خاندان نے ہر دور میں عالی مرتبت، یگانۂ عصر فقیہہ المثل افراد پیدا کیے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ حکیم غلام نجف خاں کے جد ششم شیخ فرید معتشم خاں کو جہانگیر نے منصب پنج ہزاری ذات و پانچ ہزار سوار سے سرفراز کیا تھا۔ علاوہ ازیں چار ہزار بیگہ اراضی بھی رہائش کے لیے عنایت کی تھی، اسی طرح شیخ فرید معتشم خاں کے پدر بزرگوار عہد اکبری میں بہار و اڑیسہ کی صوبہ داری پر مامور اور منصب نیم ہزاری ذات و سوار سے سرفراز تھے

حکیم نجف خاں کے خالو کو کمپنی کی طرف سے تحصیل داری دی گئی تھی، اس کے بعد وہ گورنر جنرل کے میر منشی بنائے گئے۔ اس سلسلہ میں ان کو دہلی آنا پڑا۔ ان کے ہمراہ حکیم غلام نجف خاں بھی تھے، اس وقت حکیم غلام نجف خاں کی عمر صرف پانچ سال تھی۔

حکیم غلام نجف خاں نے درسی علوم کی تکمیل کے بعد طب پڑھنے کی طرف توجہ کی اور اس سلسلہ میں حکیم صادق علی خاں ابن حکیم محمد شریف خاں سے استفادہ کرنے لگے۔ حکیم نجف خاں کے برادرِ نسبتی حکیم احسن اللہ خاں کو احترام الدولہ کا خطاب مل چکا تھا اور ان کی شہرت زوروں پر تھی، حکیم غلام نجف خاں نے ان سے مشق نسخہ نویسی بہم پہنچائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس درجہ قبولِ عام حاصل کر لیا کہ بہادر شاہ ظفر تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، انھوں نے ۱۸۴۷ء میں ان کو عضد الدولہ کا خطاب دے کر ان کی ہمت افزائی کی، ۱۸۴۷ء سے پہلے کمپنی کی طرف سے ان کو بحیثیت طبیب مامور کیا گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران حکیم غلام نجف خاں دوجانے میں تھے۔ انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد شہریوں پر جو مظالم توڑے، اس کی تفصیل حکیم غلام نجف خاں تک پہنچتی رہی، انھوں نے غالب کو دوجانہ آنے کی دعوت دی لیکن غالب کے لیے دوجانہ جانا ممکن نہیں تھا، انھوں نے جولائی ۱۸۵۸ء کی کسی تاریخ کو لکھ بھیجا،

"میری جان تم ہنوز دوجانے میں ہو، مجھ کو تم جانتے ہو کہ میرا شہر میں رہنا بے اجازت سرکار کے نہیں اور باہر نکلنا بے ٹکٹ نہیں، پھر میں کیونکر وہاں

آؤں، شہر میں تم ہوتے تو جرأت کر کے تمہارے پاس چلا آتا۔"

جب امن ہو گیا اور تباہ حال لوگوں کو دوبارہ دہلی میں رہنے اور آباد ہونے کی اجازت مل گئی تو حکیم نجف خاں بھی دوجانے سے واپس چلے آئے۔ حکیم غلام نجف خاں کے غالب سے بڑے مستحکم روابط تھے، غالب ان کو اپنے بیٹوں جیسا خیال کرتے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں نے بھی ان کو اپنے بزرگوں ہی کی طرح سمجھا اور ان سے محبت کی۔

حکیم غلام نجف خاں کی سرسید کے بھائی سید محمد خاں مالک سید المطابع سے بھی بڑی دوستی تھی، اس بنا پر سرسید ان کو بڑا بھائی سمجھتے تھے۔ ۱۸۶۹ء میں جب سرسید نے انگلستان جانے کا فیصلہ کیا تو حکیم غلام نجف خاں نے ایک خط کے ذریعہ ان کو مغرب آزاد خیالی سے دور رہنے کی نصیحت کی، سرسید نے انگلستان سے اس خط کا جواب روانہ کیا تھا۔

حکیم غلام نجف خاں نے طب اور اس کے اصولوں پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ ان میں سے رسالہ طریق دادن مارگزیدگین اور رسالہ دستور علاج عنین کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

(حیات جاوید ص۲۳۳، مکتوبات سرسید ص۳۷
سیرت فریدیہ ص۱۶۸ خطوط غالب ص۷
تذکرہ اہل دہلی ص۲۷، ادبی خطوط ص۲۷)

سیّد علی خاں غمگین

سید علی خاں بہادر عرف حضرت جی کا تخلص غمگین تھا۔ ان کے والد سید محمد دہلی کے گورنر شاہ نظام الدین کے برادر زادہ تھے۔ میاں عبدالرزاق عرف میرن علی نے غمگین کی تاریخ ولادت ۳ صفر ۱۱۶۰ھ بتائی ہے۔ تذکرہ نویسوں نے ان کو

دہلوی لکھا ہے اس بنا پر یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔

جس وقت سید محمد کا انتقال ہوا، غمگین کی عمر بارہ سال سے زائد نہیں تھی۔ اس وقت تک انہوں نے قرآن پاک اور فارسی کی چند کتابیں پڑھی تھیں۔ اس کے بعد درسی تعلیم سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا اور انہوں نے مشہور تذکرہ نویس سید فتح علی گردیزی کے ہاتھوں پر قادری نقش بندی اور ابوالعلائی سلسلہ میں بیعت کرلی۔ پھر گوالیار سے پٹنہ اور گیا کا سفر کیا۔ اور شاہ ابوالبرکات کی خدمت میں بارہ سال گذار دیئے۔ اسی اثنا میں خواجہ ابوالحسین سے بھی فیضِ باطنی کی تحصیل کی۔ پھر گوالیار پہنچ کر وہاں مستقل طور پر رہائش پذیر ہوگئے۔ سب ہی تذکرہ نویسوں نے غمگین کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ ان کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سعادت یار خاں رنگین کو اپنا کلام دکھاتے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔ رنگین نے بھی مجالس رنگین میں ایک جگہ ان کو اپنا شاگرد لکھا ہے۔

غمگین کے نام غالب کے سولہ خطوط ملتے ہیں جن میں سے ایک پنج آہنگ میں اور باقی غمگین اکادمی گوالیار کے ایک خطی نسخہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان سے غالب اور غمگین کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غمگین نے اپنے دیوانِ رباعیات میں ان کا ذکر کرنے کی ان سے اجازت چاہی تھی۔ جس پر انہوں نے اسے اپنے اور اپنے آبا کے لئے نازشِ جاودانی سمجھا تھا۔ ایک خط سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ غمگین نے غالب سے گوالیار آنے کی خواہش کی تھی اور اس سلسلہ میں اصرار کیا تھا۔ غالب نے اس کے جواب میں لکھا تھا۔

"میری کارروائی برسوں ریذیڈنسی دہلی اور عدالت کلکتہ میں پڑی رہی اسے بغرضِ حکم لندن روانہ کیا گیا ہے۔ اسے بھی دو سال ہو رہے ہیں، تاحال جواب نہیں آیا۔ جب تک یکسوئی نہ ہو جائے، دہلی نہیں چھوڑ سکتا ہوں

ہی یکسوئی ہو جائے گی۔ بلا تاخیر سر کے بل گوالیار پہنچوں گا تاکہ قدم بوسی کا شرف حاصل ہو۔"

غمگین نے ۳ صفر ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو انتقال کیا۔ اس کی تائید مصطفیٰ خاں شیفتہ کے اس قطعۂ تاریخ وفات سے بھی ہوتی ہے۔

به عرف حضرت و غمگیں تخلص
شده سیّد علی فخر زمانی

به صورت سالکِ راہِ طریقت
به معنی شاہ ملکِ کامرانی

به دیده محوِ دیدارِ خدا بود
به دل آگہ ز اسرارِ نہانی

بطونش دیدۂ کحل البصیرت
ظہورش سرمۂ چشمِ معانی

دلش چوں یافت ذوقِ ربِّ ارنی
خطاب آمد که تو در حضرِ دنمانی

به یک شنبه سوم روز صفر شد
کلیم آسا به زیرِ کوہِ فانی

زدل آہے کشیده شیفته گفت
به بردِ او را صدائے لن ترانی

۱۸۵۱ء

غمگین کی اُردو، فارسی اور عربی تصانیف کی تعداد کا صحیح اندازہ ممکن نہیں اب تک ان کی جو تصانیف دریافت ہو سکی ہیں، ان میں کلماتِ قدسیہ وظیفہ شریف، کشف الانوار، اسرار الصلوٰۃ، حقیقت الایمان، اسرار المصحف، المسیح القلوب، حقیقتِ خلافت، آیۃ آمن الرسول، مخزن الاسرار، مکاشفات الاسرار، مراۃ الحقیقت، رقعات و مکاتیب قابل ذکر ہیں۔ غمگین نے زیادہ تر خواجہ میر درد، میر تقی میر اور غالب کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ ان سے ان کے شاعرانہ مرتبہ کا تعین بہ آسانی ہو جاتا ہے ذیل میں ہم ان ہی غزلوں کا انتخاب درج کر رہے ہیں جو انہوں نے غالب کی طرحوں پر کہی ہیں

کون جیتا ہے شبِ ہجر سحر ہونے تک
عمر اک چاہیئے یہ عمر بسر ہونے تک

خانہ آباد کہیں دیکھ نہ ہو کر برباد　　دل میں اس بت کی وفا کا ترے گھر ہونے تک
مثلِ شبنم نہیں کچھ ہستیِ موہوم اپنی　　کہ تری مہر کی ٹھہرے یہ نظر ہونے تک
خوں نہ ہو اے دلِ بے تاب میں تیرے قرباں　　صدفِ چشم میں اشکوں کے گہر ہونے تک

اور کا انتظار ہے اس کو　　اور مجھے اس کی انتظاری ہے
کسی صورت سے بھولتا ہی نہیں　　آہ یہ کس کی یادگاری ہے
کیا کہوں تم سے بیقراری کی　　بیقراری ہی بیقراری ہے
تجھ پر گر ہو تو گنگ ہو واعظ　　حال جو کچھ کہ مجھ پہ طاری ہے
ہم تو کل قتل ہو چکے غمگیں　　دیکھئے آج کس کی باری ہے

شکوہ کروں میں کس سے عمرِ دراز کا　　چسکا ہے آج تک مجھے عشقِ مجاز کا
اس سازِ دل سے نکلے ہے ہر نالہ سوز ناک　　محتاج میں نہیں ہوں کسی سوز و ساز کا

نہ مغنی ہوں میں نہ مطربِ ساز　　ہے یہ در پردہ اور کی آواز
محو رکھ دل شراب و شاہد میں　　بابِ توبہ ہے تا قیامت باز
دستِ قسمت ہی ہے مرا کوتاہ　　ہاتھ کیونکر وہ آئے زلفِ دراز

اپنے مرنے پہ میں خوش ہوں مگر اتنا غم ہے　　کس پر اس طرح سے تو ہوگا خفا میرے بعد
بزم سے اٹھ کے میں بیٹھا پسِ دیوار رہا　　ذکر بھی میرا کسی نے نہ سنا میرے بعد

صرف مجھ کو عشق تیرا چاہیئے　　عشق ہو تیرا تو پھر کیا چاہیئے

جو نہ سمجھے اس کو سمجھاتا ہے تو ناصحا! اتنا تو سمجھا چاہیئے
موت سے بدتر ہو جس کی زندگی زندگی اس کی کو دیکھا چاہیئے

(فہرست ہندوستانی مخطوطات صفحہ ۱۱۹، مجالس رنگیں صفحہ ۱۰، سخن شعراء صفحہ ۲۵۳، کلیات نثر غالب صفحہ ۱۸۳، شاہ غمگین حضرت جی صفحہ ۵۵، صفحہ ۶۵، اردوئے معلیٰ دہلی غالب نمبر صفحہ ۱۱۳)

نواب میر غلام بابا خاں

نواب میر غلام بابا خاں ۳ر شعبان ۱۲۵۰ھ کو بمقام سورت پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید امی قاضی شہر ہونے کے علاوہ سید جمال الدین شاہ کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ ۲۰ر ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ کو ان کا انتقال ہو گیا تو نواب میر غلام بابا خاں کی تعلیم و تربیت اور پرورش کا بوجھ ان کے بڑے بھائی سید جمال الدین پر آپڑا۔

۱۸۶۲ء میں غالب کے ہر دلعزیز شاگرد میاں داد خاں نے اپنے وطن سے سورت آنے کے بعد ان کی مصاحبت اختیار کی۔ اسی دوران ان کی زبانی نواب میر غلام بابا خاں نے غالب کے واقعات سنے اور ان کی خوبیِ کلام کے گرویدہ ہو گئے۔ غالب نے ان کو پہلا خط ۲۱ر ربیع الاول ۱۲۸۰ھ کو لکھا تھا جس میں ان کے ایک عزیز نواب میر جعفر علی خاں کی تاریخ انتقال لکھی تھی۔

نواب میر غلام بابا خاں اگرچہ خود شاعر نہیں تھے، لیکن ان کو شاعروں اور ادیبوں سے بڑی ہمدردی تھی۔ وہ غالب کی بھی وقتاً فوقتاً مدد کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے متعدد مرتبہ غالب کو سورت آنے کی دعوت دی لیکن غالب نے ہر مرتبہ اپنے بڑھاپے اور کمیِ بصارت کی وجہ سے معذرت ظاہر کر دی۔

نواب میر غلام بابا خاں کے یہاں فرزند تولد ہوا تو غالب نے اس کا تاریخی نام سعید مہابت علی خاں تجویز کیا۔ صاحبزادی کی بسم اللہ کی تقریب پر بھی ایک تاریخ لکھ بھیجی اسی طرح ایک مرتبہ نواب میر غلام بابا خاں نے کسی بڑے مقدمہ میں عدالت العالیہ سے کامیابی حاصل کی تو غالب نے اس واقعہ کی بھی تاریخ نکالی۔ نواب میر غلام بابا خاں کے نام غالب کے جو خطوط ملتے ہیں، ان سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب عمر بھر تک اپنے تعلقات نبھاتے اور ان سے محبت اور عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔

نواب میر غلام بابا خاں نے ۱۲ شوال ۱۳۱۰ھ کو انتقال کیا اور اپنے خاندانی قبرستان میں حضرت سید جلال الدین شاہ کی درگاہ کے احاطہ کے قریب مدفون ہوئے۔

(میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام
خم خانہ جاوید ۳ ص ۳۰۲-۳۰۳، خطوط غالب ص ۳۱۹ تا ۳۴۶
ادبی خطوط ص ۲۷۵ ص ۲۷۶)

فرانسس ہاکنس

ایڈورڈ کولبروک کے معزول ہونے کے بعد ان کی جگہ ولیم فریزر کو دہلی کا قائم مقام رزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اس عہدہ پر چند ہی دنوں کام کیا تھا کہ ان کی جگہ ستمبر ۱۸۲۹ میں فرانسس ہاکنس کی ماموری عمل میں آئی۔ فرانسس ہاکنس کے رزیڈنٹ مقرر ہونے کے بعد غالب نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر نذر گذارا۔

یافت آئینہ بخت تو ز دولت پرداز | ہلہ کلکتہ بدیں حسن خداساز بہ ناز
پنج مطلب ز توام ہست و بقصد گزارید | خواہم آں پنج علی الرغم حسود و غماز
اول اینست کہ در باب معاش کہ مراست | کنی اندیشۂ محکم بہ طریق ایجاز
ہر چہ در دفتر سرکار بود نقش پذیر | ہم بہ اندازۂ آں نقش شوی مایہ ساز

دویم آں کز اثر عدل تو اے سنجر عہد
غیر با بندہ دریں وجہ نباشد انباز

سوم آنست کہ دیگر نکنم دست طلب
پیش فرماں دہ سوانت بودریوزہ دراز

چارم آنست کہ باقی ز رِ چندیں سالہ
بے نزاع جدل و جہد بمن گردد باز

پنجم آں کز پس ایں فتح کہ بنماید روئے
دہیم مژدۂ اکرام و نوید اعزاز

فرانسس ہاکنس پر نواب شمس الدین خاں کا خاصہ اثر تھا۔ ان کی تقرری سے پہلے نواب شمس الدین خاں نے سرکار انگریزی میں اپنے دونوں بھائیوں نواب امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کے خلاف درخواست دے رکھی تھی اور کہا تھا کہ میں خلعت اکبر ہونے کی حیثیت سے نواب احمد بخش خاں کی ریاست فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کا بلا شرکت غیر حق دار ہوں۔ فرانسس ہاکنس نے اس درخواست پر نواب شمس الدین خاں کے خیالات کی تائید کی اور ان کو ان کے بھائیوں کا علاقہ بھی واپس دلا دیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد کلکتہ سے غالب کے مطالبہ کو مسترد کرنے کی سفارش کرتے ہوئے کہا کہ غالب سات ہزار روپے سالانہ سے زیادہ کے مستحق نہیں ہیں۔ غالب نے سراج الدین احمد کے نام ایک خط میں اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"مجھے بعض لوگوں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ دہلی کے رزیڈنٹ فرانسس ہاکنس نے والیٔ فیروز پور (نواب شمس الدین خاں) کے کہنے پر ان کی مرضی کے مطابق صدر میں رپورٹ روانہ کر دی ہے۔...... میں نہیں جانتا کہ ان کی رپورٹ پر کیا کارروائی ہوئی۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ سیکرٹری نے مجھ کو طلب کر کے کہا کہ تیری پرورش کے لئے فرانسس ہاکنس کی تجویز صدر سے منظور ہو چکی ہے، میں نے پوچھا، وہ کیا تجویز ہے کہا، قاعدۂ سابق برقرار رکھا گیا، میں کیا بتاؤں مجھ پر کیا گذر گئی، میں حیران تھا کہ سیکرٹری کیا کہہ رہا ہے، کیا میری زندگی بھر کی کوششوں کا یہی انجام ہونا تھا۔"

اس واقعہ کے بعد غالب کو فرانس ہاکنس کے نام سے نفرت ہوگئی اور وہ انہیں بے گناہ کش اور ظالم حاکم خیال کرنے لگے۔ انہوں نے دوبارہ فرانس ہاکنس کے دفتر جانے اور اپنے حالات کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی البتہ انہوں نے اتنا کیا کہ اس قصیدہ سے ان کا نام نکال دیا جو اُن کے رزیڈنٹ ہونے کے موقع پر نذر گذارنا گیا تھا۔ فرانس ہاکنس ۱۸۳۰ء تک قائم مقام رزیڈنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ وہ اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو ان کے لئے یہ ہجویہ قطعہ لکھا

آیا ستم زدہ غالب ز ہاکنس سگال | منہ بہ سینۂ بے کینہ از شکایت داغ
اگر بصدر اخلاف تو کردہ است رپورٹ | دگر بخصم بہ قتل تو بستہ است جناغ
قضا بنائے خرابی نگندہ ہم ز نخست | ندیدہ ای کہ ہماں عکس غالب است بلاغ

(کلیات نظم غالب دوم ص۱۲۳، کلیات نظم غالب اول ص۱۶
آجکل فروری ۵۷ء، ذکر غالب ص۵، ص۶
کلیات نثر غالب ص۲۱)

مولانا فضل امام

مولانا فضل امام: شیخ محمد ارشد ہرگامی کے صاحبزادے اور مولوی فضل حق خیرآبادی کے والد بزرگوار تھے۔ انہوں نے خیرآباد کے مشہور عالم سید عبدالواجد خیرآبادی سے علوم نقلیہ و عقلیہ کی تحصیل کی اور دہلی پہنچ کر حکومت انگریزی کے پہلے مفتی اور پھر صدر الصدور مقرر ہوئے۔ سرسید احمد خاں نے تذکرۂ اہل دہلی میں ان کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے۔

" علومِ عقلیہ اور فنونِ حکمیہ کو انکی طبع وقاد سے اعتبار تھا اور علومِ ادبیہ کو ان کی زباں دانی سے افتخار، اگر ان کا ذہن رسا دلائل قطعیہ بیان نہ کرتا۔ فلسفہ کو معقول

نہ کھتے اور اگر ان کا فکر صائب براہین ساطعہ قائم نہ کرتا۔ اشکال ہندسی تارِ عنکبوت سے سست تر نظر آتے۔ اس نواح میں ترویج علم وحکمت ومعقول کی اسی خاندان سے ہوئی۔ گویا اس دودۂ والا تبار سے اس علم نے یک جہتی بہم پہنچائی ہے۔"

مولوی احسان علی کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل امام نے میرزاہد اور ملا جلال کے رسالوں پر حاشیہ لکھا تھا۔ قواعد فارسی کے باب میں آمد نامہ کی تدوین کی تھی اور اس کے آخر میں لکھنؤ اور اس کے قرب وجوار کے علماء کے حالات درج کئے تھے۔ مولانا فضل امام کو شاہ صلاح الدین صفوی سے بیعت تھی انہوں نے فرائض ملازمت کے ساتھ مشغلۂ درس وتدریس بھی جاری رکھا تھا اور اپنے تلامذہ پر نہایت شفقت کرتے تھے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بلاشبہ سینکڑوں سے زائد ہوگی، لیکن ان میں ان کے صاحبزادے مولوی فضل حق خیرآبادی اور مولوی صدرالدین آزردہ کو جو قبول عام حاصل ہوا، اس کی مثال نہیں ملتی۔ بعض تذکرہ نویسوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فضل امام نے کچھ دنوں پٹیالہ میں بھی قیام کیا تھا۔ سرسید احمد خاں کے بیان کے مطابق انہوں نے آخر میں ملازمت ترک کردی تھی اور دہلی کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن خیرآباد چلے گئے تھے۔ وہیں ۵ ذیقعد ۱۲۴۴ھ کو ان کا انتقال ہوا اور وہیں درگاہ شیخ سعدالدین کے احاطے میں دفن ہوئے۔ مولوی رحمان علی نے ان کا سال وفات ۱۲۴۲ھ اور عبدالشاہد خاں شیروانی نے ۱۲۴۰ھ بتایا ہے۔ یہ غلط ہے۔ مولانا فضل امام سے غالب کے براہ راست تعلقات نہیں تھے لیکن ان کے صاحبزادے مولوی فضل حق خیرآبادی غالب کے دوست اور مربی تھے۔ اس بنا پر غالب نے ان کے انتقال پر پانچ شعر کا یہ قطعۂ تاریخ کہا۔

لہٰذا دریغا قدوۂ ارباب فضل　　　　کرد سوئے جنت الماویٰ خرام
کار آگاہی ز پرکار اوفتاد　　　　گشت دارالملک معنی بے نظام

چوں ارادت انپے کسب شرف | جست سالِ فوت آں عالی مقام
چہرۂ ہستی خراشیدم نخست | تا بنائے تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر سایۂ لطف نبی | باد آرامش گہ فضل امام

۱۲۴۴ھ

(علمائے ہند ص۱۶۶ ، کلیاتِ نظم فارسی اول ص۲۲۵
تذکرۂ اہل دہلی ص۱۳۰ ص۱۲۹ ، باغی ہندوستان ص۱۲۳ ص۱۲۵
واقعاتِ دارالحکومت دوم ص۲۱۴ ، ص۲۱۵)

میر فضل مولیٰ خاں

میر فضل مولیٰ خاں لکھنؤ کے باشندے تھے۔ نساخ کے بیان کے مطابق انھوں نے دہلی کا سفر کیا تھا۔ ہمارے خیال میں وہیں ان کی غالب سے ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے دہلی میں چند دن قیام کرنے کے بعد قاضی سعید الدین کے ہمراہ کلکتہ کا قصد کیا جس وقت غالب ۱۸۲۷ء میں اپنے پنشن کے مقدمہ کے سلسلہ میں کلکتہ پہنچے تھے۔ ان کا قیام کلکتہ ہی میں تھا۔ غالب کو کلکتہ کے قیام کے دوران ان ہی کی زبانی نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی پہلی اطلاع ملی تھی۔ وہ مرزا علی بخش خاں کو کلکتہ سے لکھتے ہیں:

"میر فضل مولیٰ خاں نامی ایک دوست سے اتفاقاً راستہ میں ملاقات ہوگئی اور ان کی زبانی فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں کی رحلت کا حال معلوم ہوا"

میر فضل مولیٰ خاں کے بارے میں نساخ کی رائے اچھی نہیں ہے۔ ان کے بیان کے مطابق وہ دوسروں کے شعروں کو اپنے نام سے پڑھتے تھے۔ مولوی عبدالقادر رام پوری کا بیان اس کے برعکس ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"میر فضل مولی خاں کے صاحبزادے کہتے تھے کہ اگر ان کو ابو زید سروجی دیکھ لیتا تو ان کی عربی فارسی اور ہندی غزلوں اور قصیدوں کو اساتذۂ سلف کا ہم پایہ بتاتا اور جو کوئی واقف ہو جاتا تو چوری کی تہمت رکھتا۔"

مولوی عبدالقادر رام پوری کے بیان کے مطابق انھوں نے نواب مرشدآباد کی سرکار میں ملازمت کر لی تھی اور ان کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے تھے، لیکن اس مصاحبت سے ان کو زیادہ دنوں فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا اور وہ عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ ان کے دو شعر درج ذیل ہیں:

دل خیالِ زلف سے از بس مرا معمور ہے
صبحِ محشر بھی مجھے شامِ شبِ دیجور ہے

اور دی مسی وہ اس کی کہ جینے پہ مرف ہے
لب وہ کہ لعل کے بھی نگینہ پہ حرف ہے

(شعرائے دکن شعراء صـ ۲۶۸، علم و عمل صـ ۱۳۶، ریاض الوفاق صـ، محیات غالب نثر صـ ۹۹)

ولیم فریزر

غالب کو ولیم فریزر سے توقع تھی کہ وہ پنشن کے مقدمے میں ان کا ساتھ دیں گے اور اس طرح ان کو اس سلسلے میں کسی پریشانی یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اسی بنا پر انھوں نے "در ستائش مسٹر ولیم فریزر صاحب بہادر صاحب ایجنٹ دہلی" کے عنوان سے ایک طویل قصیدہ لکھا اور ان کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کا آخری شعر یہ ہے: نظم

جہاں تا جہاں است کارِ جہاں را　　بفرمان ولیم فریزر برآرد

ولیم فریزر ۱۷۷۳ء میں بمقام کلکتہ پیدا ہوا۔ علوم درسیہ کی تکمیل کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر میں بحیثیت کلرک ملازمت کی۔ جب ۱۸۰۵ء میں ڈیوڈ اختر لونی کو دہلی کا ریذیڈنٹ مقرر کیا گیا تو اسے بھی اس کا سیکرٹری نامزد کر کے اس کے ساتھ روانہ کیا گیا۔ ۱۸۲۶ء میں پہلی مرتبہ اس نے معرکہ بھرت پور کے دوران نمایاں خدمات انجام دیں، جس کے صلہ میں اسے ۱۸۳۰ء میں تھوڑی سی مدت کے لئے دہلی کی ریذیڈنسی تفویض کی گئی بعدازاں دہلی کی ریذیڈنسی کو ختم کر کے ایجنسی بنا دیا گیا۔ اس طرح ولیم فریزر ۱۸۳۰ء میں دہلی کا پہلا ایجنٹ مقرر ہوا۔

ولیم فریزر ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو دریا گنج میں راجہ کشن گڑھ کے مکان پر شام کا کھانا کھا کر رات تاخیر سے اپنے مکان واپس آرہا تھا کہ راستہ میں کسی نے اس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

ولیم فریزر کو سرکاری اعزاز و احترام کے ساتھ کشمیری دروازہ کے پاس سینٹ جیمس گرجا گھر میں دفن کیا گیا، بعد میں اس کی قبر اس کے دوست کرنل جیمس اسکنر نے بنوائی اور اس پر انگریزی میں ایک کتبہ لگایا، جس کا ترجمہ یہ ہے:

"یادگارِ مقدس ولیم فریزر صاحب کمشنر ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر مقیم دہلی اور مقامی میجر اسکنرز ہارس کے ۲۲ مارچ کو بے رحمی سے ایک قاتل کے ہلاک ہوتے۔"

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران مجاہدوں نے اس قبر کو توڑ پھوڑ کر برابر کر دیا اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قبر اب محفوظ نہیں ہوگی۔

شیخ محمد اکرام نے عبدالرحیم گورکھپوری کی خودنوشت کے حوالے سے بتایا ہے کہ ولیم فریزر کے پاس عربی اور فارسی کتب کا بڑا ذخیرہ تھا۔ اس ذخیرہ میں حیات الحیوان، تاریخ الحکماء، خمسہ نظامی اور دیوان مسعود سعد سلمان جیسی اہم کتابیں موجود تھیں۔

(حیات غالب ص۹۹ ، غالب نامہ ص۴۹ ،
کلیات نظم فارسی دوم ص۱۶۳ ، ذکر غالب ص۹۹
واقعات دارالحکومت دہلی ص۳۶ ص۳۹۶)

مولانا فضل حق خیرآبادی

مولانا فضل حق خیرآبادی انیسویں صدی کے اکابر علما میں سے تھے۔ سرسید احمد خاں نے ان کا سال ولادت ۱۲۱۱ھ بتایا ہے۔ رحمان علی کے بیان کے مطابق وہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی فضل امام سے حاصل کی۔ پھر مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی کے تلامذہ میں شامل ہو کر حدیث کا درس لیا۔ اس پر بھی سیری نہیں ہوئی تو شاہ دھومن دہلوی کے ہاتھوں پر بیعت کرکے ان کے مُرید ہو گئے۔

مولانا فضل حق نے اٹھارہ سال کی عمر میں ریذیڈنٹ کے دفتر میں سررشتہ دار ہو کر اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ کچھ دنوں بعد نواب جھجر نے اپنے پاس بلا کر پانچ سو روپے مشاہرہ مقرر کیا۔ یہاں سے رام پور چلے گئے جہاں سے صدر الصدور بنا کر لکھنؤ بھیجا گیا۔ علمائے ہند کے مولف نے ۱۲۶۴ھ میں ان کو لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ اور ملاقات کی تھی اس نے لکھا ہے کہ وہ حقہ کشی اور شطرنج بازی کے دوران بھی تلامذہ کو افق المبین کا درس دیتے تھے اور مطالب سمجھاتے تھے۔

مولوی فضل حق نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران دوبارہ دہلی کا قصد کیا۔ اور یہاں پہنچ کر بادشاہ سے وقتاً فوقتاً ملاقات کی۔ جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو وہ پانچ دن اپنے گھر میں بھوکے پیاسے مقید رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کس طرح چھپتے چھپاتے مجیکن پور کی راہ لی۔ اور اٹھارہ دن وہاں قیام کیا پھر وہاں

سے کسی اور مقام کی طرف روانہ ہو گئے ۔ ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے عام معافی کا اعلان ہوا ، اور لوگ اپنے اپنے شہروں کی طرف دوبارہ لوٹ کر آنے لگے تو مولوی فضل حق نے بھی خیر آباد کا قصد کیا ۔ ابھی وہ خیر آباد پہنچے ہی تھے کہ ان کو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ تیار کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ۔ عدالت کی جانب سے ان کو حبس دوام اور عبور دریائے شور کی سزا سنائی گئی اور انڈمان بھیج دیا گیا ۔ ان کے عقیدت مندوں اور دوستوں نے ان کو قید و بند کی زندگی سے نجات دلانے کی بہت کوشش کی ۔ بڑی مشکلوں کے بعد پروانۂ آزادی حاصل کیا گیا ۔ ان کے صاحبزادے پروانۂ آزادی لے کر انڈمان پہنچے ۔ اس سے ایک دن قبل مولانا کا ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ کو انتقال ہو چکا تھا ۔

مولوی فضل حق کی تصانیف میں شرح تہذیب الکلام ، تحقیق حقیقت الاجسام حاشیہ قاضی مبارک ، حاشیہ افق المبین ، حاشیہ تلخیص الشفا ، ہدیۂ سعیدیہ فی حکمت طبیعیہ روض المجود فی تحقیق حقیقت الوجود ، رسالہ مبحث قاطیغوریاس ، رسالہ تحقیق علم العلوم اور تاریخ احوالِ غدر مشہور ہیں ۔ رحمان علی نے ان کے اشعار کی تعداد چار ہزار سے زائد بتائی ہے ۔ امیر مینائی کے بیان کے مطابق ان کے عربی قصائد اس سے علیحدہ ہیں ۔

مولانا فضل حق غالب کے دوست بھی تھے ، مربی اور محسن بھی ۔ انہوں نے غالب کو غالب بنانے میں جو نمایاں حصہ لیا ، اس کی مثال شاید ہی غالب کی زندگی میں کہیں اور ملے ۔ ڈاکٹر زور کے بیان کے مطابق اگر مولانا فضل حق سے غالب کی ملاقات نہ ہوتی تو میر تقی میر کی پیش گوئی کا وہ حصہ پورا ہو جاتا جس میں انہوں نے غالب سے متعلق کہا تھا کہ یہ لڑکا مہمل بکنے لگے گا ۔" مولانا فضل حق نے غالب کی فکر کو نکھار کر ان کے خیالات کی اصلاح کی اور ان کو بیدلانہ روش چھوڑنے پر مجبور کیا ۔ یہی نہیں بلکہ ان کی مالی مشکلات دور کرنے کی بھی کوشش کی ۔ امتیاز علی عرشی نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ جن دنوں

مولانا فضل حق خیرآبادی رام پور میں فردکش تھے انہوں نے وقتاً فوقتاً سرکار (یوسف علی خاں ناظم والئ رامپور) کے روبرو مرزا صاحب کے اشعار پڑھے جس سے سرکار ان سے مراسلت اور مشورۂ سخن کے مشتاق ہوگئے۔ مولانا نے مرزا صاحب کو لکھا کہ سرکار کی خدمت کے لئے کمربستہ ہوجائیے۔ اور اصلاح اشعار کا کام انجام دیجئے۔ مولانا کا نامۂ گرامی مرزا صاحب کو ۲۷ جنوری ۱۸۵۷ء کو موصول ہوا۔ ۲۸ جنوری کو انہوں نے بہ تعمیل ارشاد نواب فردوس مکاں کی خدمت میں پہلا عریضہ ارسال کیا اس کے جواب میں سرکار نے ۲۵ فروری کو کچھ اشعار بغرض اصلاح بھیجے۔

(انتخاب یادگار صہ ۲۹۱، صہ ۲۹۲، علمائے ہند
صہ ۱۶۴، صہ ۱۶۵، تذکرۂ اہل دہلی صہ ۱۳، صہ ۱۳۳
مکاتیب غالب صہ ۲ ، سرگذشت غالب صہ ۱۹)

فتح اللہ بیگ خاں

غالب نے فتح اللہ بیگ خاں کو نواب شمس الدین خاں کا ابن عم لکھا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ فتح اللہ بیگ خاں محمد بخش خاں کے بیٹے اور قاسم جان کے پوتے تھے۔ نواب احمد بخش خاں کی ایک بہن محمد بخش خاں کو بیاہی ہوئی تھی۔ اس بنا پر نواب شمس الدین کا فتح اللہ بیگ خاں سے دوہرا رشتہ تھا۔

جب دہلی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں نواب شمس الدین خاں کو پھانسی دی گئی تو لوگوں نے غالب پر انگریزوں کی جاسوسی کا شبہ ظاہر کیا اور یہ بات مشہور ہوگئی کہ ان ہی کے کہنے سے انگریزوں نے نواب شمس الدین خاں کو پھانسی دی۔ غالب نے اس معاملہ میں خود کو بے قصور قرار دیتے ہوئے سارا الزام فتح اللہ بیگ پر لگایا ہے۔ وہ ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں:

"لوگوں کو معلوم تھا کہ میرے اور نواب شمس الدین خاں کے تعلقات
کشیدہ تھے۔ اس لیے انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ میں نے اس معاملہ
میں مخبری کی، حالانکہ یہ سارا کیا دھرا نواب شمس الدین خاں کے ابن عم
فتح اللہ بیگ خاں کا ہے"

نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد اکبر شاہ ثانی نے انگریزوں کی خوشنودی کے لیے ایسے افراد کو خلعت و انعام سے نوازا تھا جنھوں نے نواب شمس الدین خاں کے خلاف جھوٹی شہادتیں دی تھیں یا جھوٹی مخبریاں کی تھیں۔ ان کے ناموں کی فہرست ۴ راکتوبر ۱۸۳۵ء کو سلطان الاخبار دہلی نے شائع کی تھی، اس فہرست میں، فتح اللہ بیگ خاں کا نام نہیں تھا۔ اس بنا پر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فتح اللہ بیگ خاں نے نواب شمس الدین خاں کے خلاف کسی قسم کی جاسوسی یا مخبری نہیں کی تھی۔

(کلیات نثر غالب ص ۱۶۳ ، ذکر غالب ص ۲۷
تاریخ صحافت اردو اول ص ۹۱ ،)

غلام فخر الدین خاں

مرزا غلام فخر الدین خاں، مرزا علی بخش خاں رنجور کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کا نکاح غالب کے حقیقی بھائی مرزا یوسف کی صاحبزادی عزیز النساء خانم سے ہوا تھا۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال سے زائد نہیں تھی۔ انہوں نے اس کے دو سال کے بعد دہلی کی سکونت ترک کر دی اور تلاش معاش میں پنجاب پہونچ کر سر ہنری لارنس کے دفتر میں ملازم ہو گئے، جہاں ان کو ایک نامور خاندان کا فرد ہونے کی بنا پر انتہائی قدر کی نگاہ سے

دیکھا جانے لگا۔

بہادر شاہ ظفر کو اپنے علاقے کوٹ قاسم سے زرِ مال گزاری ایک لاکھ روپے سالانہ وصول ہوتا تھا۔ جب اس کی وصولیابی میں دشواری پیش آئی تو انہوں نے کسی محنتی اور دیانت دار قسم کے منتظم کی ضرورت محسوس کی۔ حکومتِ انگریزی کی جانب سے اس منصب پر مرزا غلام فخرالدین خاں کو مقرر کیا گیا۔ وہ پنجاب سے دہلی آکر زرِ مال گزاری کی وصولی کا کام انتہائی دیانتداری سے انجام دینے لگے۔ اسی دوران ۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہادر شاہ ظفر کو مزید روپے کی ضرورت ہوئی۔ انہوں نے روپے کی فوری وصول یابی کے لئے ان کے نام حکم صادر کیا۔ غلام فخرالدین خاں نے حضرت بہادر شاہ ظفر کے حکم کی تعمیل کی بلکہ اس سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلوں کو بھی بڑی حد تک دور کر دیا۔

جب انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور شہریوں کو چن چن کر اپنے جور و ستم کا نشانہ بنانے لگے۔ غلام فخرالدین خاں کا بھی ان کے ظلم و ستم سے محفوظ و مامون رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ بھی دوسرے بے گناہوں کی طرح ماخوذ کر لئے گئے۔ ان کو ۷ اگست ۱۸۵۸ء کو الور کی فوج کی حراست میں دہلی لا کر کوتوالی میں بند کر دیا تھا۔ غالب نے ۸ اگست ۱۸۵۸ء کو میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

"غلام فخرالدین خاں کی دو ایک سوبکاریاں ہوئی ہیں، صورت اچھی ہے۔
خدا چاہے تو رہائی ہو جائے۔"

اس خط کے تیسرے روز ۱۱ اگست ۱۸۵۸ء کو غلام فخرالدین خاں رہا کر دیئے گئے۔ اور ان کو شہر میں آزادانہ رہنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن انہوں نے دہلی میں آنے کی بجائے شمالی ہند کے مختلف حصوں کا سفر کیا اور سپاہی زادہ ہونے کی

حیثیت سے مختلف علاقوں میں محنت اور ملازمت کرتے رہے۔ آخر میں حیدرآباد دکن کا قصد کیا اور نواب رشید الدین خاں والیٔ پائیگاہ کی خدمت میں پہونچے۔ ان سے پہلے ان کے والد مرزا علی بخش خاں امیر کبیر عمدۃ الملک کے یہاں مہمان رہ چکے تھے اس لئے رشید الدین خاں والیٔ پائیگاہ نے ان کی بڑی قدر افزائی کی اور ان کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ اور دو سو روپے بطورِ منصب عنایت کرتے رہے۔

عودِ ہندی ص ۲۲۵، غدر کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۹۹، دیوانِ معروف (دیباچہ)

مرزا فخر الدین

مرزا فتح الملک بہادر، بہادر شاہ ظفر کے چوتھے بیٹے تھے۔ جن کا اصل نام غلام فخر الدین اور عرف مرزا فخرو تھا۔ وہ ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے ایک اور لڑکے دارا بخت کو اپنا ولی عہد مقرر کر رکھا تھا۔ جب ۱۸۴۹ء میں اس کا انتقال ہوگیا تو انگریزوں کی جانب سے مرزا فخرو کو ولی عہد بنانے کی تجویز پیش کی گئی۔ بہادر شاہ ظفر نے اس سلسلہ میں بہت کچھ پس و پیش سے کام لیا لیکن ان کی ایک نہ چلی اور مرزا فخرو ولی عہد بنا دیئے گئے۔ لیکن اس کے چند سال بعد دہلی میں ہیضہ پھیل گیا۔ اور مرزا فخرو اس میں مبتلا ہو کر ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ذوق نے ان کے انتقال پر قطعۂ تاریخ لکھا اور داغ دردِ دل سے سال وفات برآمد کیا۔ نواب مرزا داغ نے بھی ان کی تاریخ وفات کہی جو اُن کی تیسری بیوی چھوٹی بیگم کے بطن سے نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے۔

مرزا فخرو اور غالب کے تعلقات کی نوعیت بڑی حد تک دوستانہ تھی۔ انہوں نے غالب کا چار سو روپے سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ زین العابدین عارف کے کمسن لڑکوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو دس روپے ماہانہ بھی دیتے

تھے، غالب، یہ ان تین قصیدوں کا صلہ تھا جو غالب نے مرزا فخرو کے لئے لکھے تھے۔ یہ تینوں قصیدے غالب کی فارسی کلیاتِ نظم میں پائے جاتے ہیں۔ مرزا فخرو کا کلام نہیں ملتا ہے۔ ایک غزل درج کی جاتی ہے۔

غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

حال کھل جائیں غیر کو سامنے
پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا

درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر
بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

وہ ملا مگر دلِ کم ظرف
تجھ کو ملنے کا حوصلا نہ ہوا

مر گیا ہجر میں جو بن آئی
شکرِ منت کشِ قضا نہ ہوا

شکوۂ یار اور زبانِ رقیب
کھیل ٹھہرا کوئی گلا نہ ہوا

تم رہو اور مجمعِ اغیار
میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

پھر تمہارے ستم اٹھانے کو
رمز اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

(خم خانۂ جاوید سوم ص۲۹۰ تا ۲۹۹
کلیاتِ فارسی غالب دوم ص۲۹۹ تا ص۳۰۹)

مرزا باقر علی خاں کامل

مرزا باقر علی خاں، زین العابدین عارف کے بڑے صاحبزادے تھے، عارف نے ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا تو اس وقت ان کی عمر پانچ سال تھی وہ اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہنے لگے۔ لیکن جب ۱۸۵۵ء میں وہ بھی رحلت کر گئیں تو مرزا باقر علی خاں غالب کے یہاں آ گئے۔ ان دنوں غالب کو شدید مالی پریشانی لاحق تھی، اس کا اندازہ ان کے اس خط سے بھی ہوتا ہے۔ جو انھوں نے مرزا باقر علی خاں کے اپنے یہاں آنے کے بعد ایک دوست کو لکھا تھا، وہ لکھتے ہیں:

زین العابدین کا بڑا بیٹا باقر علی خاں وہ بھی میرے پاس آگیا - دیکھئے
ہو جائی! چرخ ستم گر کیا شعبدہ بازی کر رہا ہے، بوجھ پر بوجھ ڈال
رہا ہے - زخم پر زخم مجھ پر لگا رہا ہے - کچھ بن نہیں آتی - مصارف
بڑھ گئے ۔۔۔ بہر حال چپ ہوں، خدا میری شرم رکھے"

مرزا باقر علی خاں کی تمام تعلیم و تربیت غالب ہی نے کی - غالب کی زندگی ہی میں وہ الور میں ملازم ہو گئے - بشیر الدین احمد دہلوی کے بیان کے مطابق مرزا باقر علی خاں نے الور پہنچنے کے بعد بہ عہدۂ وکالت سلسلۂ ملازمت اختیار کیا۔

زین العابدین عارف نے مرزا باقر علی خاں کی نسبت نواب ضیاء الدین احمد خاں کے یہاں ان کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے طے کر دی تھی، ان کی شادی کا سوال پیدا ہوا تو یہ ذمہ داری بھی غالب پر آپڑی، غالب نے ان کی شادی پہ ڈھائی ہزار روپے لگائے اور ایک عریضہ کے ذریعہ نواب کلب علی خاں والئ رامپور کو اس سلسلہ میں یوں اطلاع دی:

"باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین کے یہاں ہوئی، انھوں
نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپے دیئے اور میری زوجہ نے
پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس سو روپے صرف کئے"

شادی کے بعد مرزا باقر علی خاں کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام محمد سلطان بیگم رکھا گیا - غالب نے اس کی پیدائش پر یہ قطعہ لکھا:

بہ من ز مقدم فرزند مرزا باقر — سروش تہنیت زبدۂ مطالب گفت
چو قصد شد متعلق بہ گفتن "تاریخ" — طریق تعمیہ ورزید جان غالب گفت

مرزا باقر علی خاں، ان کی بیوی اور دوسرے رشتہ دار محمد سلطان بیگم کو جندو بیگم پکارتے تھے - اسی جندو بیگم کو غالب نے اپنے بعض خطوط میں لاڈ سے مرزا جیون بیگ

کے نام سے یاد کیا ہے۔

مرزا باقر علی خاں نے شادی کے بعد غالب سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور الگ رہنے لگے تھے۔ غالب نے ایک خط کے ذریعہ اپنی خیریت کی اطلاع ان کو ان الفاظ میں بھجوائی

"تمہاری دادی اچھی طرح ہے۔ بھائی اچھی طرح ہے۔ تمہارے گھر میں سب خیر و عافیت ہے۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے"

الور میں مرزا باقر علی خاں کو ساٹھ روپے ماہوار ملتے تھے، لیکن انھوں نے اس میں اپنی کفالت ہوتے نہیں دیکھی تو تین چار برس کے بعد دہلی چلے آئے اور گھوڑوں کی تجارت شروع کر دی اور یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ کو اٹھائیس برس کی عمر میں انتقال کیا سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہی کے پائنتی اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے ان کے چھوٹے بھائی حسین علی خاں شاداں کا لکھا ہوا قطعہ تاریخ وفات لوح مزار پر کندہ کیا گیا۔

چو زیں غم خانۂ دنیا سفر کرد
سوئے باغ جناں باقر علی خاں

بسال رحلتش تحریر گردید
بود مینو مکاں باقر علی خاں

۱۲۹۳ھ

مرزا قربان علی بیگ سالک نے بھی ان کی وفات پر پانچ شعر کا قطعہ تاریخ کہا ہے اور "نوجواں باقر علی خاں حیف ہے" سے تاریخ وفات نکالی ہے۔ یہ قطعہ کلیات سالک میں موجود ہے۔

مرزا باقر علی خاں، کامل تخلص کرتے تھے۔ ان کا کلام نہیں ملتا ہے غالباً امتداد زمانہ کے باعث تلف ہو گیا۔ ایک غزل اور ایک مسدس خمخانۂ دہلی میں موجود ہے۔ دو شعر سخن شعرا میں بھی پائے جاتے ہیں۔

اٹھانے پڑیں گے نہ ساقی کے ناز
کہ پیر مغاں آشنا ہو گیا

یاد آتا کسی کے کاکل کا ، تیرہ سازِ شبِ جدائی ہے

لٹ گیا پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی
اب یہ دہلی ہے تو نظروں میں ہے شانِ دہلی

اگلے عیشوں کا کہیں چرخ عوض لیتا ہے
اب مصیبت میں پڑے ہیں جو کسانِ دہلی

جی بہارِ چمن دہر پہ کیونکر دھریے
کہ نظر آتی ہے افسوس خزانِ دہلی

غم دیے، رنج دیے اپنی گرہ سے ظالم
چرخ کیا تو نے لیا کر کے زیانِ دہلی

اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں
تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی شانِ دہلی

خانۂ کعبہ کو اب حضرت کامل چلیے
رہنے کا اب نہ رہا لطف میانِ دہلی

(فغانِ دہلی صـ ۱۹۲ ، سخنِ شعرا صـ ۲۹۶
مکاتیبِ غالب صـ ۴۳ ، نادراتِ غالب صـ ۱۱۱
، کلیاتِ سالک صـ ۲۹۳)

میاں کالے

میاں نصیر الدین عرف میاں کالے، مولوی قطب الدین کے صاحبزادے ا
مولانا فخر الدین کے پوتے تھے۔ انھوں نے انتہائی ناز و نعم اور شان و شوکت ۔

پرورش پائی - ابھی وہ خورد سال ہی تھے کہ مولانا فخرالدین اور مولوی قطب الدین کا ایک سال کے وقفے سے، ۲۰ رجمادی الثانی ۱۱۹۹ھ اور ۱۷ رمحرم ۱۲۰۰ھ کو انتقال ہو گیا -

اسی دوران میاں کالے کا دنیا سے دل اٹھ گیا اور وہ تمام علایق سے ترک و تجرید کر کے زیارت حرمین شریفین کو روانہ ہو گئے - وہاں سے واپس ہونے کے بعد انھوں نے خواجہ محمد سلیمان تونسوی کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم ظاہری و باطنی کی تحصیل کی اور مجاہدۂ نفس کیا - بعد ازاں خرقۂ خلافت عطا ہونے پر دہلی چلے آئے -

خاندان مغلیہ کو میاں کالے کے بزرگوں سے گہری عقیدت تھی اور وہ مولانا فخرالدین اور مولوی قطب الدین کا مرید تھا - اس بنا پر میاں کالے بہادر شاہ ظفر کے اذکار و اشغالِ صوفیہ کی تربیت پر مامور ہوئے - اس طرح ان کے فقر پر امارت اور گدائی پر حکمرانی کا گمان گزرنے لگا - بہادر شاہ ظفر ساہوکاروں سے قرض لیتا، سودی دستاویزیں لکھتا، املاک شاہی کفالت میں دیتا لیکن اس سے میاں کالے کی خدمت بجا لانے میں تقصیر نہ ہوتی -

میاں کالے نے ایک مغل شہزادی ملکہ بیگم سے نکاح بھی کر لیا تھا جس کے نتیجہ میں ان کو لاکھوں روپے نذر و نیاز کے طور پر ملے تھے - احسن الاخبار بمبئی کے بیان کے مطابق ۱۸۴۶ء میں صرف نو ماہ کے اندر اٹھارہ ہزار روپے سے زائد رقم ان کو عنایت کی گئی - اسی سال ۳۰ ستمبر کو موضع شمپور باولی کی آمدنی سے پانچسو روپے ماہوار مقرر کیے گئے - اس کے علاوہ ۲ اپریل ۱۸۴۷ء کو ان کی صاحبزادی کی شادی کے خرچ کے لیے دس ہزار روپیہ دیا گیا -

میاں کالے کا وصال ۱۵ صفر ۱۲۶۰ھ کو ہوا - پرانی دہلی میں اپنے دادا مولانا فخرالدین کے مزار کے قریب دفن ہوئے - بہادر شاہ ظفر نے مولوی فخرالدین، مولوی قطب الدین

اور میاں کالے سب کی منقبت میں نظمیں کہی ہیں - میاں کالے کی شان میں لکھا ہے :

نظامِ خانۂ فخرِ جہاں تمہیں تو ہو
قیامِ سلسلہ و خانداں تمہیں تو ہو

نہ کیوں کہ تم سے ہوں ظاہر صفاتِ قطب الدین
خدا رکھے تمہیں ان کا نشاں تمہیں تو ہو

تمہارے در پہ جھکا کر سرِ ارادتِ خلق
کہے ہے کعبۂ امن و اماں تمہیں تو ہو

تمہاری قوتِ باطن سے تقویت ہے مجھے
کہ میری باعثِ تاب و تواں تمہیں تو ہو

بغیر آپ کے ہو کیوں نہ جان و دل بے چین
کہ راحتِ دل و آرامِ جاں تمہیں تو ہو

ظفر کی چاہیے نصرت تمہیں نصیر الدین
کہ اس کے یار و مددگار ہاں تمہیں تو ہو

میاں کالے غالب کے دلی دوست ہونے کے علاوہ ان پر حد درجہ مہربان بھی تھے - غالب سے خاندانِ تیموری کی تاریخ فارسی زبان میں لکھوانے کے لئے حکیم احسن اللہ خاں کے ساتھ انھوں نے بھی بہادر شاہ ظفر سے سفارش کی تھی - جب غالب قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہونے کے بعد اکتوبر ۱۸۴۷ء میں رہا ہوئے تو میاں کالے نے ان کو بغیر کسی کرائے کے اپنے مکان میں ٹھہرا لیا جہاں وہ میاں کالے کے انتقال تک رہائش پذیر رہے - غالباً اسی زمانے میں انھوں نے شیعی عقاید کے برعکس میاں کالے کے ہاتھ پر بیعت بھی کر لی تھی - میر مہدی مجروح کو انھوں نے ایک خط میں لکھا ہے :

"سنو میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں۔ شاہ محمد اعظم کے، وہ خلیفہ تھے مولوی فخر الدین صاحب کے اور میں مُرید ہوں اس خاندان کا"

(تحفۂ سیدیہ ص۹۶ تا ص۹۷ ۔ خطوط غالب ص۲۷۹
کلیات نثر ص۲۷۰ ۔ بہادر شاہ ظفر ص۲۵)

مولوی کرم حسین بلگرامی

مولوی کرم حسین بلگرامی کو بلگرام کی علمی اور ادبی تاریخ میں اس اعتبار سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی کی بھی تحصیل کی تھی اور اس پر انگریزوں کا سا عبور رکھتے تھے۔ ان کے ابتدائی حالات کا علم نہیں ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے علوم درسیہ کی تحصیل کلکتہ میں کی اور وہاں مدرسہ عالیہ میں عربی کے پروفیسر ہوئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے قوانین انگریزی کا ترجمہ کیا، جس کے صلہ میں ان کو حکومت کی جانب سے خان بہادر کا خطاب ملا۔

اودھ میں بھی ان کے علم وفضل کی دھوم تھی، اس بنا پر ان کو سرکار اودھ کی طرف سے خلعت معہ اسپ و فیل و پالکی و ناکی عطا ہوئی اور وہ ایک ہزار سات سو روپے ماہوار پر سفیرِ اودھ بنائے گئے۔

مولوی کرم حسین بلگرامی کی سفارت کے زمانے میں غالب کلکتہ میں مقیم تھے۔ حیات غالب کے مؤلف شیخ محمد اکرام نے ان کو غالب کے معترضوں میں شمار کیا ہے جو درست نہیں، غالب نے اپنے قیام کلکتہ کے دوران ان ہی کی فرمائش پر چکنی ڈلی کی تعریف میں فی البدیہہ ایک قطعہ لکھا تھا جو اُن کے اردو دیوان میں موجود ہے۔ غالب نے ایک خط میں اس کی وضاحت یوں کی ہے :-

مولوی کرم حسین میرے ایک دوست تھے، انھوں نے ایک مجلس

میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ و بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجئے - میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور صلہ میں وہ ڈلی ان سے لے لی "

عبدالغفور نساخ کی ایک یادداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غالب کلکتہ میں مقیم تھے مولوی کرم حسین بلگرامی نے کئی مشاعرے اپنے یہاں منعقد کئے تھے اور کلکتہ کے ایرانیوں کی بڑی تعداد ان میں شریک ہوتی تھی - ایک مشاعرہ کی طرح جانوشتہ ایم و مانوشتہ ایم تھی - اس مشاعرہ میں غالب نے یہ غزل پڑھی :

تا فیصلے از حقیقت اشیا نوشتہ ایم

آفاق را مرادف عنقا نوشتہ ایم

مولوی کرم حسین بلگرامی سے کپتان نبسن کو بڑی محبت تھی، وہی ان کا دلی بھی تھا اور محسن بھی، اس کے انگلستان جاتے ہی ریذیڈنٹ نے گورنر جنرل کو تحریک کی کہ وہ اپنے یہاں اودھ کے سفیر کا رہنا موقوف کرے - گورنر جنرل نے اس تحریک کو منظور کر لیا، جس پر سفارت ختم ہو گئی -

مولوی کرم حسین بلگرامی کو کلکتہ کا ماحول اس درجہ سازگار آ چکا تھا کہ انھوں نے سفارت کا عہدہ ختم ہو جانے کے بعد بھی لکھنؤ کی طرف مراجعت کی ضرورت محسوس نہیں کی - کلکتہ ہی میں ۱۲۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے -

(روضۃ الکرام ص ۱۵۳ ، حیات غالب ص ۸۲

غالب ص ۱۲۳ ، تاریخ اودھ چہارم ص ۳۲۸)

سید بدرالدین کاشف

سید بدرالدین نام تھا، کاشف تخلص کرتے اور فقیر کے نام سے پہچانے جاتے تھے، ان کا اصل وطن دہلی تھا، جہاں ان کی غالب کے ہم زلف غلام حسین مسرور سے گہری دوستی تھی، اس کے علاوہ غالب کے ایک دوست حسین مرزا سے بھی ان کے بے تکلفانہ روابط تھے، اس کے باوجود انھوں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ دہلی سے باہر گذارا اور دربار بھرت پور کے وکیل جانی بانکے لال رند کی وساطت سے وہاں ملازم ہو گئے۔

سید بدرالدین کے بھرت پور چلے جانے کے بعد غالب نے ان کو فراموش نہیں کیا۔ وقتاً فوقتاً ان کی خیریت معلوم کرلیا کرتے تھے، یہی کیفیت خود سید بدرالدین کاشف کی بھی تھی۔ انھوں نے جب غالب کو ایک خط کے ذریعہ جانی بانکے لال رند کے داماد کے مرنے اور جوان بیٹی کے بیوہ ہونے کی اطلاع دی تو غالب کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ وہ تعزیت نامہ کیونکر لکھیں۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ فرو ہونے اور حالات معمول پر آنے کے بعد سید بدرالدین کاشف کو اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی یاد ستانے لگی تو انھوں نے دہلی کا قصد کیا اور وہاں ۱۸۶۲ء میں پہنچے۔ اس وقت غالب کی قاطع برہان چھپ چکی تھی اور غالب نے دوستوں میں تقسیم کرنے کے لئے اس کے پچاس نسخے خریدے تھے۔ لیکن بدرالدین کاشف کو ایک بھی نسخہ نہیں دیا۔ سید بدرالدین کاشف نے بھرت پور واپس ہونے کے بعد اس امر کی شکایت کی جس پر غالب نے لکھا:

"میں نے یہ سمجھ کر یہ تمہارے کس کام کی ہے، تمہیں نہ دی۔ تم مانگتے اور میں نہ دیتا تو گنہ گار تھا، اب کوئی جلد باقی نہیں ہے۔ رہا دیوان اگر اس کا منتخب کہتے تو وہ اس عرصہ میں دلّی اور کانپور دو جگہ چھاپا گیا اور تیسری جگہ آگرہ میں چھپ رہا ہے۔"

سید بدرالدین کاشف کے حالات تذکرہ نویسوں نے نظر انداز کر دئے ہیں جس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کو شاعری میں کوئی خاص مرتبہ حاصل نہیں تھا۔ مالک رام نے تلامذۂ غالب میں ان کا صرف نام درج کیا ہے اور کسی قسم کی اطلاع نہیں دی ہے۔

(خطوط غالب دوم ص ۳۶۳ تا ص ۳۶۶)

میر قاسم علی خاں

غالب نے عبدالرزاق شاکر کے نام بعض خطوں میں میر قاسم علی خاں کا ذکر کیا ہے وہ مرزا علی بخش خاں کے دوستوں میں سے تھے۔ مرزا علی بخش خاں ہی کی وجہ سے ان کی غالب سے ملاقات ہوئی تھی۔ جن دنوں انھوں نے دہلی کا قیام ترک کیا اور آگرہ کی منصفی پر چلے گئے تو وہاں منشی نبی بخش حقیر اور عبدالرزاق شاکر سے بھی ان کی دوستی ہو گئی جو غالب کے عزیز دوستوں اور شاگردوں میں سے تھے۔

نادراتِ غالب کے مولف نے ان کو آگرہ اور ماتھرس کا منصف بتایا ہے۔

قاسم علی خاں اپنی چھٹیوں کا زمانہ دہلی میں گزارتے تھے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی چھٹیوں کا زمانہ گزارنے کے لئے ۱۸۶۲ء میں دہلی آتے تھے، لیکن انھوں نے غالب سے ملاقات نہیں کی اور بے ملے آگرہ واپس پہنچ گئے۔ غالب کو ان کے آنے اور بے ملے لوٹنے کا علم ہوا تو انھوں نے عبدالرزاق شاکر سے اس کی شکایت کی، جس پر عبدالرزاق شاکر نے ان کو لکھ بھیجا کہ جس وقت میر قاسم علی خاں آپ سے ملنے کے لئے آپ کے گھر گئے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ ان کو بے ملے لوٹ جانا پڑا۔

میر قاسم علی خاں نے اپنی ملازمت کی ابتدا منصفی سے کی تھی۔ آخر عمر میں صدر امین ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ان کی ترقی نہیں ہوئی اور اس عہدہ سے ان کو ریٹائر ہونا پڑا۔

(عودِ ہندی — دیکھو عبدالرزاق شاکر کے نام خطوط)
(نادرات غالب حاشیہ)

قطب الدولہ قطب علی خاں

قطب علی خاں کو واجد علی شاہ نے "غلام یداللہ خاں قطب الدولہ مفتاح الملک مونس دل پذیر، محمد قطب علی خاں بہادر مصاحب خاص سلطان العالم خلداللہ ملکہ و سلطنتہ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ قطب علی خاں تاریخ اودھ میں قطب الدولہ کے نام سے مشہور ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو دہلی کا گویا بتایا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ واجد علی شاہ کی خودنوشت محل خانۂ شاہی میں مندرج ہے کہ قطب الدولہ کے آباؤ اجداد شہر بریلی کے قوم راجپوت سے تھے اور راجہ جگت دیو کی نسل سے تھے۔ اسی خودنوشت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ واجد علی شاہ نے اپنے زمانۂ ولی عہدی میں ان سے ستار بجانا سیکھا تھا اور وہ استاد کی حیثیت سے اپنے شاگرد کے مزاج میں حد درجہ دخیل ہو گئے تھے۔

واجد علی شاہ نے اپنے سریر آور ہونے کے کچھ دنوں بعد علی نقی خاں کو خلعت وزارت دیا۔ اسی کے ساتھ قطب الدولہ اور بعض دوسرے مصاحبوں کی بھی بن آئی تاریخ بوستان اودھ کے مولف کے بیان کے مطابق قطب الدولہ اور بعض دوسرے مصاحبوں کی منزلت اس درجہ بڑھی اور ان کو اس قدر اقتدار حاصل ہو گیا کہ وزیرالمالک علی نقی خاں کا صرف نام ہی نام رہ گیا۔ ہر جگہ بس ان ہی لوگوں کا دور دورہ تھا۔ علی نقی خاں کے لئے یہ صورت حال کسی طرح بھی قابل قبول نہیں تھی، انھوں نے قطب الدولہ اور دوسرے مصاحبوں کو راستہ سے ہٹانے کے لئے مختلف تدبیریں کیں جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ واجد علی شاہ کا عتاب ان پر نازل ہو گیا اور ان کے حکم پر کچھ دنوں کے لئے ایک

اصطبل میں بند کردئے گئے۔ بعد میں ان کو سزا کے طور پر جلاوطن کر کے کانپور بھیج دیا گیا، جہاں وہ واجد علی شاہ کی جلاوطنی تک رہے۔ بعد میں لکھنؤ آ کر نواب ممتاز الدولہ کی ملازمت کر لی، لیکن بعد میں رام پور کو اپنی جائے رہائش بنا لیا اور اپنی بقیہ عمر وہیں گذار دی۔

قیصر التواریخ کے مولف نے قطب الدولہ کو با کمال ستار نواز اور زبردست موسیقی داں بتانے کے علاوہ ان کے ذوق علم و ادب کی بھی تعریف کی ہے۔ واجد علی شاہ بھی ان کو شاعری میں شہرۂ آفاق و بے بدل شاعر، فارسی داں، عربی داں اور معنی فہم بتاتے ہیں۔ انھوں نے بیشتر شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی ہی نہیں کی تھی بلکہ ان کو بارگاہِ سلطانی تک پہنچا کر ان کے لئے وسائل معاش فراہم کئے تھے غالب اور واجد علی شاہ کے درمیان جو مداح و ممدوح کا تعلق نظر آتا ہے، اس کے استوار کرنے میں قطب الدولہ کی کوششیں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ غالب نے نواب محمد علی خاں عرف مرزا حیدر کے نام اس اجمال کی تفصیل یوں لکھی ہے:

"میں نے حضرت سلطان عالم کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا اور نثر میں ایک عرضداشت بھی لکھی تھی۔ یہ دونوں چیزیں قطب الدولہ کو ارسال کر دی تھیں۔ قطب الدولہ نے مجھ پر مہربانی کی اور قصیدہ و عرضداشت کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کے حکم سے مولانا ضمیر نے اس قصیدہ اور عرضداشت کو ان کے حضور میں پڑھا، بادشاہ نے پسند فرما کے قطب الدولہ کو حکم دیا کہ کسی اور وقت عرضداشت کو دوبارہ ملاحظہ میں پیش کیا جائے تاکہ سائل کو اس کا انعام دیا جاسکے۔ لیکن نظر بد تاک میں تھی۔ قطب الدولہ پہ ادبار چھا گیا اور اس نے وہ قصیدہ اور عرضداشت جوں کی توں مجھے واپس

کر دی ۔"

(تاریخ اودھ پنجم ص۱۶۹ ، کلیات نثر فارسی ص۲۳
قیصر التواریخ ص۸۵ ، ص۸۶ ۔ غالب ص۲۱۶
مزید تفصیل کے لئے دیکھئے "پری خانہ")

میر امجد علی قلق

میر امجد علی قلق کے بزرگوں کا اصل وطن دہلی تھا لیکن انھوں نے یہاں کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظر لکھنؤ کا قصد کیا اور وہاں جا کر طرح اقامت ڈالی۔ عبدالغفور نساخ نے امیر امجد علی قلق کے والد کا نام سید محمد علی اور قادر بخش صابر نے میر اسد علی بتایا ہے۔ امجد علی قلق نے لکھنؤ ہی میں مختلف علوم و فنون کی تحصیل کی اور عین شباب میں کدورہ کالپی پہنچ کر نواب فخر الملک افضل الدولہ احمد بخش خاں بہادر عرف میر منو بے تاب کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا جو عماد الملک غازی الدین خاں خلف نظام الملک آصف جاہ کی اولاد سے تھے۔ میر منو بے تاب کا انتقال ہو گیا تو ان کے صاحبزادے انور الدولہ شفق میر امجد علی قلق کو اپنا استاد مقرر کر کے ان کی عزت افزائی کی۔

غالبؔ انور الدولہ شفق ہی کے ذریعہ میر امجد علی قلق سے واقف ہوتے اور پھر ارتباط اتنا بڑھا کہ گاہ گاہ ان کی خیریت معلوم کرنے لگے۔ انھوں نے ۲۲ ر اکتوبر ۱۸۵۱ء کو انور الدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھا:

"بہت دنوں سے جناب میر امجد علی صاحب کا کچھ حال معلوم نہیں ان کے تخلص نے مجھ کو حیران کر رکھا ہے، یعنی میں قلق میں مبتلا ہوں آپ ان کا حال لکھو۔"

قادر بخش صابر کے بیان کے مطابق میر امجد علی قلق کو مختلف فنون نظم اور اضاف

شعر میں قدرت تمام اور دست گاہ مالاکلام حاصل تھی۔ غالب بھی ان کو متقدمین یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سرحد کمال کو پہنچانے والا خیال کرتے تھے۔ ان کا دیوان شائع ہوگیا تھا۔ لیکن اب نہیں ملتا ہے۔ ان کے چند شعر یہ ہیں:

وہ صاف دل ہوں میں کہ پس از مرگ بھی مرے ——— مرقد پہ بیٹھتا نہیں ممکن غبار کا

خواب عدم میں چین سے سوتا تھا میں قلق ——— ٹھوکر لگائی کس نے کہ بیدار ہوگیا

ہجوم آپ کے در پہ ہے داد خواہوں کا ——— ستم تو دیکھیے ان شرمگیں نگاہوں کا
بیٹھنا ممکن کہاں تھا آستان یار پہ ——— اتفاقی ہے یہ احساں خار دامن گیر کا

مَیں نے ان سے جو کہا دل میں خفا ہو مجھ سے ——— ہنس کے بولے ہے قلق تجھ کو کرامت تسلیم

سنگ در جاناں سے سر ہم کو ٹیک آنا ——— دو چار گھڑی دن کو دو چار گھڑی شب کو

کم ہمتی سے تو نہ گیا ورنہ اے قلق ——— ملک عدم کو قافلے تھوڑے نہیں گئے

(گلستان سخن دوم ص ۲۹۹، سخن شعراء ص ۴۰۲
عود ہندی ص ۱۳۲، ص ۱۳۶)

شیخ لطیف احمد بلگرامی

شیخ لطیف احمد بلگرامی، مولوی کفایت اللہ کے صاحبزادے اور شیخ یاد اللہ کے پوتے تھے جن کو بلگرام کے مولوی زادوں میں انتہائی احترام سے دیکھا جاتا تھا، لطیف احمد

بلگرامی نے لکھنؤ میں علوم درسیہ کی تحصیل کی اور فن مناظرہ میں کمال حاصل کیا۔ اس سے فارغ ہونے پر صوفیا کے ایک معروف سلسلے میں مرید ہو گئے۔ بعد ازاں ملازم ہو کر کانپور چلے گئے۔ اسی دوران شاعری کا بھی شوق ہوا، کچھ دنوں مشق سخن کرنے کے بعد ایک خط کے ذریعہ غالب سے اصلاح کلام کی درخواست کی، اس وقت غالب کی بینائی کمزور ہو گئی تھی، ہاتھوں میں رعشہ آ گیا تھا اور کان سماعت سے جواب دے چکے تھے۔ ان سے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ کسی کے کلام پر اصلاح دے سکیں، انھوں نے معذرت کر لی اور لکھ بھیجا:

"سید ابن حسن خاں صاحب وہاں موجود، میں یہاں محض وجود بے وجود، وہ تو میرے نزدیک علامہ ہیں اور جوان ہیں، میں ان کے نزدیک ایک مشت استخوان ہوں، وہ بھی بوسیدہ اور ناتواں۔ اگر خاں صاحب وارستہ مزاج ہیں تو سید غلام حسین قدر مجتبیٰ، وہ تو میرے قدر دان بھی ہیں اور شاگرد بھی ہیں۔ اگر کچھ بھی اپنے دل و دماغ میں قوت پاتا تو اپنی طبیعت کو آپ سے اصلا دریغ نہ کرتا"

شیخ لطیف احمد بلگرامی کا کلام نہیں ملتا ہے۔ غالب نے اپنے خط میں انکو نعت اور مدح کا فرق سمجھایا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف نعت کہتے تھے، چند شعر ملاحظہ ہوں:

جب تلک جان میں ہے جان یہی دھیان رہے
دل رہے یا نہ رہے، یار کا دامان رہے

حسن اور عشق کا اٹھ جائے کہیں جلد حجاب،
پردہ لیلیٰ کا نہ مجنوں کا گریبان رہے

واہ کیا فہم کہ بندے تو بتوں کے ہو لطیف

اور خدا سے ہے مناجات کہ ایمان رہے

(خطوط غالب دوم ص ۳۷۳ تلامذہ غالب ص ۲۵۱)

سر چارلس مٹکاف

سر چارلس مٹکاف کا سال ولادت ۱۷۸۵ء ہے۔ وہ کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے فوری بعد ان کو پندرہ سال کی عمر میں ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ کمپنی کی ملازمت اختیار کرنا پڑی۔ اس کے چار سال بعد لارڈ لیک نے بھرت پور کی طرف پیش قدمی کی اور راجہ ہلکر اور اس کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ اس موقع پر سر چارلس مٹکاف کو لارڈ لیک کی فوجوں کا پولیٹیکل افسر مقرر کیا گیا۔ جس وقت قلعہ بھرت پور پر گولہ باری جاری تھی۔ سر چارلس مٹکاف نے اپنی جان پر کھیل کر فصیل پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ ان کی اس جرأت اور بہادری کے صلے ان کے منصب میں اضافہ کیا گیا اور وہ ۱۸۰۶ء میں دہلی کے مددگار رزیڈنٹ بنا دیئے گئے۔

سر چارلس مٹکاف کو دہلی کے مددگار رزیڈنٹ کے عہدہ پر کام کرتے ہوئے تین سال بھی نہیں گذرے تھے کہ ان کو رنجیت سنگھ کا سفیر مقرر کیا گیا۔ ۱۸۲۰ء کو دوبارہ ان کو مددگار رزیڈنٹ دہلی مقرر کیا گیا۔

۱۵ جولائی ۱۸۲۵ء کو دہلی کے رزیڈنٹ جرنیل اختر لونی کا میرٹھ میں انتقال ہو گیا۔ اس طرح ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف دہلی کے مستقل رزیڈنٹ بنا دیئے گئے اس وقت غالب احمد بخش خاں کے پاس فیروز پور میں مقیم تھے۔ ان کا یہ قیام اپنی پنشن کے سلسلہ میں تھا، انہوں نے خود لکھا ہے۔

"نواب (احمد بخش خاں) نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ سر چارلس مٹکاف کو آنے دو میں تمہیں ان کی خدمت میں پیش کر کے تمہارا ان سے

تعارف کراؤں گا، تمہارے معاملات اور تمہارے چچا کے سرکار انگریزی سے تعلقات کی بھی وضاحت کروں گا تاکہ تم کو تمہارا حق مل سکے۔"

غالب کا سر چارلس مٹکاف سے تعارف بھی نہیں ہوا تھا کہ بھرت پور کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا، اور سر چارلس مٹکاف نے یہ طے کر لیا کہ بھرت پور کے جائز وارث بلدیو سنگھ کو اس کی گدی دلائی جائے جس پر اس کا چچا غلط طریقہ پر قابض ہو گیا ہے۔ سر چارلس مٹکاف پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح تھی کہ اگر چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو حکومت کے خلاف من مانی کرنے کی اجازت دے دی گئی تو وہ انگریزوں کے لئے مصیبت بن جائیں گے چنانچہ اس نے کمانڈر انچیف لارڈ کومبر کی سرکردگی میں ایک جمعیت بلدیو سنگھ کی مدد کے لئے بھرت پور روانہ کر دی۔ نواب احمد بخش خاں بھی بھرت پور جا رہے تھے۔ انہوں نے غالب سے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

غالب اس زمانے میں اپنے بھائی مرزا یوسف کی بیماری کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ قرض خواہوں نے بھی الگ دق کر رکھا تھا۔ وہ ذہنی طور پر خود کو آمادۂ سفر نہیں پاتے تھے، اس کے باوجود ان کو توقع تھی کہ وہ بھرت پور جائیں گے تو ان کو سر چارلس مٹکاف سے متعارف ہونے کا موقع مل جائے گا۔ مرزا یوسف کو دوسروں کے سپرد کر کے چوری چھپے نواب احمد بخش خاں کے ہمراہ بھرت پور کی سمت چل پڑے۔ بھرت پور پہنچنے کے بعد نواب احمد بخش خاں نے سر چارلس مٹکاف سے ان کا تعارف نہیں کرایا۔ اسی دوران نواب احمد بخش خاں کے منہ پر لقوہ گر گیا ڈاکٹر ڈنگن نے بڑی دلجمعی سے علاج کیا۔ وہ کچھ دنوں کے بعد صحت یاب ہو کر فیروز پور واپس ہو گئے۔ غالب کو بھی نامرادانہ لوٹنا پڑا۔ سر چارلس نے بھرت پور کا قضیہ سلجھانے اور بلدیو سنگھ کو گدی دلانے کے بعد تین روز کے لئے فیروز پور میں قیام کیا۔ غالب نے احمد بخش خاں سے بار بار درخواست کی لیکن انہوں نے ان کو متعارف

سرانے کی زحمت نہیں کی۔

سرچارلس مٹکاف سے دہلی جانے کے بعد غالب نے خیال کیا کہ انگریز انصاف پسند حکمراں ہیں، اپنی رعایا میں سے ہر ایک کا خیال رکھتے ہیں، اس صورت میں میں نواب احمد بخش کا وسیلہ کیوں تلاش کروں، خود چارلس مٹکاف کی خدمت میں پیش ہو کر اپنے حالات عرض کروں گا لیکن قرض خواہوں کے خوف کی وجہ سے وہ دہلی نہیں جاسکے

اس واقعہ کے سات آٹھ سال بعد تک غالب اور سرچارلس مٹکاف میں کسی قسم کا تعارف نہیں ہوسکا۔ سرچارلس مٹکاف ۱۸۳۴ء میں اکبرآباد کے گورنر ہو کر وہاں چلے گئے۔ ۱۸۳۶ء میں انکو گورنر جنرل کا قائم مقام بنایا گیا۔ اسی دوران وہ گورنر جنرل کی کونسل کے وائس پریذیڈنٹ بھی مقرر ہوئے۔ اس موقع پر غالب نے "بہ انداز تہنیت احراز پایہ وائس پریذیڈنٹی شور مدح سرچارلس مٹکاف بہادر انگیختن" کے عنوان سے ایک طویل قصیدہ لکھ کر نذر کیا۔

سرچارلس مٹکاف سے غالب کی توقعات پوری نہیں ہوسکیں۔ سرچارلس مٹکاف اس وقت خود بھی اپنی ملازمت کے تغیر و تبدل کا شکار تھے۔ اس کے دو سال بعد ہی ۱۸۳۸ء میں ان کو گورنر مغرب و شمال بنادیا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں وہ گورنر اضلاع متحدہ مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل کینیڈا بنائے گئے۔ ۱۸۴۵ء میں ریٹائر ہو گئے ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔

(واقعات دار الحکومت دہلی ص۲، کلیات نثر ص۹۵
کلیات غالب نظم فارسی دوم ص۱۴۰)

میر مہدی مجروح

میر مہدی مجروح، میر حسین فگار کے بیٹے اور دہلی کے باشندے تھے جن کے آباؤ اجداد

نے مغلوں کے آخر عہد حکومت میں ایران سے ہندوستان کی طرف ہجرت کی تھی اور شاہی ملازموں کے زمرے میں شامل ہو گئے تھے۔ مجروح کا سال ولادت ۱۸۳۳ء ہے ان کی تمام تر تعلیم و تربیت گھر ہی پر ہوئی، ان کے خاندان کے تمام افراد علم و ادب سے بہرہ ور تھے، یہی چیز ان کو بھی ورثہ میں ملی، ذوق، غالب اور مومن کی شاعری کے چرچوں نے ان کو شاعری کی راہ پر ڈالا اور وہ غالب کی خدمت میں پہنچ کر ان کے باقاعدہ شاگرد ہو گئے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں جب کہ شریفوں اور وضیعوں کے لئے دہلی میں رہنا ناممکن ہو گیا تھا، مجروح نے پانی پت کی راہ لی اور وہاں انصاریوں کے محلہ میں رہنے لگے، غالب نے ان کے نام اپنے ایک خط میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:——

"یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی تو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ میں رہنے والا لوٹ کر لے گیا"

جب حالات سکون پذیر ہوئے اور لوگوں نے دوبارہ دہلی آنا شروع کیا تو مجروح بھی فکر معاش میں دہلی چلے آئے لیکن یہاں روزگار کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں الور کے راجہ شیو دھان سنگھ نے کمال قدر دانی کا مظاہرہ کیا اور اپنے یہاں بلا کر پہلے نائب تحصیلداری اور پھر تحصیلداری تفویض کی۔ ابھی انھوں نے آرام و اطمینان کے چند ہی دن گزرے تھے کہ راجہ شیو دھان سنگھ کا انتقال ہو گیا اور مجروح کو پھر ایکبار بیکاری کی صورت دیکھنا پڑی۔ ان کی بیکاری اور پریشانی کا ذکر مہاراجہ جے پور سوائی رام سنگھ نے سنا تو نہ صرف ان کی قدر افزائی کی بلکہ شہر کا نائب کوتوال مقرر کر دیا۔ مجروح جے پور میں ایک طویل مدت تک قیام پذیر رہے۔ البتہ سوائی رام سنگھ کے انتقال پر ان کو پھر اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ متعدد بار گزر چکے تھے۔ انھوں نے رام پور جا کر نواب حامد علی خاں کا توسل اختیار کیا۔ موت سے کچھ دنوں پہلے ان کی آنکھوں کی

بصارت زائل ہو چکی تھی ۱۰ ار صفر ۱۳۲۱ھ ان کی تاریخ وفات ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے انتقال سے کچھ دیر پہلے اغفرلی الٰہی کہا تھا، اسی سے ان کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ ان کی لاش رام پور سے دہلی بھجوائی گئی جہاں وہ درگاہ قدم شریف میں دفن کیے گئے۔ نواب احمد سعید خاں طالب نے یہ قطعہ تاریخ کہا جو ان کے طرح مزار پر کندہ ہے:——

یادگارِ غالب معجز بیاں | میر مہدی سید والد تبار
پر کلامش سر بسر آہ و فغاں | چوں تخلص بود مجروح نگار
کرد از دنیا چو آہنگ سفر | گفت اغفرلی الٰہی چند بار
طالبا دیگر مرنجاں فکر را | راز خوش خود ز اغفرلی برآر

مجروح کی نثر بہت عمدہ تھی۔ غالب نے اپنے خطوط میں ان کی نثر اور طرز عبارت کی بڑی تعریف کی ہے اور رشک ظاہر کیا ہے۔ مجروح کو غالب سے بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے غالب کی وفات پر جو مرثیہ کہا ہے وہ ان کے بے پایاں اخلاص، ارادت اور بندگی کا آئینہ دار ہے۔

(گل رعنا ص ۴۳۱ ص ۴۳۶، گلدستہ مذاق سخن مئی ۱۹۰۳ء

خطوط غالب (مجروح کے نام)

محمد علی خاں

محمد علی خاں، سراج الدین علی خاں قاضی القضات صدرِ عدالت کلکتہ کے چھوٹے بھائی تھے جن کا موہان کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ حکومتِ انگریزی نے ان کی لیاقت اور معاملہ فہمی کی بڑی قدردانی کی اور مختلف اوقات میں مختلف عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور کیا۔ انہوں نے کچھ دن بندیل کھنڈ کی عدالت میں بھی

اپنے فرائض انتہائی دیانتداری اور خوش اسلوبی سے انجام دیے آخر عمر میں ان کو باندہ کا صدر امین بنا دیا گیا تھا۔

پنج آہنگ میں محمد علی خاں کے نام غالبؔ کے کئی خط ملتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے کلکتہ روانہ ہوتے وقت چلّہ تارا سے ایک تھانے دار کے ہاتھوں ان کے نام ایک خط ارسال کیا تھا۔ اس طرح ان میں اور غالبؔ میں یگانگت اور موانست پیدا ہوئی تھی۔ غالب ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سفر اور قیام کلکتہ کے حالات سے بھی مطلع کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے اور حامیانِ قتیل کے درمیان ہونے والے ادبی معرکہ کی بھی پوری تفصیل لکھ بھیجی تھی

میرے یہاں آنے کے بعد سے ہر انگریزی مہینہ کے پہلے اتوار کو مدرسۂ عالیہ میں محفلِ مشاعرہ آراستہ ہوتی جس میں سخن ور حضرات اپنا فارسی اور اردو کلام پیش کرتے اس محفلِ مشاعرہ میں ایک مرتبہ ہرات سے آنے والے ایک معزز شخص نے بھی شرکت کی اور فقیر کے کلام کو پسند فرمایا۔ اس سے بعض سخن ور جل اٹھے اور انہوں نے میرے دو شعروں پر غلط قسم کا اعتراض جڑ دیا اور شہر میں اس کو خوب شہرت دی۔ اس سے پہلے کہ میں اس اعتراض کا جواب دیتا، نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد محسن کے تعیلِ حکم میں ایک مثنوی لکھی اور انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ اعتراض نقل کر دیا۔ ہے۔ یہ مثنوی جلد ہی ملاحظہ گرامی کے لئے ارسال کروں گا۔

گلشنِ سخن کے مؤلف نے محمد علی خاں کا سالِ انتقال ۱۲۴۰ھ بتایا ہے اور ان کے چند شعر بطورِ نمونہ نقل کئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد علی خاں اپنی علم دوستی اور ادب پروری کے قطعِ نظر ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔

مست و ساغر بکف آں رشکِ قمر می آید

بہ من از بے خبری باز خبر می آید

دامن کشاں ز صحبتِ من یار می رود
کارم نہ دست و دستِ من از کار می رود

شہیدِ تیغِ حسن صندلی رنگم چہ می پرسی
حدیثِ مقتلِ مارا شنیدن دردِ سر دارد

پان و مِسی را بہ بیں در دہنِ نازنین
شام و شفق جلوہ گر ایں گل دیگر شگفت

(صبح گلشن صفحہ ۳۷۹ صفحہ ۳۸۰ ۔ کلیاتِ نثرِ غالب صفحہ ۱۷ صفحہ ۱۶۶)

محمد علی خاں والیٔ ٹونک

والیانِ ٹونک کا تعلق ان افغانوں سے تھا جو بنیر سے تعلق رکھتے تھے - ان کے آباؤ اجداد میں ایک شخص طالع خاں نے عہدِ محمد شاہ میں روہیل پہنچ کر فوجی ملازمت حاصل کرلی، طالع خاں کے انتقال پر اس کا بیٹا حیات خاں مراد آباد میں اراضی خرید کر زمینداری کرنے لگا - بعدازاں اس کے بیٹے امیر خاں نے ترقی کی اور ہلکر کی فوج میں سپہ سالار ہوگیا اور ۱۸۰۶ء میں اپنی خدمات کے عوض ہلکر سے ٹونک کی ریاست حاصل کرلی۔

جب مالوہ پر انگریزوں کا اقتدار ہوگیا تو امیر خاں نے ان سے اپنی حمایت کی درخواست کی ۔ اس درخواست پر انگریزوں نے اسے ان علاقوں پر قابض و متصرف رہنے دیا جو اس نے ہلکر سے حاصل کیے تھے ۔ اس کے بعد اس نے انگریزوں کی ہدایت پر اپنی فوج میں کمی کردی اور نومبر ۱۸۱۷ء میں انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا بعد میں انگریزوں نے ضلع پلوسہ کے علاقے بھی اسے بطورِ جاگیر دے دیے۔ ۱۸۳۴ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے وزیر محمد خاں نے زمامِ اقتدار سنبھالی ۔

وزیر محمد خاں نے اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے کے دوران انگریزوں کی

مدد کی اور ان کو مختلف طریقوں سے کمک پہنچاتا رہا جس پر انگریزوں نے ۱۸۶۲ء میں اسے سند جانشینی جاری کردی - اسی سال اس کا بیٹا نواب محمد علی اس کا جانشین ہوا. یہی نواب محمد علی خاں، غالب کے ممدوح تھے - غالب نے ان کی مسند نشینی پر دس اشعار کا ایک قطعہ تاریخ کیا، جس کا پہلا شعر یہ ہے :

دریں سالِ نواب عالی جناب
بروئے زمیں عنبرت آفتاب

ابھی محمد علی خاں کی مسند نشینی کو چھ سات سال ہی گذرے تھے کہ انگریزوں کی نگاہ ان سے پھر گئی - خود محمد علی خاں بھی انگریزوں کے تسلط اور اقتدار کے خلاف تھے انھوں نے ان تمام اثرات کو ریاست سے ختم کرنے کی تیزی سے کوشش کی، جو انگریزوں نے مرتب کر رکھے تھے - ان وجوہ کی بنار پر انگریزوں نے ایک ٹھاکر لاوہ کے قتل کو بہانہ بنا کر ان کو ۱۸۶۷ء میں ریاست سے معزول کر دیا اور وہ بنارس میں نظر بند کر دیئے گئے -

غالب نے محمد علی کی مدح میں دو قصیدے لکھے ہیں - پہلا قصیدہ ۱۲۷۸ھ میں بھیجا گیا تھا - اس وقت غالب کی عمر ایک اندازہ کے مطابق ۶۴، ۶۵ برس تھی - اس کا پہلا اور آخری مصرعہ یہ ہے :

اے ذات تو جامع صفتِ عدل و کرم را
مرے برشرف ذات تو اجماعِ امم را

تا چرخ کشد محملِ برجیس بعتا باد
نواب فلک محملِ برجیس شیم را

اس قصیدہ کا صلہ ملنے میں دیر ہوئی، غالب نے ایک ہجویہ قطعہ لکھا جس میں

انعام نہ پہنچنے کا جواز یہ پیدا کیا گیا ہے کہ ممدوح مختلف ملکوں اور شہروں سے انعام کے لئے چیزیں جمع کر رہا ہے۔ دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، دکن سے ہاتھی، عراق سے گھوڑے، نیشاپور سے فیروزہ اور بدخشاں سے یاقوت آئیں گے۔ اس کے بعد ہی انعام بھیجا جائیگا حالی نے اس قطعہ کو ہجو ملیح کی مثال میں یادگارِ غالب میں نقل کیا ہے۔ نواب محمد علیخاں نے غالب کی یہ ادائے طلب تاڑلی اور فوری ان کو صلہ بھجوادیا۔

اس کے بعد غالب نے دوسرا قصیدہ عید الضحیٰ کے موقع پر بھیجا جسکا مطلع ہے

عید الضحیٰ بسر آغاز زمستاں آمد
وقت آراستین حجرہ و ایواں آمد

(صحیفہ زریں ص۳۶، آجکل فروری ۵۸ء
ذکرِ غالب ص۲۷، کلیات نظم غالب اول ص۳۴۳
کلیات نظم غالب دوم ص۳۴۱)

حکیم محمود خاں

حکیم محمود خاں کا سال ولادت ۱۲۳۷ھ ہے۔ وہ حکیم صادق علی خاں کے بیٹے اور حکیم شریف خاں کے پوتے تھے، جن کی نسبت سے ان کا خاندان شریفی کہلاتا ہے۔ حکیم محمود خاں کی عمر چودہ سال سے بھی کم تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور وہ اپنے خاندانی عہدۂ طبابت پر متقرر کیے گئے۔ اس دوران انھوں نے تحصیل علمی کی جانب بھی توجہ کی اور طبابت میں بھی نام نکالا، جس کی بنا پر ریاست جنید کی جانب سے ان کو معقول روپے وظیفہ کے طور پر ملنے لگے۔

جس وقت ۱۸۵۷ء کی سعیٔ انقلاب ناکام ہوئی، انگریزوں نے دہلی میں داخل ہو کر کشت و خوں اور پکڑ دھکڑ کا ایسا ہولناک سلسلہ شروع کر دیا جسے دیکھ کر ہلاکو اور

چنگیز نگوں سار ہو جائیں - اس بربریت اور سفاکی کے دور میں حکیم محمود خاں اور ان کی گلی پر کسی قسم کی آنچ نہیں آئی - اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ حکیم محمود خاں کے بھائی حکیم غلام مرتضیٰ خاں اور حکیم غلام اللہ خاں کو پٹیالہ کے راجہ نریندر سنگھ سے توسّل تھا اور اس کی فوجیں انگریزوں کو کمک پہنچا رہی تھیں - غالب نے لکھا ہے کہ :

" راجہ نے ازراہِ بندہ پروری انگریزوں سے طے کر لیا تھا کہ جب شہر فتح ہوگا ، اس گلی کے دروازہ پر محافظ مقرر کر دئے جائیں گے تاکہ انگریز فوجی گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں ."

اس دوران ہزار ہا افراد نے اپنا اثاثہ حکیم محمود خاں کی حفاظت میں دے کر دہلی سے راہِ فرار لی - ۱۸۵۸ء کے آغاز میں جنوری کے مہینہ میں ہندوستانیوں کی خطائیں معاف ہوئیں اور لوگ پھر شہر واپس ہونے لگے تو حکیم صاحب نے دو کروڑ روپے سے زائد کی امانتیں واپس لوٹائیں - اس دوران غالب کے الفاظ میں :——

" بدخصلت مخبروں نے حاکم شہر کو باور کرایا کہ راجہ نریندر سنگھ کے طبیبوں کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ بن گیا ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک دو فسادی بھی ان میں موجود ہوں - اس خیال سے حاکم شہر ۲ فروری کو منگل کے دن کچھ سپاہیوں کے ساتھ اس جگہ آیا اور مکان کے مالکوں کو دوسرے ساٹھ نیک دل پناہ گزینوں کے ساتھ پکڑ کر اپنے ہمراہ لے گیا - اگرچہ کئی رات دن سب کو حوالات میں رکھا گیا لیکن با عزت لوگوں کی پوری طرح عزت کی گئی - بالآخر ۵ فروری کو جمعہ کے دن حکیم محمود خاں ، حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے بھتیجے عبدالحکیم خاں کو واپسی کی اجازت ہو گئی - ۱۲ فروری کو کچھ اور لوگ رہا کر دئے گئے - ۱۴ فروری کو تین اور نے رہائی پائی ....."

اس واقعہ کے دو ماہ بعد حکیم محمود خاں اپنے سارے رشتہ داروں ، بیوی بچوں اور

متعلقین کے ساتھ پٹیالہ کی طرف چلے گئے۔ غالب نے یکم مئی کو اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہوئے حکیم غلام نجف خاں کو ایک خط میں لکھا ہے کہ :—

"آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائر پٹیالہ کو گئے ہیں بہ مقتضائے وقت اپنی سکونت کے مکان کو چھوڑ کر یہاں آرہا ہوں۔ اس طرح کہ محل سرا میں زنانہ اور دیوان خانہ میں مردانہ"

حکیم محمود خاں کی ہمہ جہتی شخصیت کا احاطہ ممکن نہیں۔ دہلی اردو اخبار نے اپنی ۵ دسمبر ۱۸۴۱ء کی اشاعت میں ان کے علاج مسیحائی کا ایک واقعہ درج کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق :—

"جے پور کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ روڈ بیجو صاحب مصاحب راج بہت بیمار تھے اور امراض طرح طرح کے متضاد تھے۔ مدت مدید سے کہ ان کا علاج مشکل تھا۔ حکیم محمود علی خاں سے رجوع کے ساتھ معالجہ کے سوا ڈیڑھ مہینے علاج کیا تھا جو عنایت الہٰی سے صحت کامل ہوگئی اور ۱۱ نومبر کو غسلِ صحت کیا۔ مجلس خوشی و شادمانی کی منعقد ہوئی۔ حکیم صاحب موصوف کو خلعت بیش قیمت پانچ پارچہ کا دوشالہ سات سو روپے کا سونا لگا ہوا بطریق انعام عطا کیا۔"

حکیم محمود خاں نے ۷۲ سال کی عمر میں ۱۳۰۹ھ میں انتقال کیا۔ تمام ملک میں ان کا ماتم کیا گیا۔ حالی نے بھی اس موقع پر ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کا ایک بند یہ ہے :-

جا چکی تھی تجھ سے گر اے شہر عظمت قوم کی
ہو چکی تھی آبرو مدت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی
اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

کیا دکھا کر اب دلائے گا سلف کی یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہاں آباد تو

(حیات اجمل ص۱۲۲ ص۱۴۶ ص۲۰۳، بتغیر:
تاریخ صحافت اردو ص۱۲ ، دیوان حالی
خطوط غالب ص۳۷۹)

محمد محسن

غالب نے اپنے بعض فارسی خطوط میں محمد محسن کا ذکر کیا ہے۔ ان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے ہیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ جس وقت غالب کلکتہ گئے تھے، ان کی ملاقات محمد محسن سے بھی ہوئی تھی جو گورنر جنرل کے فارسی دفتر سے متعلق تھے۔

جب کلکتہ میں غالب کے کلام پر اعتراضات ہوئے تھے تو علی اکبر خاں اور محمد محسن نے ان کے جوابات دیئے تھے۔ اور ان کو رد کیا تھا۔ ان دونوں کی تحریک پر غالب نے ایک مثنوی باد مخالف کے ذریعہ سخن پروران کلکتہ سے معذرت خواہی کی تھی اور اپنے سفر کی غرض و غایت بیان کرنے کے علاوہ اپنے مسلک اور اصول سمجھائے تھے۔ اور کہا تھا کہ میں آدبزش بیان سے نہیں ڈرتا۔ مجھے اعتراضوں کی بھی فکر نہیں ہے، البتہ یہ ضرور سوچتا ہوں کہ اتفاق سے یہاں چندروز کے لئے آیا ہوں اگر آپ کو ناراض کروں گا تو آپ ہی بعد کو طعنہ دیں گے۔ کہ دہلی سے ایک شوخ چشم اور بے حیا آیا تھا جس نے بزرگوں سے بے کار کا جھگڑا کیا۔

جب لارڈ ہنگ دہلی آئے تو محمد محسن بھی ان کے ہمرکاب تھے۔ انہوں نے دو دن غالب کے مکان پر قیام کیا تھا۔ پھر ایک الگ مکان کرایہ پر حاصل کر کے اس میں رہنے لگے تھے۔ لارڈ ہنگ کے کلکتہ روانہ ہونے کے چند ہی دنوں بعد محمد محسن کا ستارہ

گردش میں آگیا۔ بعض شرپسندوں نے گورنر جنرل کو غلط رپورٹ پہنچائی کہ محمد محسن خفیہ نویسی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اس پر گورنر جنرل کے حکم سے ان کو معزول کر دیا گیا تحقیقات کے دوران ان پر فردِ جرم عاید نہیں ہو سکی۔ جس پر وہ بری کر دیئے گئے اور ان کو اپنے وطن جانے کی اجازت مل گئی۔ غالب نے سراج الدین احمد کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

"مولوی محمد محسن خفیہ نویسی کے جرم میں ماخوذ ہیں، حاسدوں نے مجھے ان کا سچا دوست جان کر پریشان کرنا شروع کر دیا ہے۔ روز الٹی سیدھی خبریں سناتے رہتے ہیں۔ مولوی محسن پر جو الزام تھا ثابت نہ ہو سکا۔ وہ خدمت سے ہٹا دیئے گئے اور ان کو وطن جانے کی اجازت مل گئی۔"

(کلیات نثر غالب ص۱۳۸)

نواب غلام حسن خاں محو

نواب غلام حسین خاں مسرور کا پہلا نکاح نواب الٰہی بخش معروف کی چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوا تھا، لیکن بعد میں انھوں نے ایک اور خاتون شگی بیگم سے شادی کر لی جس کو دہلی والے طوائف خیال کرتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی نے اس اتہام کی پرزور طریقے پر تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ شگی بیگم طوائف نہیں تھی۔ نواب غلام حسن خاں محو شگی بیگم کے سب سے بڑے لڑکے اور نواب زین العابدین خاں عارف کے علاتی بھائی تھے۔

اس بنا پر ان کو بھی غالب کا بھانجا کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

نواب غلام حسن خاں محو نے اپنی تصنیف "نصرت نامہ گورنمنٹ" میں اپنے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب غلام حسین مسرور کے انتقال کے بعد آگرہ کے لیفٹننٹ گورنر نے نواب غلام حسن خاں محو اور ان کے اہل خاندان

سی بڑی دلجوئی کی اور جون ۱۸۵۵ء سے پنشن کا حکم نامہ جاری کر دیا جس کی رو سے ان کو ماہانہ سو روپے باقاعدگی سے ملنے لگے۔

دریں اثنا، ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو ان کو اطلاع ملی کہ سرکار انگریزی نے ان کے آٹھ سو روپے کے بقایا جات بھی ادا کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور وہ یہ بقایا جات متعلقہ دفاتر سے برداشت کر سکتے ہیں، ۱۱ مئی کو مجاہدوں نے دہلی پہنچ کر انگریزوں کا قتلِ عام شروع کر دیا جس کے بعد بقایا جات کے علاوہ پنشن بھی چند مہینوں کے لئے مسدود ہو گئی۔

عبدالغفور نساخ، نواب غلام حسن خاں محو کے دوستوں میں تھے انھوں نے ان کو شیخ محمد ابراہیم ذوق اور غالب کا شاگرد بتایا ہے۔ غالب نے علائی کے نام بعض خطوط میں نواب غلام حسن خاں محو کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"نواب غلام حسن خاں اگر کسی دن آجائیں گے تو ان کو تمہاری تحریر کا خلاصہ خاطر نشاں کروں گا۔"

مرزا قادر بخش صابر کے بیان کے مطابق نواب غلام حسن خاں محو شعر و سخن کی طرف کبھی کبھی ملتفت ہوتے تھے، لیکن حسن طبیعت اور رسائی فکر سے کلام سے مشاقی برستی تھی قادر بخش صابر نے ان کے یہ شعر اپنے تذکرہ میں درج کیے ہیں:

آج دم دے کر اجل کو ہو گئے آزاد ہم قید ہستی سے رہائی غیر ممکن تھی ہمیں

جو جو تمہارے دل میں ہیں ارماں نکالیے موجود ہوں میں سامنے تیغ و کفن لئے

بت پرستی کرتے کرتے میں بھی پتھر ہو گیا سخت جاں صحبت سے تیری اے ستم گر ہو گیا

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں اب بام پہ وہ بھی　　اتنا تو ہوا ہے مرے نالوں کے اثر سے

انداز جنوں کونسا ہم میں نہیں مجنوں　　پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے
گل کھانے کو دیتے ہیں مجھے غیر کا چھلّا　　ڈھب میرے جلانے کے وہ کیا کیا نہیں کرتے

اس کو استقبال کیسے آپ کے دیدار کا　　آگیا آنکھوں میں دم ہی مجھ نحیف و زار کا
اپنا اپنا حوصلہ ہے اپنا اپنا ضبط ہے　　میں نہیں موسیٰ کہ مجھ سے غدر ہو دیدار کا

دل لگانے کا مزہ دیکھ لیا آخر کار　　ہم نہ کہتے تھے کہ اے محو پشیماں ہوگا

(گلستان سخن دوم صفحات ۳۴۰، غدر کا نتیجہ ص۶۰

خطوط غالب ص۴۸ ، سخن شعرا ص۴۲۲)

غلام حسین خاں مسرور

شرف الدولہ نواب غلام حسین خاں بہادر نام، سہراب جنگ خطاب اور مسرور تخلص تھا۔ وہ نواب فیض اللہ خاں کے صاحبزادے اور نواب قاسم جان برادر عارف جان کے پوتے تھے۔ ان کا پہلا نکاح مرزا الٰہی بخش کی چھوٹی صاحبزادی بنیادی بیگم سے ہوا بنیادی بیگم کے بطن سے زین العابدین خاں عارف اور حیدر حسین خاں پیدا ہوئے۔ انکے ایام طفولیت ہی میں میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو گئی، جس پر انھوں نے بنیادی بیگم کو سات ہزار روپے کی مالیت کا ایک مکان دے کر علیحدہ کر دیا اور ایک عورت منگی بیگم سے دوسری شادی کر لی۔ منگی بیگم کے بطن سے ان کے چار لڑکے ہوئے جن میں غلام حسن خاں محو نے نسبتاً زیادہ شہرت حاصل کی۔

مولوی کریم الدین نے ان کو ساٹھ سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ گھر سے باہر اپنے کہیں نہیں جاتے، وجہ معیشت سے بے فکری ہے۔ گھر ہی میں رہتے ہیں۔ فکر شعر و سخن کا بھی کرتے ہیں، اچھا شعر کہتے ہیں، مدت سے انھوں نے شعر کہا ہی نہیں تھا، جن ایام میں میرے مکان پر مشاعرہ ہونا شروع ہوا، انھوں نے بھی ایک دفعہ ایک غزل اپنے خلف الصدق عارف کے ہمدست روانہ کی تھی۔

قادر بخش نے بھی اپنے تذکرہ میں غلام حسین خاں مسرور کے کمالِ سخن کی تعریف کی ہے۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم موسیقی پر بھی استدارک رکھتے تھے اور ستار نوازی میں بھی ان کو پوری پوری مہارت حاصل تھی۔ ان کا سالِ انتقال ۱۸۵۴ء ہے۔

اُن کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ماہ پر میری سیہ بختی کا گر سایہ پڑے
چادر مہتاب ہو دامن شب دیجور کا

لکھ کر زمیں پہ نام ہمارا مٹا دیا
ان کا تو کھیل خاک میں ہم کو لٹا دیا

ناداں نہیں جو اپنے کو رسوا کرے کوئی
دل ہی نہ بس میں ہووے تو پھر کیا کرے کوئی

بیٹھے کیا کرتے ہیں صحرا میں تگا پو ہی سہی
چشم خوباں نہ سہی دیدۂ آہو ہی سہی
سخت جانی سے دم ذبح مرے ہاتھ نہ کھینچ
گر تجھے تجربۂ قوتِ بازو ہی سہی

(گلستانِ سخن دوم ص... طبقات الشعرائے ہند ص...)

منشی بہاری لال مشتاق

منشی بہاری لال مشتاق، رائے من بھاون لال کے صاحبزادے تھے۔ ان کا

سال ولادت ۱۸۳۵ء ہے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم انھوں نے غالب کے زبردست حریف اور قاطع القاطع کے مولف مولوی امین الدین سے حاصل کی۔ غالباً ابتدا میں شاعری میں بھی ان ہی سے اصلاح لیتے رہے۔ بعد میں حکیم غلام رضا خاں اور حکیم محمود خاں کی وساطت سے غالب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کو اپنا کلام دکھانے لگے۔

منشی بہاری لال مشتاق کو فن خوش نویسی میں بڑی مہارت تھی۔ غالباً انھوں نے اسے مرزا حمید اللہ بیگ سے سیکھا تھا۔ جب فروری ۱۸۶۸ء میں ان کے والد رائے سن بھاون لال کا انتقال ہو گیا اور تمام گھریلو ذمہ داریاں آ پڑیں تو حکیم محمود خاں کے ہفتہ وار اکمل الاخبار کی کتابت کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ان کی عبدالغفور نساخ سے بھی ملاقات ہوئی۔

منشی بہاری لال مشتاق ۱۸۸۰ء تک اکمل الاخبار سے منسلک رہے، بعد میں لالہ سری کرشن داس گڑوالا کے یہاں بہی کھاتہ لکھنے کی خدمت پر نوکری کر لی اور ۱۹۰۸ء میں انتقال کیا۔

غالب کے بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی بہاری لال مشتاق کی لیاقت علمی معمولی تھی۔ اس سلسلہ میں غالب اکثر ان کو متوجہ کرتے رہتے تھے۔ ایک خط میں ان کو لکھا ہے "چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل تحریر ہمیشہ رہتا ہے۔ بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمہاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں رہتی ہیں، تم کو جا بجا آگاہ کرتا رہتا ہوں، خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ بالکل زائل ہو جائے۔"

مرزا عسکری کے بیان کے مطابق منشی بہاری لال مشتاق کو اپنے افکار اور ذاتی کاروبار کی وجہ سے شعر و شاعری کی طرف توجہ کرنے کی فرصت کم ملتی تھی۔ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بطور تفنن طبع کہا ہے۔ نساخ نے اپنے تذکرہ میں ان کے یہ شعر نقل کئے ہیں:

یوں تیرے ساتھ بزم میں دشمن کا بیٹھنا وہ اعتراض ہے کہ اٹھایا نہ جائے گا۔
ہوگا اثر جو دل میں تو خود جان لیں گے وہ مشتاق ہم سے عشق جتایا نہ جائے گا
جہاں جاگے وہیں انگڑائیاں لو ، یہاں پھیلاتے ہو سستی کہاں کی

دہلی کا شستہ اردو سبھا نے ۱۹۳۸ء میں ان کے کلام کا ایک انتخاب دیوانِ مشتاق کے نام سے شائع کرایا ہے۔

(ادبی خطوط ص۲۸۳، ۲۸۳، سخن شعرا ص۴۳۷

دیباچہ دیوان مشتاق)

خان بہادر خاں مصروف

خان بہادر خاں مصروف ذوالفقار خاں کے بیٹے اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے۔ ان کا سال پیدائش ۱۲۰۵ھ ہے۔ وہ مدتوں صدر الصدور کے عہدے پر کام کرتے رہے۔ مدتِ ملازمت پوری ہوگئی تو وظیفہ لے لیا۔

۱۸۵۷ء میں میرٹھ کی سپاہ نے بغاوت کردی اور تمام ملک میں جہادِ آزادی کا پرچم کھل گیا۔ اس موقع پر مجاہدوں نے خان بہادر خاں کی حکمرانی کا اعلان کردیا کیونکہ ان کی تمام زندگی سرکاری ملازمت میں گذری تھی اور نظم ونسق کا وسیع تجربہ رکھنے کے علاوہ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے روہیل کھنڈ پر برسوں حکومت کی تھی۔ غالب نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خان بہادر خاں کو گمراہ اور شہرت طلب قرار دیا ہے۔ غالب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"خان بہادر خاں نے جو گمراہ اور شہرت طلب تھا اور جو بریلی میں کچھ لشکر جمع کر کے سردار بن بیٹھا تھا، ایک سو اشرفیاں نقرئی ساز و سامان سے آراستہ ہاتھی اور گھوڑا بارگاہِ شاہی (دہلی) میں بھیجا۔"

خان بہادر خاں نے انتہائی دلیری اور مردانگی سے ایک سال تک روہیل کھنڈ کے علاقے پر حکومت کی اور انگریزوں کو پے در پے شکست دیتے رہے اور اکثر جگہ کالنس کیمبل کو رک جانے اور ہتھیار ڈال دینے پر بھی مجبور کیا۔ یہ ان کی بدنصیبی تھی کہ وہ نیپال میں ہونے والی ایک لڑائی کے درمیان اپنے گھوڑے سے گر پڑے اور انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ انگریزوں نے ان کو لکھنؤ لاکر چیف کمشنر کے سامنے پیش کیا۔ اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی، وہ انتہائی حریت آموز اور ولولہ پرور تھی، انھوں نے کہا:

"میں نے ازخود بغاوت پر کمر نہیں باندھی، جس ملک کا جو دعویدار تھا اس کا رئیس گردانا گیا۔ روہیل کھنڈ ہمارا موروثی ملک تھا۔ اس وجہ سے بخت خاں اور جملہ رعایا نے اتفاق رائے سے مجھے نشین ریاست کیا۔ میں نے نہ بلوا کرایا نہ کسی انگریز عورت یا بچے کو قتل کیا۔ بلوائیوں کی روک تھام میرے اختیار میں نہیں تھی، انھوں نے جو چاہا کیا۔ میری اور آپکی فوج کے معرکے سر میدان ہوتے۔ طرفین کا کشت و خون ہوا۔ اس میں میں کیسا قصوروار؟"

انگریز چاہتے تو خاں بہادر خاں کو لکھنؤ میں بھی پھانسی کی سزا دے سکتے تھے لیکن انھوں نے ان کو بریلی لے جا کر وہاں کوتوالی کی عمارت کے سامنے پھانسی پر لٹکایا اور ان کی نعش بھی ان کے اہلِ خاندان کے حوالے کرنے کی بجائے۔ ڈسٹرکٹ جیل کے احاطہ میں غسل و کفن کے بغیر ہی دفن کر دی۔

امداد صابری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خاں بہادر خاں شاعر بھی تھے اور ان کا تخلص مصروف تھا۔ انھوں نے لکھا ہے:

ان کے دیوان کی دہلی کی مشہور لائبریریوں، 'نذیریہ لائبریری'، ہارڈنگ

لائبریری، کلکتہ کی نیشنل لائبریری، ایشیاٹک سوسائٹی پٹنہ کی خدا بخش لائبریری اور رام پور کی رضا لائبریری میں تلاش و جستجو کی۔ بریلی میں بھی اہل علم اور ادبی حلقوں سے معلوم کیا، لیکن ان کے دیدار نصیب نہیں ہوتے اس کے باوجود امداد صابری حافظ عبدالعزیز عزیز کے دیوان صفحہ ۱۷۹ سے ان کی ایک غزل ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، بتایا ہے کہ عزیز نے خاں بہادر خاں کی اس غزل کی تضمین کی تھی۔ غزل یہ ہے :

تا حشر اب خیال نہ میرا کرے گا دل
تو اس کو مل گیا تو مجھے کیا کریگا دل
جان و جگر تو نام کو باقی نہیں رہے
کیونکر اب اسکی زلف سے سودا کریگا دل
جان و جگر کے واسطے دیکھیں گے دیکھو
کن کن خرابیوں کو نہ برپا کریگا دل
لے جائیں گے اڑا کے خریدار مثل بو
جب تک برنگ غنچہ گرہ وا کریگا دل
شانے کی طرح اور بھی ہووے کا چاک چاک
جوں جوں کہ اس کی زلف سنوارا کریگا دل
مصروف دیکھ بیہودہ دل نہ کیجیو
میری طرح سے تجھ کو بھی رسوا کریگا دل

(مجاہد شعراء، صفحہ ۲۹۱، صفحہ ۳۹۲)

ترجمہ منظوم مشہور اردو کے سلی دہلی صفحہ ۱۹۳

حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۹۳، صفحہ ۳۹۴

۱۸۵۷ء کے مجاہد صفحہ ۲۶۹)

منظفر مرزا سیف الدین حید خاں

سیف الدین حیدر خاں نام اور عرف منظفر مرزا تھا۔ وہ نواب حسام الدین حیدر ل بہادر نامی کے بیٹے اور ناظر حسین مرزا کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی شادی شبلی سواروں کے افسر شمس الدولہ بخشی الممالک بخشی محمود خاں کی صاحبزادی سے ہوئی تھی

جن کا نام عالیہ بیگم تھا۔

سیف الدین حیدر خاں نے کسی بھی زمانے میں کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ شادی کے بعد مزید بے فکر ہو گئے۔ خاندان میں جائیداد تھی، اسی کی آمدنی سے امیرانہ طریقہ پر گذر اوقات کرتے تھے۔ جب ان کے والد نواب حسام الدین حیدر بہادر خاں نامی کا انتقال ہوا تو بہادر شاہ ظفر نے ان کو مراحم خسروانہ کے طور پر خلعت شش پارچہ اور نیمہ آستین طلائی عنایت کی۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی ناکام ہوئی اور انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا۔ ناظر حسین مرزا نے بہادر شاہ ظفر کے ہمراہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ صفدر جنگ کے مقبرہ میں پناہ لی۔ پھر بعض دوستوں کے مشورہ پر ان ہی کے ساتھ چپ چاپ شہر سے نکل کر برست چلے گئے۔ سیف الدین حیدر خاں کو اس کا علم نہیں تھا، ان کو بے حد تشویش ہوئی۔ انھوں نے ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ جب ان کا ملنا ناممکن نظر آیا تو کسی نہ کسی طرح الور پہنچنے میں کامیاب ہو گئے لیکن انگریزوں کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے الور پہنچ کر سیف الدین حیدر خاں کو گرفتار کر لیا۔ وہ انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں گوڑگاؤں لائے گئے۔ جہاں بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہونے کے شبہ میں کسی مقدمے یا تفتیش کے بغیر ان کو گولی ماری گئی۔ اس سانحہ کا علم غالب کو ان کے بھانجے یوسف مرزا کے ایک خط سے ہوا۔ جس پر جون ۱۸۵۹ء میں غالب نے یوسف مرزا کو تعزیت کے طور پر لکھا:

"بزرگوں کا مرنا بنی آدم کی میراث ہے، کیا تم چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھوتے؟ ہاں منظفر الدولہ کا غم منجملہ واقعات کربلا سے ملحق ہے۔"

(احسن الاخبار ۱۳ر نومبر ۱۸۴۶ء

خطوط غالب دوم ص ۲۹۸، ص ۴۴)

مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ

مرزا الٰہی بخش خاں معروف، مرزا عارف جان کے صاحبزادے، نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو کے بھائی اور غالب کے خسر تھے۔ انہوں نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا، دہلی علماء اور صوفیا کا مرجع و مرکز بنی ہوئی تھی۔ مولانا فخرالدین دہلوی کے فیوض باطنی اور کمالات کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا تھا۔ معروف کے دوستوں اور ملنے والوں میں بڑی تعداد انہی لوگوں کی تھی جو اس متصوفانہ ماحول سے متاثر تھے۔ اس ماحول نے معروف کو بھی متاثر کیا اور وہ درویشوں اور صوفیوں کی ”بزم حال و قال“ کو ذریعہ نجات خیال کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد ان کا امارت اور ریاست سے جی اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے اس سے اپنے بھائی نواب احمد بخش خاں کے حق میں دستکش ہو کر مولانا سید ضیاء الدین کے ہاتھوں پر چشتیہ سلسلہ میں بیعت کر لی۔ جو مولانا فخرالدین دہلوی کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ مولانا سید ضیاء الدین نے ان کی ظاہری اور باطنی تربیت ہی نہیں کی بلکہ ان کو لوگوں کے مرید کرنے کا اختیار بھی دے دیا۔ لیکن انہوں نے اس اختیار سے کام نہیں لیا۔ ان کے مریدوں میں محمد حیات خاں اور شاہ نظام الدین کے علاوہ اور کسی کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

معروف ایک طرف صاحب حال و قال فقیر و صوفی اور دوسری طرف کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے حالات و شاعری کے بارے میں گلشن بے خار پہلا تذکرہ ہے۔ جس کے بیانات کی تائید بعد کے متعدد تذکروں سے ہوتی ہے۔ معروف کو شاہ نصیر دہلوی سے تلمذ تھا۔ قادر بخش صابر نے

ان کے بارے میں لکھا ہے۔

"فن شاعری سے مناسبت تام تھی۔ مدت مدید تک مشق سخن شاہ نصیر مرحوم سے کی تھی۔ لیکن طبیعت خداداد کی رہنمائی سے کشورِ سخن میں برخلاف استاد کے ایک رستہ اور صاف اور پاکیزہ ہاتھ لگ گیا۔"

اس کے برعکس محمد حسین آزاد نے معروف کو ذوق کا شاگرد بتاتے ہوئے ان کا سارا کلام اپنے استاد کی ذہنی کاوش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ یہ نہ صرف غلط بلکہ دروغ بیانی کی بدترین مثال بھی ہے جو کسی وقائع نگار یا تذکرہ نویس کو زیب نہیں دیتی۔ مرزا سعید الدین احمد خاں طالب نے اپنے والد کے حوالے سے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ۔

"ذوق معروف کی خدمت میں اہل ارادت کی طرح حاضر ہوتے تھے اور ان کی صحبت سے فیض یاب ہو کر دینی و دنیوی فائدہ اٹھاتے رہے، وہ زمانہ تو ذوق کی نوجوانی کا تھا، اس زمانے میں ذوق کو اتنی استعداد اور لیاقت ہی کہاں تھی جو معروف جیسے کہنہ مشق اور پختہ کلام کو اصلاح دیتے۔"

معروف نے ۱۲۴۲ھ میں انتقال کیا اور درگاہ نظام الدین اولیاء کے احاطہ میں دفن کئے گئے۔ قادر بخش صابر کے بیان کے مطابق معروف کو تمام اصناف سخن پر قدرت اور انواعِ کلام سے آگاہی تھی۔ کریم الدین نے ان کا دیوان دیکھا تھا۔ ان کے بقول معروف کے شعر اکثر اچھے ہیں۔ معروف کے کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

پاؤں ٹوٹے مرے پھرتے پھرتے ۔۔۔ پر نہ وہ عہد شکن ہاتھ آیا
دشتِ وحشت میں ہوئے خاک آخر ۔۔۔ ہم کو غربت میں وطن ہاتھ آیا

دیکھنا قسمت عشریانی تن
بعد یک عمر کفن ہاتھ آیا

الٰہی کس کی یہ دیکھی ہیں سرمہ سا آنکھیں
کہ دو جہاں تلک اپنی نظر میں خاک نہیں

بشر کو حق نے بنایا ہے چار عنصر سے
کہو نہ خاک کہ صرف اس بشر میں خاک نہیں

یہ اتنی خاک پتنگوں کی کیا ہوئی اے شمع
کہ دیکھو دامنِ بادِ سحر میں خاک نہیں

وضو کو گنگ کے پانی غبل نہ کر معروف
یہ مفلسی ہے تیمم کو گھر میں خاک نہیں

سیکڑوں دادخواہ ایک طرف
اور وہ غفلت پناہ ایک طرف

وصف تیرا نہیں تو سب دھر دیں
قصۂ مہر و ماہ ایک طرف

بات کا اپنی واں نباہ نہیں
دوستی کا نباہ ایک طرف

شب تھے سب اہلِ بزم چشمک زن
تھی جو اپنی نگاہ ایک طرف

کوندے ہے برق کس طرح پوچھیں تو مت بتا کریوں
منہ کو چھپا کے کھولے کھول کے منہ چھپا یا یوں

جو یہ کہے کہ جذب عشق کیونکر اثر دکھائے ہے
میرے گھر آ اور اپنے ساتھ اس کو بھی، پچھا کر یوں

گر کہیں کہ بعد مرگ دیجئے کسی کو کیونکر دکھ
غیر کے ساتھ ایک بار قبر پہ میری آ کر یوں

گرمی خو کا تیری ذکر میں نے کیا جو شمع سے
سنتے ہی اتنی بات پہ شعلہ بھی کانپ اٹھا کر یوں

دیوان معروف (دیباچہ و تقریظ) آب حیات صفحہ ۳۰۴
گلستان سخن صفحہ ۲۰۳ طبقات شعرائے ہند صفحہ ۴۱۹

مرزا مغل علی خاں

مرزا مغل علی خاں، دہلی میں خواجہ قاسم کی حویلی میں رہتے تھے۔ غالب سے انکی دوستی تھی۔ منشی نبی بخش حقیر کبھی کبھی علیگڑھ سے دہلی آتے تھے۔ اس دوران ان سے بھی مرزا مغل علی خاں کا یارانہ ہو گیا تھا۔ غالب نے منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک خط میں مرزا مغل علی خاں کی جانب سے سلام لکھا ہے، جس سے اس قیاس کی تائید ہوتی ہے

مرزا مغل علی خاں کے حالات نہیں ملتے ہیں۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے مرض استقسا سے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ غالب انوار الدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مغل علی خاں غدر سے کچھ دن پہلے مستسقی ہو کر مر گئے"

غالب ہی کے خط سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر لینے کے بعد خواجہ قاسم کی حویلی کو میاں نظام الدین کی ملکیت قرار دیکر ضبط کر لیا تھا

(عود ہندی صفحہ ۱۹۲ صفحہ ۱۲۳، نادرات غالب صفحہ ۱۵)

احسان اللہ ممتاز

مولوی احسان اللہ ممتاز، شیخ عظمت اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کا مولد اناؤ تھا لیکن رہائش لکھنؤ میں تھی۔ تذکرہ نویسوں نے ان کے فضائل صوری و معنوی کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کو صاحبانِ کمال سے بتایا ہے۔ روزِ روشن کے مولف کے بیان کے مطابق لکھنؤ اور اس کے مضافاتی شہروں کے رہنے والے بیشتر موزوں طبع ان سے استفادہ کرتے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں نے اپنے تذکرہ میں ان کے کئی شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔

غالب کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب عالم مارہروی کو احسان اللہ ممتاز سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ان کو فارسی شاعری میں مستند ترین خیال کرتے تھے۔ غالب نے بھی ایک خط میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں اچھی دست گاہ تھی، اس کے باوجود وہ احسان اللہ ممتاز کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے صاحب عالم مارہروی کے نام ایک خط میں احسان اللہ ممتاز کا ذکر کیا اور ان کی شاعری کو ناقص قرار دیا جس پر صاحب عالم ان سے آزردہ ہو گئے۔ ان کے آزردہ ہونے پر غالب نے اپنی طرف سے ان الفاظ میں صفائی کی اور داد خواہ ہوئے۔

> رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و انوری وغیرہ ہم تک ایک گروہ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔ پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے مُوجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں۔ فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا بلاغ ہوا۔ خیال ہائے نازک و معانی بلند۔ اس شیوہ کی تکمیل کی، ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے بھی۔ سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبان طبع نے سلاست

کا چربہ دیا۔ صائب و حکیم اور قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں، رودکی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی طرز نے بسبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا، فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے چلے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں خاقانی اس کے اقران، ظہوری اس کے امثال، صائب اس کے نظائر، خالصاً اور دو ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز ہی اور ہے۔ بس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے۔ مگر فارسی نہیں ہے ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکہ بند ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد، انصاف، انصاف!"

مولوی احسان اللہ ممتاز نے بڑی طویل عمر پائی تھی۔ مظفر علی صبا کے بیان کے مطابق انہوں نے ایک سو تین سال کی عمر میں انتقال کیا۔ نگارستان سخن کے زمانۂ تصنیف سے ان کا سال وفات ۱۲۷۴ھ متعین ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف میں مثنوی بحر مواج کا کئی تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ ان کے چند شعر ذیل میں درج ہیں۔

بوسہ بہ بوسہ زنم فرصت منعی نہ دہم
دہن تنگ ترا قافیہ تنگ است امشب

خداوندا سر د برگ فصاحت دے زبانم را
برنگ رنگِ گل رنگیں کن اوراقِ بیانم را

بیا ممتاز از نائے قلم دہ نغمۂ بیروں
کہ در گوشِ رضا گیرند یاراں داستانم را

(عود ہندی ص۱۱۳ ، ص۱۱۸ ، ص۱۱۹ ، روز روشن ص۶۹۵ ، ص۱۹۹
نگارستان سخن ص۱۰۱ ، ص۱۰۲)

منشی ممتاز علی خاں

چودھری عبدالغفور سرور نے عود ہندی کے دیباچہ میں منشی ممتاز علی خاں کے اخلاق و اوصاف کی بڑی تعریف کی ہے، وہ میرٹھ کے مشہور رئیسوں میں سے تھے۔ جب وہ کسی کام سے مارہرہ پہنچے اور چودھری عبدالغفور سرور سے ان کی ملاقات ہوئی تو غالب کے اُردو خطوط کا ذکر چھڑ گیا۔ منشی صاحب نے غالب کے کلام کو نسیم جاں فزا اور شمیم دل کشا قرار دیتے ہوئے چودھری عبدالغفور سرور سے خواہش کی کہ وہ غالب کے خطوط جمع کردیں تو میں انطباع کا بیڑا اٹھاتا ہوں۔ اس طرح غالب کے خطوط کا مجموعہ عود ہندی منشی ممتاز علی خاں ہی کے اہتمام و نگرانی میں ۱۸۶۸ء میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ جس کے دیباچہ میں منشی صاحب لکھتے ہیں:-

"مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو ان کی (غالب) بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں مگر کلام اُردو سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پایا حالانکہ نثر اُردو انکی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اسے بھی ترتیب دیجے۔ مرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو انہوں نے جتنے خطوط مرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے، سب کو ایک جا کرکے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کر وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصہ تک سرگرم تلاش رہا۔ جا بجا سے اور تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں۔ بڑی محنت اٹھائی، تب تمنا بر آئی اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔ خواجہ غلام غوث صاحب بے خبر تخلص میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب کے مخلص باختصاص ہیں۔ اسی ش میں میرے معین و مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہم پہنچا۔"

نشی ممتاز علی خاں کو ادب و شعر سے کوئی علاقہ نہیں تھا، البتہ وہ اچھے شاعروں، اور نثر نگاروں کو ضرور پسند کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کو سب سے زیادہ غالب نے متاثر کیا تھا۔

علاوہ ازیں غالب کے متعدد دوستوں اور شاگردوں سے ان کی دوستی تھی ان کا اصل کام ٹھیکہ داری تھا۔ وہ سرکاری عمارتوں اور مکانوں کی تعمیر کے ٹھیکے حاصل کرتے اور اکثر میرٹھ سے باہر رہتے تھے۔ ۱۸۸۶ء کے اوائل میں ان کو حکومت کی جانب سے اٹاوہ میں پُلوں کی تعمیر کا ٹھیکہ دیا گیا، جس پر وہ وہیں مقیم ہو گئے۔ اس زمانے میں سرسید احمد خاں اور اُن کی تحریک کی مخالفت زوروں پر تھی۔ مختلف شہروں سے ان کی مخالفت اور رد میں رسالے اور جریدے نکلنا شروع ہو گئے تھے۔ منشی ممتاز علی خاں کو سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک سے مطلق دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسے عام مسلمانوں کے لئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھنے کے لئے ۱۸۸۶ء میں اٹاوہ سے "نجم الاخبار" کے نام سے ایک ہفتہ وار جریدہ شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے چند مہینہ بعد سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک کے سب سے بڑے مخالف مولوی بشیر الدین کو میرٹھ سے بُلا کر اس کی ادارت تفویض کی۔ مولوی بشیر الدین نے ۱۸۹۰ء تک اسے کامیابی کے ساتھ چلایا۔ بعد میں کسی بنا پر اس سے الگ ہو کر "البشیر" کے نام سے نیا جریدہ نکالنے لگے۔

دریں اثناء منشی ممتاز علی خاں کو ان کی خدمات کے پیش نظر اٹاوہ کا آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ اس دوران ان کی مصروفیات اتنی بڑھ گئیں کہ وہ اپنے ہفتہ وار جریدے کے لئے وقت نہیں دے سکے اور اسے بند کرنا پڑا۔ اس کے چند سال بعد منشی ممتاز علی خاں میرٹھ واپس آگئے اور یہیں ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔

(تاریخ صحافت اُردو سوم ص۳۲۵ ، عودِ ہندی ص۸)

حکیم منجھلے صاحب

خاندان بقائی کو دہلی کے اطبا میں بڑی شہرت ہے۔ حکیم حسام الدین اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو عرف عام میں حکیم منجھلے صاحب پکارا جاتا تھا۔ علاؤ الدین احمد خاں علائی ۱۸۶۲ء میں بیمار ہوئے تو غالب نے ان کو لوہارو سے دہلی آنے اور حکیم منجھلے صاحب سے علاج کرانے کا مشورہ دیا تھا۔

(خطوط غالب ص۴۰)

حکیم مومن خاں مومن

حکیم مومن خاں مومن، حکیم غلام نبی خاں کے صاحبزادے اور حکیم محمد نامدار خاں کے پوتے تھے جن کا کشمیر کے ایک ایسے خاندان سے تعلق تھا، جس کے تمام افراد کو فن طب میں کامل دست گاہ تھی۔

حکیم مومن خاں مومن کا سالِ ولادت ۱۸۰۰ء ہے۔ وہ دہلی کے محلہ کوچہ چیلاں میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام حبیب اللہ رکھا لیکن شاہ عبدالعزیز دہلوی کے کہنے پر اسے مومن خاں مومن سے بدلنے پر راضی ہو گئے۔ حکیم مومن خاں مومن نے ہوش سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے عبدالقادر دہلوی سے عربی کا درس لیا، پھر فارسی کی تحصیل کے لئے عبداللہ خاں علوی سے رجوع ہوئے۔ اسی اثناء میں اپنے والد اور چچا حکیم غلام حسن خاں سے طب میں استفادہ کر کے نسخہ نویسی کی مشق بہم پہنچائی، ساتھ ہی نجوم و رمل اور تعویذ نویسی میں کمال حاصل کیا۔

حکیم مومن خاں مومن کو شاعری کا شوق کب ہوا؟ یہ پورے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی ایک مثنوی "شکایت ستم" سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس وقت انھوں نے

شاعری شروع کی تھی ان کا سن تیرہ چودہ سال سے زائد نہیں تھا۔ انھوں نے ابتدار میں شاہ نصیر دہلوی سے اپنے کلام پر اصلاح لی، لیکن ان کا طرز سخن پسند خاطر نہ ہونے کی بنار پر سلسلہ تلمذ منقطع کر لیا اور کسی کے مشورہ کے بغیر فکر کرنے لگے۔ غالباً اسی زمانے میں ان میں اور غالب میں ارتباط پیدا ہوا، جس نے ایک مستحکم اور اٹوٹ بنیاد پر دوستی کی صورت اختیار کر لی۔

حکیم مومن خاں مومن شروع ہی سے خوش لباس، رنگین طبع اور عاشق مزاج تھے، لیکن ان کی زندگی مذہبی سرمستیوں اور کیفیتوں سے خالی نہیں تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ انھوں نے جوانی کے زمانے میں سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور جس وقت وہ سکھوں کے خلاف پنجاب میں جہاد کر رہے تھے ایک مثنوی کے ذریعہ تحریک جہاد کو عام کیا تھا۔

بعض تذکرہ نویسوں نے بتایا ہے کہ حکیم مومن خاں مومن کے بزرگوں کو نارنول کے علاقہ میں جاگیر ملی تھی۔ اسی کی آمدنی سے وہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے، یہ غلط ہے۔ مولوی عبدالقادر رام پوری نے ان کو جوانی کے زمانے میں دیکھا تھا، انھوں نے بتایا ہے کہ:

"حکیم مومن خاں مومن کے بزرگوں کے دیہات خالصہ شریف میں شامل ہو گئے۔ اب دہلی کے پرانے خاندانوں کی طرح تنگی سے بسر ہوتی ہے"

اس تنگی اور عسرت کے باوجود انھوں نے اپنی شاعری کو کاسہ دریوزہ گری نہیں ہونے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو ان کے کلیات میں بادشاہوں، نوابوں اور رئیسوں کی مدح میں قصیدے نہیں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے وزیرالدولہ والیٔ ٹونک اور راجہ اجیت سنگھ والیٔ پٹیالہ کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے، اس کا مقصود صلہ کا حصول نہیں تھا۔

حکیم مومن خاں مومن کی موت ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ تھی۔ وہ ایک دن اپنے

مکان کی چھت پر کھڑے فکرِ سخن میں مشغول تھے کہ پاؤں پھسل گیا۔ بلندی سے گرنے کی وجہ سے ہاتھ اور بازوؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آیا تو اپنا زائچہ لگا کر بتایا کہ مزید پانچ ماہ زندہ رہوں گا۔ اسی کے ساتھ اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو اپنے مرنے کی تاریخ لکھوائی، جس کا مادہ "بشکستِ دست و بازو" ہے۔

حکیم مومن خاں مومن اپنی پیش گوئی کے مطابق پانچ ماہ تک زندہ رہے اور ۱۱ر مئی ۱۸۵۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی نماز جنازہ جامع مسجد دہلی ہوئی۔ بعدازاں ان کو شاہ عبدالعزیز دہلوی کے مقبرہ کے احاطہ میں مشرقی جانب دفن کیا گیا۔

ان کا اور غالب کا چالیس سال کا ساتھ تھا۔ یہ چھوٹ گیا تو غالب نے انتہائی پُردرد الفاظ میں منشی نبی بخش حقیر کو ۲۱ر مئی ۱۸۵۱ء کو اس کی اطلاع دی:

"سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے۔ آج ان کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی ہمارے بچے مرے جاتے ہیں، ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیالیس[۴۲] تینتالیس[۴۳] برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور مرحوم کی عمر تھی، مجھ میں اس میں ربط پیدا ہوا۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہ آیا۔ حضرت چالیس برس کا دشمن بھی پیدا نہیں ہوتا، دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے۔ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔"

اس کے علاوہ غالب نے ان کے انتقال پر ایک رباعی بھی کہی تھی۔

شرطست کہ روتے دل خراشم ہمہ عمر

خونابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر

کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

مومن کی تصانیف میں کلیاتِ اردو، دیوان فارسی اور انشائے مومن قابل ذکر ہیں جو پہلی مرتبہ ۱۸۴۶ء، ۱۹۰۵ء اور ۱۲۷۱ھ میں طبع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف فنِ عروض کا بھی نام ملتا ہے۔

ان کے چند ایسے شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں جن کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہے

اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا
اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا ذلیل

جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا

اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
میری طرف بھی دیدۂ غماز دیکھنا
غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا

پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم

جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دُعا کو اثر کے ساتھ

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

اشک دشمن بہانہ تھا پیچ ہے
میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

(گل رعنا صـ ۳۰۳ ، علم و عمل صـ ۲۶۲
واقعات دار الحکومت دوم صـ ۴۲۳
نادرات غالب صـ ۳۴ کلیات نظم غالب فارسی صـ ۲۹۹)

حاتم علی بیگ مہر

حاتم علی بیگ مہر کا تاریخی نام خورشید علی تھا وہ ۳ جمادی الاول ۱۲۳۰ھ کو بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ ان کے دادا مرزا مراد علی خاں نے اصفہان سے ہجرت کی اور شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ پہنچے اور رکن الدولہ کا خطاب پایا۔ ان کے صاحبزادہ مرزا فیض علی بیگ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے علی گڑھ کول میں تحصیل دار تھے۔ ۱۲۳۴ھ میں ان کا انتقال ہو گیا حاتم علی بیگ مہر ان ہی کے بیٹے تھے۔ اس وقت ان کی عمر چار سال تھی تعلیم و تربیت کا تمام بوجھ ان کی والدہ کے سر آپڑا۔ انھوں نے نہ صرف ان کو مناسب تعلیم دلائی بلکہ اٹھارہ سال کی عمر میں ان کا عقد بھی کروا دیا۔

مہر کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ اس وقت لکھنؤ میں ناسخ کی دھوم تھی۔ مہر بھی ان کے تلامذہ میں شامل ہوتے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں ان کو اپنے استاد سے بہتر بتایا ہے۔ غالب کے قول کے مطابق :

"ناسخ یک فنے تھے۔ صرف غزل کہتے تھے، قصیدہ گوئی اور مثنوی سے ان کو کچھ علاقہ نہ تھا۔"

مہر کی محبوبہ کا نام چنا جان تھا۔ وہ ۹ ر ذیقعدہ ۱۲۷۶ھ کو ورم جگر کے مرض میں مبتلا ہو کر مرگئی تو مہر کو بڑا رنج ہوا۔ اس کے انتقال پر انھوں نے گیارہ قطعات تاریخ کہے اور اس کو مومنہ کے نام سے یاد کیا۔ مہر کے ایک دوست عبدالوہاب اور بڑے بھائی مرزا عنایت بیگ ماہ نے بھی چند تاریخی قطعات کہے۔ غالب اور مہر کے درمیان صرف نادیدہ دوستی تھی لیکن وہ آپس میں حد درجہ بے تکلف تھے۔ جب غالب کو مہر نے "غم فزا ماتم کے عنوان سے چنا جان کے مرنے کی اطلاع دی تو غالب نے لکھا :

"عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرح نصیب ہو، لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں، مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں نے بھی ایک ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھاتے ہوتے ہیں"

اس تعزیت پر بھی مہر کو سکون نہیں آیا اور وہ چنا جان کی یاد میں خود کو نڈھال اور مضمحل کرتے رہے تو غالب نے ایک اور خط میں لکھا :

"کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی"

مہر نے ۱۸۴۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور چنار گڑھ ضلع مرزاپور میں منصفی کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ ایک عرصہ تک ہائی کورٹ میں بھی وکالت کی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی جس کے صلہ میں بائیس پارچہ کا خلعت، گھوڑا اور اسلحہ انعام ہوا۔ فتح پور کے قریب دو موضع بھی بطور جاگیر ملے۔

راجہ جیوان سنگھ والی بنارس آگرہ ہی میں مقیم تھے۔ انھوں نے شاگرد ہو کر سو پچاس روپے ماہانہ مقرر کر دیا۔ مہر کے صاحبزادے آغا سخاوت علی بیگ ایٹہ میں تحصیلدار تھے۔ ۱۲۹۶ھ میں مہر ان سے ملنے کے لئے آگرہ سے ایٹہ گئے کہ وہاں ان کو ہچکی کا مرض لاحق ہو گیا اور وہ وہیں ۲۸ رشعبان کو انتقال کر گئے۔ مہر کی تصانیف میں الماس درخشاں، پارۂ عروض اردو، ایاغ فرنگستاں، داغ نگار، داغ دل مہر، شبیہہ عشرت، فریب انتقام، شعاع مہر، زہر و شبیات، ہمدم آخرت، بیان بخشائش، عید قیصریہ، پنجۂ مہر اور توقیر شرف عام طور پر مشہور ہیں ——— !

چلے بھی آؤ قیامت بھی ہو چکی صاحب   بڑا عذاب ہے رہتی ہے انتظار میں روح
نذرِ دل مانگتی ہیں آپ کی سرشار آنکھیں   عین مستی میں رہا کرتی ہیں ہشیار آنکھیں
کرتا غضب اب تک تو ہمارا دلِ بیتاب   رو کے ہوتے، سہمے ہوئے دھیلے ہوتے ہیں
کیا بات تری اے لب جاں بخش ہے کیا بات   عیسیٰ بھی ترے وقت میں دم کھائے ہوئے ہیں

از بس کہ سوز ہجر سے خوگر ہوتے ہیں ہم   منصف چنار گڑھ کے مقرر ہوئے ہیں ہم

ہو گی تمام رات بسر پیچ و تاب میں   دل پھنس گیا ہے زلفِ شکن در شکن میں آج

(خطوط غالب ص ۲۱۸ ص ۲۳۹ ،

لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۳۶۴ ص ۳۶۵)

آغا علی خاں مہر

امین الدولہ آغا علی خاں کا تخلص مہر تھا۔ وہ معتمد الدولہ آغا میر کے بڑے صاحبزادے تھے۔ ان کی تمام تر تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ جب معتمد الدولہ آغا میر نصیر الدین حیدر کے عہدِ حکومت میں وزارت سے معزول ہو کر کان پور چلے آئے تو امین الدولہ آغا علی خاں مہر نے بھی کان پور میں اقامت اختیار کر لی۔ جب تک آغا علی خاں مہر کا قیام لکھنؤ میں رہا، وہ اپنا کلام امام بخش ناسخ کو دکھاتے رہے کان پور آنے کے بعد انھوں نے میر اوسط رشک سے اصلاح لینا شروع کی۔ ان کے دیوان کا پہلا قصیدہ واجد علی شاہ اختر کی مدح میں ہے جس میں انھوں نے کان پور سے بیزارگی کا اظہار کیا ہے اور واجد علی شاہ سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کو لکھنؤ واپس آکر آباد ہونے کی اجازت دیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ اختر نے اس قصیدہ کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور انہیں لکھنؤ واپس آنے کی اجازت نہیں دی۔

پنج آہنگ میں ان کے نام غالب کا ایک خط موجود ہے۔ اس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے منتخب دیوان ریختہ کے کچھ اوراق ان کی خدمت میں بھیجے تھے اور کہا تھا کہ وہ جلد ہی دیوانِ فارسی بھی ملاحظہ عالی میں گذاریں گے۔ یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ غالب نے اپنا فارسی دیوان اُن کے پاس بھیجا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ غالب نے اس خط کے ذریعہ ان سے غائبانہ سہی، تعارف حاصل کر لیا تھا۔

عبدالغفور نساخ کے بیان کے مطابق امین الدولہ آغا علی خاں مہر نے کربلائے معلی کی زیارت کی تھی۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد کان پور میں انتقال کیا۔ بعد ازاں ان کی لاش نجف اشرف روانہ کی گئی۔ ان کے چند شعر یہ ہیں۔

ہجر میں ہوں جفا طلب، رنج طلب، بلا طلب
نوحہ طلب، فغاں طلب، داغ طلب، بکا طلب
جتنے ہیں تحت و فوق میں، پھرتے ہیں تیرے ذوق میں
رہتے ہیں تیرے شوق میں، درد طلب، دوا طلب

دیکھ لطفِ عتاب یار لے دل — دل میں غصہ ہے پیار آنکھوں میں
ہم وہ باہم ہیں محوِ صحبتِ عشق — ایک جلوہ ہے چار آنکھوں میں

بت کہا تجھ کو یا خدا سمجھے — سمجھے جو کچھ تجھے بجا سمجھے

بال چوٹی کے کریں گے بدنام — یہ ترے پیچھے پڑے رہتے ہیں

دکھتے ہیں خارِ دشت نوکِ زباں — سے شرح میری برہنہ پائی کی

(دیوان مہر، سخن شعرا ۴۸۲، کلیات نثر غالب ۱۵۸)

مہیش داس

مہیش داس لالہ چھوڑا مل کے بیٹے تھے۔ جن کا دہلی کے سربرآوردہ ساہو کاروں میں شمار ہوتا تھا۔ مہیش داس کی فیاضی اور سخاوت عوام میں مشہور تھی۔ غلام حسین خاں نے ان کو شہر کے مخیر اور خوش معاملہ لوگوں میں سے بتایا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق یہ مخلوق کی خدمت خواہ ہندو ہو یا مسلمان بہت کرتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں باغیوں نے ان کا لاکھوں روپے کا سامان لوٹ لیا تھا جو کلکتہ کے راستہ دہلی آرہا تھا بعد ازاں ان کے مکانوں پر بھی چڑھائی کر دی تھی اور ان کو بھی لوٹ

ناچاہتے تھے لیکن مہیش داس نے اپنی حکمتِ عملی سے اس کا موقع نہیں دیا۔ اسی
انے میں مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان نے بھی جبریہ طور پر ان سے روپلے وصول کرنا
ہے، لیکن ان کو کامیابی نہیں ہو سکی۔ دریں اثنا مہیش داس نے انگریزوں سے
بطہ قایم کر لیا اور روزانہ دہلی اور قلعہ معلیٰ کی خبریں ان تک پہنچانے لگے۔ انگریزوں
ہ دہلی پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد ان کی عزت و احترام کو برقرار رکھا اور ان کی بڑی
مداری کی۔ غالب نے اسی دور کے واقعات بیان کرتے ہوئے دستنبو میں لکھا ہے کہ

"آجکل جب کہ انگریزی شراب بہت مہنگی ہے اور میں بالکل مفلس
ہوں اگر خدا دوست، خدا شناس، فیاض، دریا دل مہیش داس دیسی شراب
قند جو رنگ میں ولایتی شراب کے برابر اور بو میں اس سے بڑھ کر ہے
بھیج کر آتشِ دل کو سرد نہ کرتے میں زندہ نہیں رہتا اور اسی عالم جگر تشنگی
میں مرجاتا۔"

غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"مہیش داس نے شہر میں مسلمانوں کی آبادکاری کے متعلق کوئی کسر
اٹھا نہیں رکھی چوں کہ خدا کی مرضی نہیں تھی، کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ سب
جانتے ہیں کہ شہر میں ہندوؤں کا آزادی کے ساتھ رہنا مہربان حاکموں کی
محبت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس نیکی پسند بھی خواہ شخص مہیش داس
کا اس انتظام میں دخل رہا ہے۔ مجھ سے بہت پرانی شناسائی نہیں
ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی کوئی
تحفہ بھیج کر مجھ کو ممنون کرتا ہے۔"

۱۸۵۹ء میں انگریزوں نے بلدیاتی ٹیکسوں کے نفاذ کا فیصلہ کرنے کے بعد اسے
دسمبر سے نافذ کر دیا تو مہیش داس بطور رامانی کام کرنے لگے۔ غالب نے حسین مرزا کے نام

ایک خط میں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"آجکل یہاں پنجاب کے احاطہ کے بہت حاکم فراہم ہیں، پلون ٹوئی (ٹاؤن ڈیوٹی) کے باب میں کونسل ہوں، پرسوں، نومبر کو جاری ہوگئی سالگ رام خزانچی، چھنامل، مہیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بطور امانی سپرد ہوا ہے۔ غلہ اور اُپلے کے سوا کوئی جنس ایسی نہیں کہ جس پر محصول نہو، آبادی کا حکم عام ہے، خلق کا اژدھام ہے۔ آگے حکم تھا کہ مالکان رہیں کرایہ دار نہ رہیں۔ پرسوں سے حکم ہوگیا ہے کہ کرایہ دار بھی رہیں، مگر کرایہ سرکار کو دیں۔"

غلام حسین خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہیش داس مجسٹریٹ کے عہدہ پر کام کرتے تھے۔

(غدر کا نتیجہ ص ۱۳۹-۵۰، خطوط غالب ص ۲۲۹، ۳۰۰

ترجمہ دستنبو مشمولہ اردوئے معلیٰ دہلی ص ۲۳۶)

میر احمد حسین میکش

میر احمد حسین میکش میر کرار حسین کے صاحبزادہ تھے، جن کا تعلق دہلی کے خاندان سادات سے تھا۔ امداد صابری نے ان کو شائستہ خاں کی اولاد سے اور مرزا عسکری نے سادات بارہہ کے خاندان سے بتایا ہے۔ انھوں نے کتب عربیہ اخوند فیض محمد سے پڑھی تھیں۔ تیس برس کی عمر میں صدر امین اول کی کچہری میں عہدۂ وکالت پر مامور ہوتے تھے۔ ان کے بھائی امداد علی آشوب میر نظام الدین ممنون سے اصلاح لینے لگے تو انھوں نے غالب کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

غالب کو میکش سے بڑی محبت تھی۔ وہ ایک مرتبہ بیمار ہوگئے تو غالب نے

ان کو لکھا : ـــــــ

"میاں عجب اتفاق ہے' نہ میں تمہارے دیکھنے کو آسکتا ہوں '
نہ تم میرے دیکھنے کو قدم رنجہ فرما سکتے ہو۔ قدم رنجہ کہاں سے کرو سراپا
رنجہ ہو لاحول ولا قوۃ۔ تعطیل کے دن کیا ناخوش گوار گذرے یوسف مرزا
سے 'میر سرفراز حسین سے تمہارا حال سن لیتا ہوں اور رنج کھاتا ہوں خدا
تمہارے حال پر رحم کرے اور تم کو شفا دے۔ خواہش یہ ہے کہ ناتوانی کا
عذر نہ کرو اور اپنا حال اپنے ہاتھ سے لکھ بھیجو "

۷ رفروری ۱۸۵۸ء کو غالب میکش کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" میکش چین میں ہے' باتیں بناتا پھرتا ہے 'سلطان جی میں تھا '
اب شہر میں آگیا ہے۔ دو تین بار میرے پاس بھی آیا' پانچ سات
دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو بہرام پور میر وزیر علی
کے پاس بھیج دیا ہے خود یہاں لوٹ کی کتابیں خریدتا پھرتا ہے"

میکش لوٹ کی کتابیں خرید ہی رہے تھے کہ کسی مخبر نے انگریزوں کو خبر کر دی' انھوں
نے بغاوت میں حصہ لینے کے الزام میں میکش کو گرفتار کر لیا ، بعدازاں ان کو
پھانسی دے دی گئی۔ اس کا انکشاف غالب کے ایک اور خط سے ہوتا ہے۔ انھوں
نے لکھا ہے :

" احمد حسین میکش کا حال تم کو معلوم ہے یا نہیں' مخنوق ہوا (پھانسی
پاگیا) گویا اس نام کا آدمی شہر میں تھا ہی نہیں "

ایک اور خط میں انھوں نے میکش کی شہادت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے
لکھتے ہیں :

" اس چرخ کج رفتار کا برا ہوا' ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و

مال، جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشۂ و توشہ تھا۔ چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہوکر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔ کل سے میکش مجھ کو بہت یاد آتا ہے۔"

میکش نے غدر کے ہنگامہ میں عملی طور پر حصہ لیا تھا اور انگریزوں کے معتوب ہوکر پھانسی پا چکے تھے، اس لئے تذکرہ نویسوں نے ان کے حالات لکھے نہ ان کا کلام پیش کیا۔ انتہائی تلاش کے بعد یہ چند شعر دستیاب ہو سکے ہیں:

اے آں کہ در شب ہائے غم اندر دلِ من بگذری
خوں است ایں جا موج زن دامن نگہ دار از تری

از ہر دو جانب سوئے تو آویختہ بر روئے تو
اے بستۂ گیسوئے تو ہم زہرہ و ہم مشتری

بر اوج شوقت نارسا پرواز عالی فطرتی
در ملک عشقت ناروا پروانۂ نیک اختری

گفتمش دمے باکر می رفتی خراماں سوئے باغ
گفت میکش بودہ باشد کاں گرفتار من است

گلستان سخن دوم ص ۲۰۱، روز روشن ص ۶۶۹
تلامذۂ غالب ص ۲۹۶، معاصر شعرا ص ۲۹۳

آغا محمد حسین شیرازی ناخدا

آغا محمد حسین ناخدا کا مولد شیراز تھا۔ جہاں انھوں نے مرزا حبیب قاآنی اور مرزا کوچک اصفہانی کی صحبت میں تحصیل علم کی اور سفیر دولت ایران کی حیثیت سے کلکتہ پہنچے اور سات سال تک انتہائی شان و شوکت کے ساتھ قیام کیا۔ بعد میں تجارت کی غرض سے چین، ہند

پنجاب اور سندھ کی سیاحت کی اور میر صاحبان تالپور کے شرف ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے نواب علی حسن خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا محمد حسین ناخدا نے ان کے تذکرہ کے لئے اپنے اشعار خود لکھ کر بھیجے تھے۔ اور بتایا تھا کہ انہوں نے مختلف اصناف میں پچاس ہزار شعر کہے ہیں، مخدوم ابراہیم خلیل ٹھٹوی کے بیان کے مطابق آغا محمد حسین ناخدا کا دیوان ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گیا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی

آغا محمد حسین ناخدا اور غالب میں براہِ راست تعلقات نہیں تھے۔ پنج آہنگ میں ان کے نام غالب کا صرف ایک خط ملتا ہے جس میں انہوں نے منشی سعادت علی مولف محرق قاطع برہان کو برا بھلا کہا ہے۔ اسی دوران انہوں نے ایک خط کے ذریعہ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو بھی محرق قاطع برہان لکھنے کی ترغیب دلائی اور لکھا۔

"ہاں صاحب آغا محمد حسین ناخدائے شیرازی کا خط مع اشعار آیا میں نے اس کا جواب بھجوایا۔ اب جو ڈھونڈا تو میرا مسودہ ہاتھ آیا مگر آغا کا نہ آیا، اس مسودہ کو صاف کر کے تمہارے پاس بھیجتا ہوں، آغا صاحب کا خط نکل آئے گا وہ بھی بھجوایا جائے گا۔"

غالب کے ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا محمد حسین ناخدا نے غالب کے خیالات کی تائید کی تھی اور مولف محرق قاطع برہان کے ان اعتراضات سے اتفاق نہیں کیا تھا جو اس نے غالب کی قاطع برہان پر کئے تھے۔ غالب اپنے خط کی نقل اور آغا محمد حسین ناخدا کا اصل مکتوب اس لئے بھجوانا چاہتے تھے کہ میر غلام حسنین قدر بلگرامی کو محرق قاطع برہان کا جواب لکھنے میں کسی قسم کا پس و پیش نہ رہے۔

آغا محمد حسین ناخدا کا نمونہ کلام یہ ہے۔

دشمناں را دوست کردن لازم است ‏ ‏ دوستیٔ دوستاں فرض است فرض

تو اے غزالِ غزلخواں بہ بزم انس در آئی ‏ ‏ غزال را نہ سزد بستۂ قفس باشد

مرغ آزت در پئے حرص املی — دانہ بیند می نہ بیند دام را
مگر مینائے ساقی گشت خالی — کہ از صہبائے غم سرشارم امشب
بکوئے عشق کس محرم نہ باشد — دراں رہ ہمرہی جز غم نہ باشد

(کلیات نثر غالب ص۱۵۱، خطوط غالب ص۵۹۳
صبح گلشن ص۳۸۸ ص۳۸۹، مجمع مقالات الشعراء ص۵۹۳)

ناطق مکرانی

گل محمد ناطق مکران کے رہنے والے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت ٹھٹھہ میں ہوئی جوان دنوں ارباب کمال کا مامن تھا۔ ان کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ ان کو علوم متداولہ پر ہی عبور حاصل نہیں تھا بلکہ وہ سینکڑوں شعراء کے اشعار سنانے پر بھی قادر تھے اس کے علاوہ علم مجلسی میں کوئی بھی ان کے مقابل نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

ان کے اس فضل و کمال کو دیکھتے ہوئے امیران سندھ نے ان کی بڑی قدر افزائی کی۔ والی حیدرآباد سندھ نے ان کے لئے ایک روپیہ روزینہ مقرر کر کے ان کا تخلص دلخوش تجویز کیا۔ وہ اس وقت تخلص کی بجائے اپنا نام استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ تخلص قبول کرلیا۔ اسی دوران انھوں نے لکھنؤ کی تعریف سنی اور حیدرآباد سے لکھنؤ روانہ ہوگئے اور وہاں خود کو ناطق تخلص سے روشناس کرایا۔ نواب صدیق حسن خاں نے ان کو موزونان زبان حال اور شاعران شیریں مقال سے بتایا ہے اور صراحت کی ہے کہ انھوں نے محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور دیگر امرائے لکھنؤ کے قصائد لکھے۔

"گل محمد خاں ناطق مکران" سے ان کا سال وفات برآمد ہوتا ہے انھوں نے ۱۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔ ان کے ایک شاگرد جواہر سنگھ جوہر نے ان کا

ایک مختصر سا دیوان جواہر معظم کے نام سے جمع کیا تھا جو شائع ہو گیا ہے۔

ناطق اور غالب میں مراسلت تھی۔ ناطق کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنا کلیات نظم فارسی ان کو مطالعہ کے لئے بھیجا تھا۔ جب یہ کلیات ناطق کی نظر سے گزرا اور ان کی نگاہ اس شعر پر

نوک شد و بخیہ زدن ساز کرد

باسد ورو عربدہ آغاز کرد

پر پڑی تو انھوں نے اعتراض کیا اور غالب کو لکھا کہ سور کے بخیے نہیں ہوتے سم ہوتے ہیں۔ غالب نے اس اعتراض کا جو جواب دیا وہ ان کے پنج آہنگ میں موجود ہے۔ غالب نے اس اعتراض کو قبول کر لیا اور جب کلیات کی مطبع نول کشور میں چھپنے کی نوبت آئی تو "بخیہ زدن ساز کرد" کو "و بہ نفس ساز کرد" سے بدل دیا۔

ناطق کا انتخاب کلام یہ ہے:

شب کہ در آئینۂ دل عکس او تمثال بود

نقد سودائے محبت راجبوں دلال بود

رفتم کہ باز سجدہ بر آں آستاں کنم

خود را شریک غالب ہفت آسماں کنم

ہم ناصبور کردہ مرا عشق ہم غیور

ہم ناصدت فرستم و ہم قصد جاں کنم

تا آمدہ بہ شہر وجودم تپ عمنت

گرمش بہ سیر کوچۂ ہر استخواں کنم

جاں بر لبم بہ فہم نیاید بیان من
کس جز چراغ صبح نہ فہمد زبان من

(شمع انجمن ص۴۹۶، ص۴۹۷ - تکمیلہ مقالات خرام ص۲۹۳
متفرقات غالب ص۳۱، ص۳۲، ص۱۵۱ تا ص۱۶۱،
کلیات نظم غالب اول ص۲۵۳)

میر حسام الدین حیدر نامیؔ

میر حسام الدین حیدر خاں نام، مبارز الدولہ ممتاز الملک خطاب اور نامی تخلص تھا - ان کے والد مرزا محمد غیاث امیر الامرا ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے صاحبزادے تھے - نجف خاں کی بہن شجاع الدولہ وزیر اودھ کے بھائی سے بیاہی گئی تھی - اسلئے تذکرہ نویسوں نے میر حسام الدین حیدر کو شجاع الدولہ کے اقربا میں بتایا ہے -

میر حسام الدین حیدر لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے - ان کے ابتدائی حالات نہیں ملتے ہیں - اس سلسلہ میں وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم کس طرح اور کس نہج پر ہوئی تھی - البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے میر حسن کے صاحبزادے میر مستحسن خلیق سے اپنے کلام پر اصلاح لی تھی اور کچھ دنوں فیض آباد میں بھی قیام کیا فیض آباد کے بعد وہ دہلی چلے آئے جہاں ان کو بہادر شاہ ظفر کی جانب سے حسام جنگ کا خطاب دیا گیا اور یہاں کے بھی قابل ذکر امیروں میں شمار کئے جانے لگے

میر حسام الدین حیدر نے دہلی کے ایک مشہور محلہ بلی ماراں میں عظیم الشان حویلی تعمیر کی تھی اور اسی میں رہتے تھے - اسی حویلی کے قیام کے دوران ان کی مرزا غالب کے خسر نواب الٰہی بخش معروف سے بھی گہری دوستی ہو گئی جس کی وجہ سے غالب بھی ان کو

اپنے عزیزوں میں شمار کرنے لگے۔

میر حسام الدین حیدر نے ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا۔ مولانا حالی کے بیان کے مطابق میر حسام الدین حیدر نے اپنے لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں غالب کی غزل میر کو سنائی تھی جسے سن کر انھوں نے کہا کہ اگر اس لڑکے کو کوئی استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو یہ لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ اس وقت غالب کی عمر بمشکل تیرہ سال کی تھی۔

فروری ۱۸۴۵ء میں غالب کے خلاف ایک دیوانی مقدمے میں پانچ ہزار کی ڈگری ہو گئی۔ یہ مقدمہ دو قرض خواہوں غالباً اندر جیت اور ہیرا لال کی جانب سے دائر کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں غالب نے گرفتاری سے بچنے کے لئے میر حسام الدین حیدر کی مدد چاہی اور ان کو لکھا:

"آپ پہلے اندر جیت اور ہیرا لال کو اپنے ہاں بلوا بھیجیے اور اس کے بعد مجھے بلوائیے اور ان سے بات کیجیے کہ وہ فی الحال اکیزا روپیہ لے کر مصالحت کر لیں"

میر حسام الدین حیدر کا کلام اکثر تذکروں میں ملتا ہے۔ قدرت اللہ قاسم نے ان کی شاعری کو لائقِ تحسین و آفرین قرار دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر حسام الدین حیدر نے اپنے اشعار بطور خاص ان کے تذکرے کے لئے بھجوائے تھے۔ عمدۃ المنتخبہ کے مولف اعظم الدولہ امیر محمد خاں سرور نے بھی ان کو "مودود وجیہ، عاقل و دوست آشنا، پُر اختلاط و پُر اخلاص" بتایا ہے اور ان کی "برجستہ گوئی" کی تعریف کی ہے۔ ان کے چند شعر یہ ہیں:

دم شماری میں مجھے چھوڑ کے جانا کیا تھا
جان جانے کو بھی عاشق کے نہ جانا کیا تھا

دور بے طور ہے اس کارگہ مینا کا
سنگ و شیشہ میں بہم ربط ہوا ڈرساقی

ملک فعال و پری وش فرشتہ خو کہتا
مجال تھی کہ سنگ یار کو میں تو کہتا

کس کے سینہ کی صباحت میں ہے اندازۂ صبح
لگ کے جھانکے ہے جو خورشید بدروازۂ صبح

وہ سیہ بخت تو ہم ہیں کہ کبھی دوراں نے
چہرۂ شب کو ہمارے نہ ملا غازۂ صبح

تابش خور سے نہ کس طرح وہ مرجھا جاوے
عارض یار ہے ہم رنگ گل تازۂ صبح

مے گلگوں کی خواہش تھی ہمیں اس دور میں لیکن
فلک نے بھر دیا مانند خور آتش سے جام اپنا

چھپا بیٹھا نہیں بادلوں سے وہ بے مہر مکھڑے کو
تہ ابر آگیا ہے ہم نشیں ماہ تمام اپنا

بہت رویا کئے مجلس میں اہلِ درد سُن سُن کر
پڑھا تھا کچھ حسام الدین حیدر نے کلام اپنا

(عمدۃ المنتخبہ ص۲۴۷، مجموعہ نغز ص۱۵۹ ، ص۲۶۰
کلیات نثر غالب ص۲۳۱)

نریندر سنگھ

پٹیالہ پنجاب کی سب سے بڑی سکھ ریاست تھی۔ اس کو ۱۷۶۲ء میں سردار آلا سنگھ نے

آباد کیا تھا، اس کے بعد ان کے جانشینوں نے اردگرد کے کچھ علاقے فتح کرکے اس کی حدود میں توسیع کی۔ آلا سنگھ کی چوتھی پشت میں مہاراجہ کرم سنگھ نے ۱۸۱۴ء کے لگ بھگ جنگ گورکھا میں انگریزوں کے ساتھ تعاون کیا جس کے صلہ میں اور کچھ علاقے انعام میں مل گئے۔ ۱۸۳۰ء میں انگریزوں نے ایک اور راجہ کا ضبط شدہ علاقہ بھی مہاراجہ کرم سنگھ کو دیدیا۔ ۱۸۴۷ء میں ایک سند کے ذریعے اس کی توثیق بھی کردی۔

غالب کے ممدوح نریندر سنگھ ان ہی مہاراجہ کرم سنگھ کے صاحبزادے تھے، جن کی اتالیقی پر خلیفہ محمد حسن کے والد منشی سعادت علی خاں کو مامور کیا گیا۔ حکیم محمود خاں، حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم غلام اللہ خاں کو نریندر سنگھ سے ملازمت کا تعلق تھا۔ انھوں نے کوشش کی کہ غالب اگر پٹیالہ چلے آئیں تو آرام سے رہیں گے۔ غالب پٹیالہ جانے اور وہاں رہنے پر رضامند ہو گئے اور اس سلسلہ میں نریندر سنگھ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھ بھیجا جس کے چند شعر یہ ہیں :———

سحر کہ باد سحر عرض بوستاں گیرد — دہد بہ نکہت گل حکم تا جہاں گیرد

بدوت برزند گل کردہ اند پنداری — کہ غنچہ را سپۂ سبزہ درمیاں گیرد

مگر بہ گرد گل از بہر پاس قلعہ زدست — کہ ژالہ راز ہوا سبزہ بر سناں گیرد

ستادہ سرو بدان اہتمام بر در باغ — کہ تا بہار دگر راہ بر خزاں گیرد

ز ژالہ غنچہ بر مست شاہدی ماند — کہ بعد بادہ شکر ریزہ در دہاں گیرد

چمن ز عکس شفق ساتگین مل گردد — سمن ز جوش طرب رنگ ارغواں گیرد

زنند گر ہمہ آتش بجان گل بالد — کنند گرد ہمہ پیکر زسنگ جاں گیرد

یہ قصیدہ بھیجنے کے بعد غالب کا ارادہ بدل گیا اور وہ اس خیال سے پٹیالہ نہیں جا سکے کہ ان پر اہل خاندان سے جدا ہوکر تنہا رہنا شاق گذرے گا۔

نریندر سنگھ نے اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامہ میں انگریزوں کی ہر ممکن طریقہ پر مدد

کی۔ ان کے تمام پولیٹکل معاملات اور فوجی بھرتی کے فرائض اپنے ذمے لے لیے۔ یہی نہیں بلکہ خود فوج لے کر تھانیسر کے مقام پر جالندھر سے آنے والے مجاہد دستوں کا مقابلہ کیا۔ اس زمانے میں غالب کی رہائش دہلی کے اس محلہ میں تھی جہاں نرنیدر سنگھ کے متوسلین آباد تھے۔ غالب نے دستنبو میں لکھا ہے:

"فرماں روائے پٹیالہ نرنیدر سنگھ اس جنگ میں انگریز فاتحوں کے ساتھ ہیں اور ان کی فوج شروع ہی سے انگریزی لشکر کی مددگار ہے چونکہ دہلی کی فتح متوقع تھی۔ راجہ نے از راہ بندہ پروری طاقت ور اور جنگجو انگریزوں سے طے کر لیا تھا کہ جب شہر دہلی فتح ہوگا اس گلی کے دروازے پر جہاں میں رہتا ہوں محافظ مقرر کر دئے جائیں تاکہ انگریز فوجی گھروں کو نقصان نہ پہنچا سکیں"

یہی نہیں بلکہ انگریزوں نے نرنیدر سنگھ کو ان کی خدمات کے عوض نارنول کا علاقہ بھی دیدیا جس کی آمدنی دو لاکھ روپے سالانہ تھی۔ ۱۸۶۰ء میں نرنیدر سنگھ اور ان کے ورثا کو موروثی اور جدید مقبوضات پر فرماں روائی کے اختیارات بھی مل گئے۔ ۱۸۶۲ء میں سند تبنیت بھی عطا کی گئی۔ نرنیدر سنگھ نے ۱۸۶۲ء میں قضا کی۔

(صحیفۂ زریں جلد اول ص ۱۰۱، ۱۸۵۷ء کے غدار شعرا ص ۴۴
دستنبو اردو ئے معلی غالب نمبر۔ کلیات نظم غالب فارسی دوم ص ۳۵۱)

عبدالغفور نساخ

عبدالغفور نساخ کے بزرگوں میں شاہ معین الدین نے ۱۶۲۳ء میں شاہ عباس صفوی والیٔ ایران کے عراق پر حملہ کرنے کے بعد بغداد سے ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور نورالدین جہانگیر کے عہدِ حکومت میں دہلی پہنچے جہاں ۱۶۳۱ء میں ان کا انتقال

ہوگیا۔ ان کے صاحبزادے مولوی عبدالرسول نے عہد شاہ جہاں میں نمایاں ترقی کی اور فتح آباد کے عہدۂ قضا پر مامور ہو کر فرید پور چلے گئے۔

عبدالغفور نساخ کے والد مولوی فقیر محمد کو حکومت نے بنگال میں اپنا وکیل مقرر کیا تھا وہ ان ہی مولوی عبدالرسول کی اولاد سے تھے عبدالغفور نساخ کا سال ولادت ۱۸۳۳ء مطابق ۱۲۴۹ھ ہے۔ وہ سات سال کی عمر میں مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل کیے گئے۔ اس کے تین سال بعد ان کے والد فقیر محمد کا انتقال ہوگیا جس کے نتیجہ میں ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ لیکن حالات سازگار ہوتے پر انھوں نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ لے کر سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد مزید بہتر تعلیم کی غرض سے وہ اور ان کے بھائی ہوگلی بھیج دیے گئے، جہاں بعض لوگوں کی وجہ سے ان کی شعری صلاحیتیں چمک اٹھیں اور وہ اپنے استاد مولوی رشید النبی سے اصلاح لینے لگے۔

عبدالغفور نساخ نے ملازمت کے حصول کے لیے کوششیں شروع کی ہی تھیں کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اس کے بعد تین سال تک کہیں مناسب ملازمت نہیں مل سکی۔ بالآخر ۸ ستمبر ۱۸۶۰ء کو انھیں ضلع باقرگنج کا ڈپٹی مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ ۱۸۶۳ء میں دوبارہ کلکتہ واپس بلا لیے گئے۔ یہاں ابھی ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ راجشاہی تبادلہ کر دیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں راجشاہی سے ضلع بانکا منتقل کیے گئے۔ ضلع بانکا میں انھوں نے کام شروع کیا تھا کہ گلے سے خون آنا شروع ہوگیا جس پر انھوں نے دو ماہ کی رخصت لی اور حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم محمود خاں سے علاج کرانے کی غرض سے دہلی روانہ ہوئے، دہلی پہنچنے کے بعد انھوں نے مفتی صدرالدین آزردہ، ضیاءالدین خاں نیر، سعیدالدین خاں طالب، مصطفیٰ خاں شیفتہ، الطاف حسین حالی اور غالب سے ملاقات کی، انھوں نے

دہلی میں غالب سے ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"مرزا غالب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ مولوی معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی میری طرح سے آٹھ برس کے سن سے شعر کہتے ہو گے۔ میں نے کہا ہاں ! عید کے روز مرزا صاحب نے اپنی مثنوی ابرِ گہربار کے تین چار سو شعر میرے سامنے پڑھے۔ اس پر اہلِ دہلی کو بڑا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب نے چار یا پانچ برس سے کسی کے سامنے شعر پڑھے نہ تھے۔ بلکہ اگر کوئی ان کو شعر پڑھنے کو کہتا تو خفا ہو جاتے تھے"

اس سفر کے بعد عبدالغفور نساخ لکھنؤ سے ہوتے ہوئے بانکا پہنچے، جہاں ۱۸۷۳ء تک برسرِکار رہے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ ڈھاکہ اور وہاں سے میدنی پور کر دیا گیا۔ ۱۸۸۵ء میں وہ دوبارہ ڈھاکہ بھیج دیے گئے۔ اس کے تین سال بعد ۱۸۸۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

عبدالغفور نساخ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں دست گاہ رکھتے تھے۔ نظم و نثر میں ان کی استعداد عالمانہ اور ماہرانہ ہوتی تھی۔ انھوں نے بارہ سال کی محنت کے بعد تذکرہ سخن شعرا مکمل کیا۔ اسی دوران قطعات شعراء پر مشتمل ایک اور تذکرہ "قطعۂ منتخبہ" تحریر کیا۔ ان کی تصانیف میں زبانِ ریختہ بھی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک رسالہ کے ذریعہ انیس مرحوم کے مراثی پر اعتراضات اٹھائے تھے۔ اپنا دیوان بھی "دفترِ بے مثال" کے نام سے شائع کرایا تھا اور اسے غالب کے پاس بطور تحفہ بھیجا تھا۔ غالب نے ایک خط میں اس دیوان سے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے ان کو لکھا :

"میں دروغ گو نہیں، خوشامد میری خو نہیں، دیوان فیض عنوان اسم با مسمیٰ ہے۔ دفترِ بے مثال نام اس کا بجا ہے۔ الفاظ متین، معانی

بلند، مضمون عمدہ، بندش دل پسند، ہم فقیر لوگ اعلائے کلمۃ الحق میں بے باک و گستاخ ہیں، شیخ امام بخش طرز جدید کے موجد اور ناہموار روشوں کے ناسخ تھے، آپ ان سے بڑھ کر بصیغۂ مبالغہ بے مبالغہ نساخ ہیں، تم دانائے رموز اردو زبان ہو، سرمایۂ نازش قلمروئے ہندوستان ہو۔"

عبدالغفور نساخ کے اس دیوان کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے عجیب وغریب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "یہ تمام تر مزخرفات سے لبریز ہے ایک مصرعہ بھی ایسا نہیں مل سکتا جس پر غالب کی یہ بے معنی مداحی صادق آسکے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ باوجود بنگالی نژاد ہونے کے اردو میں تک بندی کرلیتے تھے۔

دفتر بے مثال کے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں، جس کو انھوں نے اپنے تذکرہ میں اشعار دیوان دفتر بے مثال کے نام سے درج کیا ہے:

جنبش ابرو سے اس کی لوٹتا ہے مرغ دل
کام وہ صیاد لیتا ہے کماں سے تیر کا

موم دل جو ہے بنتا ہے اسے ہر سنگ دل
شمع کا سر کاٹنا اک کھیل ہے گل گیر کا

پوچھا نہ حال گرمیٔ حسن شباب کا ہے دوپہر کو گرم مزاج آفتاب کا

گاہ جاڑا، گاہ گرمی، دن کبھی برسات کا اک روش کٹنا بہت دشوار ہے اوقات کا

گالی مجھے جو دے تو جلے غیر رشک سے
اس بت کی دشمنی بھی محبت سے کم نہیں

اس بت کے ہجر میں جو ٹپکتے ہیں اشک صاف
سنگ چکاں سے کم مری چشمانِ نم نہیں

بھرتے جواب صاف سے میں کاسۂ سوال
اس عہد کے بخیل بھی حاتم سے کم نہیں

کیوں کر زباں سے اسکی نزاکت کا ہو بیاں
مہندی ملے سے لال ہوں جس مہ لقا کے ہاتھ

کی بیان حال میں اس کی فراموشی کی یاد
آتے آتے تا زباں تقریر آدھی رہ گئی

کعبہ بہ خدا گر ہو تراسنگ درِ ایے بُت
بھولے سے رہی یاد کہ سجدہ نہ کریں گے

(خود نوشت نساخ (مطبوعہ نقوش آپ بیتی نمبر)
نقشِ آزاد صـ ۲۶۹ ، ادبی خطوط صـ ۳۰
خطوط غالب صـ ۳۴۹)

گوبند سہائے نشاط

گوبند سہائے کا بہار کے کائستھوں کی ایک شاخ ماتھر سے تعلق تھا، ان کے والد منشی خوب لال پٹنہ سے علیگڑھ آکر وکالت کرنے لگے۔ یہیں ۲۸ر دسمبر ۱۸۲۸ء کو گوبند سہائے کی ولادت ہوئی۔ اس دور کے رواج کے مطابق علوم درسیہ کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ بعد میں انھوں نے اپنی ذاتی کوششوں سے عربی اور سنسکرت بھی سیکھی۔

گوبند سہائے نے ۱۸۵۰ء میں نظارت صدر امینی کا عہدہ قبول کیا اور علیگڑھ سے دہلی چلے آئے اور یہیں گوپال تفتہ کی وساطت سے غالب سے ملاقات کی چار سال دہلی میں گزارنے کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور گوالیار میں میر منشی کے عہدہ

پر کام کرنے لگے۔ ۱۸۵۵ء میں سررشتہ دار عدالت دیوانی ہوئے۔ اس کے دو سال بعد غدر ہوگیا۔ جس کے دوران ملازمت کو خیرباد کہہ کر علیگڑھ چلے آئے اور ۱۸۶۲ء میں آگرہ پہنچ کر وکالت شروع کر دی، ۱۸۷۵ء میں کوٹہ کا جج مقرر کیا گیا لیکن دو ہی سال بعد آب وہوا پسند آنے پر علیگڑھ کا قصد کیا اور یہیں ۳ مئی ۱۸۹۱ء کو فوت ہوئے۔

غالب گوبند سہائے سے اکثر شراب منگایا کرتے تھے۔ ایک خط میں انھوں نے انگریزی شراب کاس ٹیلن اور اولڈ ٹام کے دام پوچھے ہیں، لکھتے ہیں:

"یہ دونوں قسم بیس روپے، حد چوبیس روپے درجن آتی تھی۔ اب یہاں پہلے تو نظر نہیں آتی تھی اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے وہاں تم دریافت کرو کہ اس کا نرخ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بطریق ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں؟ اگر بہ قیمت مناسب ہاتھ آئے اور اس کا بھیجنا ممکن ہو تو یہاں سے روپے کی ہنڈوی بھیجدوں اور تم خرید کر بیل گاڑی کی ڈاک پر روانہ کر دو"

گوبند سہائے نے اس خط کے جواب میں غالب کو لکھا کہ یہاں بھی شراب دہلی ہی کے نرخ سے ملتی ہے تو انھوں نے اس کے بھیجنے کی ان الفاظ میں ممانعت کر دی:

"کاس ٹیلن اور اولڈ ٹام دونوں چوبیس روپے درجن لیا کرتا تھا، اب یہاں مہنگی ملتی ہے۔ میں نے تم سے پوچھا جب وہاں بھی اس قیمت کو ملتی ہے تو میرا مقدور نہیں۔ میں سمجھا تھا کہ شاید وہاں ارزاں ہو، خیر اس کو جانے دو، روٹی مل جائے تو غنیمت ہے"

گوبند سہائے کا تخلص نشاط تھا۔ وہ غالب کے عقیدت کیش تلامذہ میں سے تھے انھوں نے نشاط المحاسبین کے نام سے ریاضی پر ایک منظوم کتاب لکھی تھی، انکے دیوان

نشاط الاحباب میں غزلوں کے علاوہ نظمیں، مثنویاں اور قصائد بھی پائے جاتے ہیں، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

مجھ سے یہ خشم نا روا کیا ہے
کچھ تو کہئے مری خطا کیا ہے
بے وفاؤں سے چاہتا ہے وفا
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
ہو میسّر مے دو سالہ اگر
اور پھر رحمتِ خدا کیا ہے

وعدوں ہی کو تمہارے نہ سمجھے ہیں ہم دروغ
تم جھوٹے عہد جھوٹے تمہاری قسم دروغ
آئینہ رو نمائے سکندر ہی گرچہ ہو
ہستی بہ اعتبارِ وجود و عدم دروغ
دشمن کے مرگ کی بھی نہ ہم آرزو کریں
کس طرح لوحِ زیست پہ کھینچیں قلم دروغ

(آجکل فروری ۵۵ء خطوط غالب؛ ص ۳۲۸

"تلامذۂ غالب ص ۳۴۹)

مرزا نصراللہ بیگ خاں

مرزا نصراللہ بیگ خاں، مرزا قوقان بیگ خاں کے چھوٹے صاحبزادے اور غالب کے حقیقی چچا تھے۔ ان کی شادی نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کی بہن سے ہوئی تھی۔ اس وقت اکبرآباد اور اس کے گرد و نواح میں مرہٹوں کا راج تھا۔ جب ۱۲ فروری ۱۷۹۴ء کو مادھوجی سندھیا نے انتقال کیا اور اس کے بھائی کے پوتے دولت راؤ سندھیا نے گدی سنبھالی۔ انگریزوں نے مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار

کو روکنا چاہا۔ چنانچہ انھوں نے سپیروں کی کمان میں مرہٹہ سپہ سالاروں سے مل کر سازش کی اور ان کے تمام مستحکم قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ صورت حال مرہٹوں کے لئے انتہائی تشویشناک اور پریشان کن تھی۔ انھوں نے نصراللہ بیگ خاں کو آگرہ کا قلعہ دار مقرر کیا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے آگرہ کے قرب وجوار میں پیش قدمی کی تو نصراللہ بیگ خاں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پورا شہر کسی مزاحمت کے بغیر انگریزوں کے حوالے کر دیا جس پر لارڈ لیک نے ان کو ہی قلعہ دار رہنے دیا۔ اس واقعہ کے چند دنوں بعد ان کی جگہ مسٹر ڈیلر کی تعیناتی عمل میں آئی۔ نصراللہ بیگ خاں نے متھرا پہنچ کر لارڈ لیک سے ملاقات کی جس پر لارڈ لیک نے ان کی کمان میں چار سو سواروں کا دستہ دے دیا اور سترہ سو روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی۔

جب انگریزوں اور بھرت پور میں ایک معاہدہ کی رو سے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے اور لارڈ لیک نے انگلستان جانے کا قصد کیا تو اسے نصراللہ بیگ خاں کی خدمات اور وفاداریاں یاد آگئیں، چنانچہ اس نے ۲۱ ستمبر ۱۸۰۵ء کو سونسا کے دو پرگنے تاحین حیات ان کو مرحمت کر دیے جو متھرا سے سو امیل دور ٹکھیر جانے والی سڑک پر واقع تھے، ان دونوں پرگنوں کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے سے زائد تھی۔

نصراللہ بیگ خاں کو ان دونوں پرگنوں کی آمدنی سے زیادہ دنوں فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ وہ ان کو اپنے انعام وتصرف میں لینے کے دس گیارہ ماہ بعد سیر کو جاتے ہوئے ہاتھی سے گر پڑے، جس سے ان کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور شدید زخم آئے۔ ۱۸۰۶ء میں ان کا انتقال ہو گیا جس پر انگریزوں نے سونک اور سونسا کے پرگنے واپس لے لئے اور پسماندگان کے لئے پانچ ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر کر دی۔

(احوال غالب ص۲۸، مکاتیب غالب ص ۱۲۳
ذکر غالب ص۲۸، آجکل فروری ۶۳ء)

میاں نظام الدین

میاں نظام الدین، غلام نصیر الدین عرف میاں کالے کے صاحبزادہ اور مولوی قطب الدین کے پوتے تھے جن کا سلسلۂ چشتیہ و نظامیہ اپنے والد مولانا فخر الدین اور دادا نظام الدین اورنگ آبادی سے ہوتا ہوا شاہ کلیم اللہ شاہ جہاں آبادی تک پہنچتا ہے۔

میاں کالے نے ۱۵ر صفر ۱۲۷۰ھ کو انتقال کیا۔ ان کے انتقال پر میاں نظام الدین نے مسند سجادگی کو زینت دی۔ میاں کالے کے خاندان والوں سے ہی غالب کا تعلق تھا۔ وہ میاں کالے کے انتقال کے بعد بھی برابر ان سے ملتے رہے۔

اٹھارہ سو ستاون کی سعی انقلاب کے دوران غالب کی بیوی امراؤ بیگم نے اپنا تمام قیمتی ساز و سامان میاں کالے کی بیوی اور میاں نظام الدین کے مکان بھیج دیا تھا خیال تھا کہ اگر انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو وہ میاں نظام الدین کا ان کے والد کی بزرگی اور تقدس کی وجہ سے احترام کریں گے، لیکن انگریزوں نے ان کے مکان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ان کے مال و اسباب کے ساتھ غالب کا بھی ساز و سامان لٹ گیا۔ اس تباہی کو غالب نے ایک خط میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ ابراہیم علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خود میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا، جیسے جھاڑو پھیر دی، کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار اور پشمینہ کا بال باقی نہ رہا ــــ"

غالب ہی کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں انگریزوں کے دہلی پر قبضہ کر لینے کے بعد شہر کے لوگوں نے بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں، وہیں میاں نظام الدین

بھی اپنی والدہ اور خاندان کے ساتھ دہلی سے نکل کھڑے ہوئے۔ غالب نے انوارالدولہ شفق کو ۱۸۶۰ء میں ایک خط لکھا ہے۔ اس کے مطابق :

" میاں نظام الدین، بڑودہ میں رہے، اورنگ آباد میں رہے، حیدرآباد میں رہے۔ سال گزشتہ یعنی جاڑوں میں یہاں آئے، سرکار سے صفائی ہو گئی لیکن صرف جاں بخش، روشن الدولہ کا مدرسہ جو عقب کوتوالی چبوترہ ہے وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں فضل علی خاں مرحوم رہتے تھے، وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی یہ املاک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کی ہیں۔ وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی ہے۔ فی الحال میاں نظام الدین پاک پٹن گئے ہیں۔ شاید بہاولپور بھی جائیں "

میاں نظام الدین نے ۲۱ شوال ۱۲۹۶ھ کو انتقال کیا۔

(تحفۂ سیدیہ ص۹۔ خطوط غالب ص۱۵۴ ص۱۳۷
دستنبو (دہلی کالج میگزین غالب نمبر)

مولوی نعمان احمد

جن لوگوں نے اٹھارہ سو ستاون کے ہنگامے میں انگریزوں کی پشت پناہی اور خیرخواہی کی، انگریزوں نے ان کو فتح دہلی کے بعد نہ صرف انعام و اکرام سے نوازا بلکہ خدمات کے صلہ میں بڑی بڑی رقمیں اور جاگیریں بھی عطا کیں۔ ایسے ہی لوگوں میں مولوی منظر علی بھی تھے جن کو سیتاپور سے اٹھارہ میل دور شمال مغرب میں واقع مہور کا علاقہ بطور جاگیر انعام ہوا تھا۔

مولوی منظر علی عربی اور فارسی کے جید عالم اور زبردست شاعر تھے، انھوں

نے طب پر بھی ایک مستقل کتاب تصنیف کی تھی، ۱۸۸۸ء میں وہ لاولد انتقال کر گئے اس طرح جہور کا نظم و نسق ان کے بھتیجے مولوی نعمان احمد کے سپرد کیا گیا۔

مولوی نعمان احمد مولوی سبحان احمد کے بیٹے تھے۔ ان کا سال ولادت، ۱۲۷۵ھ بتایا گیا ہے۔ چراغ احمد سے بھی ان کا سالِ پیدائش برآمد ہوتا ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم جہور ہی میں حاصل کی۔ بعد ازاں بنارس چلے گئے۔ تمام علوم متداولہ پر عبور پاتے اور طب میں کمال حاصل کرنے کے بعد جہور چلے آئے اور تعلقدار کی حیثیت سے کام کرنے لگے ۱۹۰۲ء ان کا سال رحلت ہے۔

مولوی نعمان احمد کے نام غالب کے جتنے بھی خط تحقیق کیے گئے ہیں ان کی تعداد چار سے زائد نہیں ہے۔ ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا زمانۂ تحریر غالب کے ایام آخر سے عبارت ہے۔ ہمارے پاس اس کا قطعی ثبوت نہیں ہے کہ مولوی نعمان احمد اور غالب میں خط و کتابت کا آغاز کیوں کر ہوا۔ تاہم ان کے صاحبزادہ حکیم سید احمد کے بیان سے انکشاف ہوتا ہے کہ

جن دنوں مولوی نعمان احمد کا محمود آباد میں قیام تھا، مولانا قدر بلگرامی بھی تشریف رکھتے تھے۔ فارسی انشا پردازی اور خطوط نویسی کا ذکر آیا تو مولوی نعمان احمد نے اپنے بعض خط اور رقعے سناتے۔ قدر بلگرامی کو غالب کا انداز تحریر پسند تھا، انھوں نے کہا کہ اگر آپ کو واقعی داد لینا ہے تو غالب کو خط لکھیے۔ اگر وہ پسند کریں تو سمجھیے کہ آپ انشا پرداز ہیں۔ اس طرح مولوی نعمان احمد نے غالب کو پہلی مرتبہ فارسی میں خط لکھا۔ انھیں امید تھی کہ غالب فارسی میں جواب دیں گے لیکن انھوں نے فارسی کی بجائے اردو میں جواب دیا، جس کی وجہ سے مولوی نعمان احمد کو فرمائش کرنا پڑی کہ وہ فارسی میں جواب دیں:۔ ۶ ر اکتوبر ۱۸۶۶ء کو دوسرے خط میں غالب نے اس کی معذرت کی ہے اور لکھا ہے:

"برسوں سے خطوط فارسی میں لکھنے چھوڑ دیئے - اب شہزادہ بشیرالدین بہادر نبیرۂ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسی کو فارسی نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے اور وہ مطالعہ ہیں اور میں مطیع -"

(ذوق ادب اور شعور ص ۱۲۸ ص ۱۳۳

تواریخ مع تصاویر راجگان و تعلقداران اودھ ص ۹۱)

مولوی نعمت علی

مولوی نعمت علی اپنے دور کے جید عالم اور انشا پرداز تھے، انھوں نے اپنی علمی اور ادبی زندگی کا آغاز ایشیاٹک سوسائٹی کی ملازمت سے کیا۔ وہ سوسائٹی کے لئے مطبوعات ترتیب دیتے اور اس کی تصحیح کرتے تھے۔ جن دنوں غالب نے اپنی پنشن اور نواب شمس الدین خاں کے اخلاف کے مظالم کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کیا۔ وہاں مشاعرہ بھی ہوا اور غالب کی شاعری پر چہ میگوئیاں بھی ہوئیں، اس دوران مرزا قتیل کا حوالہ بھی آیا - جس پر غالب برہم ہوگئے اور نوبت ترش کلامی سے جھگڑے تک پہنچ گئی اور غالب کو باد مخالف کے عنوان سے معذرت کے طور پر ایک مثنوی لکھنا پڑی -

غالب نے شاہ عالم مارہروی کے نام اس واقعہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا کہ "اس مثنوی کی ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی، مولوی عبدالقادر رام پوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال و نظائر کو بھیجی گئی، اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے -"

غالب کے ان جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے معرکہ حامیان قتیل و غالب کے سلسلہ میں غالب کا ساتھ دیا۔ مولوی عبدالقادر رام پوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جس وقت کلکتہ پہنچے تھے۔ مولوی نعمت علی کا قیام چھپرہ میں تھا اور مولوی لطف

کے فرائض انجام دیتے تھے۔

(علم و عمل صہ ۱۴۴، عود ہندی صہ ۴۲)

سید محمد نصیر عرف نواب جان

سید محمد نصیر عرف نواب جان' نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر نامی کے داماد اور ناظر حسین مرزا کے بہنوئی تھے۔ ناظر حسین مرزا کی بڑی بہن قدسیہ بیگم عرف حسینی صاحبہ ان سے بیاہی گئی تھیں۔

۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب ناکام ہوئی تو دہلی کے وضیعوں اور شریفوں کی بہت بڑی تعداد خود کو انگریزوں کے احتساب و مواخذہ سے محفوظ رکھنے کے لئے گم نام علاقوں کی طرف نکل گئی۔ سید محمد نصیر عرف نواب جان نے بھی اپنے اہل و عیال کو لکھنو روانہ کر کے باندہ کی راہ لی، لیکن کسی مخبر کی چغلی کھانے پر بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے، لکھنو لایا گیا اور ۱۸۵۹ء میں ان کو حبس دوام یعنی چودہ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ غالب کو اس واقعہ کا علم ان کے صاحبزادے یوسف مرزا کے ایک خط کے ذریعہ ہوا، جس پر انھوں نے میر مہدی مجروح کو لکھا:

"ارے میاں تم نے کچھ اور بھی سنا، کل یوسف مرزا کا خط لکھنو سے آیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ نصیر جاں عرف نواب جان والدان کا دائم الحبس ہو گیا۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی آفت آئی۔ یوسف مرزا تو جھوٹ کاہے کو لکھے گا، خدا کرے اس نے جھوٹ سنا ہو"

سید محمد نصیر عرف نواب جان' چودہ سال قید با مشقت کی سزا بھگت رہے تھے کہ انگریز حکام نے اسے موت سے بدل دیا اور ان کو مئی ۱۸۶۰ء میں پھانسی دے دی۔ غالب کو اس سانحہ کی اطلاع ان کی والدہ اور یوسف مرزا کے خط سے

ملی - جس پر انھوں نے ۱۹ر مئی ۱۸۶۰ء کو ایک خط کے ذریعہ یوسف مرزا سے یوں تعزیت کی -

"کیونکر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے - تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو' ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ' بھلا کیوں نہ تڑپے گا ' صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی ' دعا کو دخل نہیں' دوا کا لگاؤ نہیں' پہلے بیٹا مرا' پھر باپ مرا' مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سروپا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا کہ یوسف مرزا کو' تمہاری دادی لکھتی ہیں کہ رہائی کا حکم ہو چکا تھا - یہ بات سچ ہے؟ اگر سچ ہے تو جواں مرد ایک بار دونوں قیدوں سے چھوٹ گیا، نہ قید حیات رہی نہ قید فرنگ "

(تلامذۂ غالب ص۲۰۰، خطوط غالب ص۳۰۳ ص۳۱۸، ص۲۹۰)

منشی نول کشور

منشی نول کشور کے دادا بال مکند انگریزی عہد حکومت میں خزانۂ آگرہ کے محافظ تھے اور والد جمنا داس بھارگو کا سانی کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا - منشی نول کشور دسمبر ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے - دس سال کی عمر تک اپنے گھر ہی پر تعلیم حاصل کی، پھر ان کو آگرہ بھیج دیا گیا، جہاں انھوں نے کالج میں داخلہ لینے کے بعد مضمون نگاری بھی شروع کر دی، اسی زمانے میں کوہ نور پریس لاہور کے مالک ہرسکھ رائے کو ایک آدمی کی ضرورت پیش آئی، انھوں نے پریس کے کاموں کے لئے آگرہ کے جج کرم ہاتے

مکھن لال کو خط لکھا۔ مکرم رائے مکھن لال نے منشی نول کشور کو لاہور بھیج دیا۔ وہ چار سال تک اس پریس میں کام کرتے رہے۔ بعد ازاں لکھنؤ پہنچ کر اپنا ذاتی مطبع قائم کرنے کی سعی کی، یہ مطبع لکھنؤ میں کوٹھی غالب جنگ میں مطبع منشی نول کشور کے نام سے قائم کیا گیا جس سے اودھ اخبار کے ساتھ ساتھ مختلف علوم وفنون پر کتابیں بھی شائع ہونے لگیں، منشی نول کشور کا یہ کارنامہ ایسا تھا کہ اسے ملک کے ہر طبقہ میں سراہا گیا اور خود سرکار برطانیہ بھی ان کو سی آئی اے کا خطاب دینے پر مجبور ہوگئی۔

ایک مرتبہ گورنر پنجاب نے راولپنڈی میں دربار کیا اس میں منشی نول کشور بھی مدعو کیے گئے اور ان کو مہاراجاؤں کے برابر کرسی دی گئی، جس پر اعتراض ہوا۔ امیر کابل نے گورنر سے دریافت کیا، یہ کون منشی نول کشور ہیں جن کو اتنا بڑا اعزاز دیا گیا ہے۔ اس پر گورنر نے امیر کابل سے ان کا تفصیلی تعارف کروایا جس پر امیر کابل ان کے گلے لپٹ گیا اور ان کو اس امر پر مبارکباد دی کہ ان کی شائع کردہ کتابیں کابل اور بخارا تک میں انتہائی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

غالب اور منشی نول کشور میں دوستانہ روابط کب قائم ہوئے، اس سے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اودھ اخبار کی فائلوں سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس میں غالب کی کتابوں کے اشتہارات، اعلانات اور غزلیں شائع ہوتی تھیں۔

غالب کے بعض خطوط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۶۰ء میں اودھ اخبار کے اعزازی خریداروں میں سے تھے۔ سالانہ ٹکٹ بھیجنے پر ان کو اخبار بلا معاوضہ مل جایا کرتا تھا، منشی نول کشور ۱۸۶۳ء میں دہلی آئے تو غالب سے بھی ملے۔ غالب نے اس ملاقات کا حال علاؤ الدین خاں کے نام ایک خط میں یوں لکھا ہے:

" شفیق مکرم ولطفِ مجسم منشی نول کشور صاحب بہ سبیلِ ڈاک یہاں آئے، مجھ سے اور تمہارے چچا اور بھائی شہاب الدین خاں سے ملے،

خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے"۔

اسی طرح غالب نے ایک اور خط میں لکھا ہے :

"ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کرکے کہا کر اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا ، مگر چونکہ فقیر تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں، ساڑھے باسٹھ روپے یعنی سات سو پچاس سال سرکار انگریزی سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رامپور سے اور چوبیس روپے سال ان مہاراج سے۔ توضیح یہ کردو برس سے ہر مہینہ میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع کو پہنچا دیا کرتا ہوں "

منشی نول کشور بہت باسلیقہ اور منتظم قسم کے آدمی تھے۔ انھوں نے اودھ اخبار اور مطبع کی مصروفیتوں کے علاوہ اناؤ اور بارہ بنکی میں کئی بڑی جائدادیں خریدی تھیں۔ اور ان کا انتظام وہ خود کرتے تھے۔ ان کی اس خوش انتظامی کو دیکھ کر مہاراجہ جے پور نے انھیں اپنا نائب بنانا چاہا لیکن وہ کسی نوکری یا ملازمت کے قائل نہیں تھے، انھوں نے انکار کردیا۔

منشی نول کشور نے ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو اکسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کی خبر آناً فاناً ملک کے متعدد اخباروں کے ذریعہ ہر خاص و عام تک پہنچ گئی، مختلف شہروں اور علاقوں میں باقاعدہ طور پر ان کا سوگ منایا گیا۔ ان کی لاش ایک خصوصی ٹرین کے ذریعہ کانپور لے جاکر نذر آتش کی گئی اور ان کی راکھ کو گنگا میں بہایا گیا۔ ان کے صاحبزادے پراگ نرائن بھارگو نے ان کی رسوم تعزیت پر ہزاروں روپے صرف کئے۔

(خطوط غالب - مہیش صـ۳۵۴ ، صـ۳۵۵
آجکل یکم جون ۱۹۴۵ء صحیفہ زریں صـ۳۰۱)

ضیاء الدین احمد خاں نیر

جس وقت احمد بخش خاں کا انتقال ہوا، ضیاء الدین خاں کی عمر صرف چھ برس کی تھی ان کی جائیداد کا انصرام و انتظام ان کے بھائی نواب امین الدین خاں چلاتے تھے۔

ضیاء الدین خاں نے ۱۸۴۹ء میں امین الدین خاں سے مطالبہ کیا کہ وہ لوہارو کے انصرام و انتظام میں ان کو برابر کا شریک کریں لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا جس پر بات سرکار انگریزی تک پہنچی اور اس نے فیصلہ کر دیا کہ نواب امین الدین خاں لوہارو کی آمدنی سے سالانہ اٹھارہ ہزار روپے ضیاء الدین کو ادا کرتے رہیں۔ ضیاء الدین خاں نے طوعاً و کرہاً اس فیصلہ کو قبول کر لیا اور لوہارو کی سکونت ترک کر کے دہلی چلے آئے۔

دہلی میں مطالعہ کے علاوہ ضیاء الدین خاں کی کوئی اور مصروفیت نہیں تھی، انھوں نے نجوم، ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ ہی میں اپنا اعتبار نہیں بڑھایا بلکہ اردو اور فارسی شاعری میں بھی اپنے معاصرین پر اپنی دھاک بٹھا دی۔ ان کے کتب خانے میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود تھا جب حکومت ہند کے سیکریٹری مسٹر ایلیٹ اپنی مشہور تصنیف تاریخ ہند لکھ رہے تھے تو ضیاء الدین خاں ہی نے ان کی مدد کی اور ان کو نادر اور نایاب مواد بہم پہنچایا جس کا اعتراف انھوں نے اس تصنیف کے دیباچہ میں کیا ہے۔

ضیاء الدین خاں غالب سے بہ لحاظ امارت بہت بلند تھے، لیکن ان کو غالب سے جتنی عقیدت اور محبت تھی، شاید ہی کسی سے رہی ہو۔ وہ روزانہ صبح انتہائی باقاعدگی کے ساتھ غالب کے یہاں جاتے اور ہمیشہ ان کا کلام اپنے ہمراہ لے جاتے اور اس کو جمع کرتے تھے۔ جس وقت غالب کو اپنا دیوان شائع کرنے کا خیال ہوا، انھوں نے ضیاء الدین

خاں کو لکھا کر وہ مجموعہ بھیج دیں' انھوں نے ضائع ہونے کا عذر کیا۔ غالب نے پھر تقاضا کیا، ضیاءالدین خاں پھر انکاری ہوتے، جس پر غالب نے انتہائی سخت لہجہ میں لکھا:

"آپ کو دیوان دینے میں تامل کیوں ہے' روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کو دیکھے کھانا ہضم نہ ہوتا ہو یہ بھی نہیں' پھر آپ کیوں نہیں دیتے ایک جلد ہزار جلد بن جاتے' میرا کلام شہرت پائے' میرا دل خوش ہو' تمھاری تعریف کا قصیدہ اہلِ عالم دیکھیں' تمھارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے' اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں، رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ' یہ خفقان ہے۔ احیاناً اگر ایسا ہوا تو اور دہلی و لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رام پور جاؤں گا اور نواب فخرالدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔"

جس وقت غالب کا انتقال ہوا، ان کی تجہیز و تکفین کی تمام رسوم نواب ضیاءالدین خاں ہی نے انجام دیں اور ان ہی کی ہدایت پر غالب کے مراسم آخری اہلِ تسنن کے موافق ادا ہوئے ــــــ!

ضیاءالدین خاں آخر عمر میں ضیق النفس کا شکار ہو گئے تھے جس کا سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ انتقال سے تین دن قبل ان کو شدت سے بخار آیا اور بتدریج بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور وہ اسی عالم میں ۱۳، رمضان ۱۳۰۳ھ کو انتقال کر گئے۔ ان کو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔ مولوی رضی الدین دہلوی نے "روز شنبہ سیزدہ شہر صیام" سے ان کی تاریخ وفات نکالی۔ ضیاءالدین نے اپنی زندگی میں اپنا کلام باقاعدگی سے جمع نہیں کیا تھا۔ ان کے صاحبزادے سعیدالدین احمد خاں طالب ان کے مرنے کے بعد ان کا جتنا کچھ کلام جمع کر سکے' وہ "جلوۂ صحیفۂ زرینِ نیر درخشاں" کے عنوان سے شائع ہو گیا ہے۔

ممنوں نہیں ہے برق و سموم و شرار کا — رکھتا ہے حکم جلنے میں عاشق چنار کا
جب اپنے شغل سے دل خونیں نہ باز آئے — پھر کیا گناہ دیدۂ خونابہ بار کا
آنکھوں میں بوالہوس کی کھٹکتا ہوں مثلِ خار — احسان ہے یہ مجھ پہ مری چشمِ زار کا

گرانہتا نہیں ستم وجودِ یار کو ، — شوق زیادہ جو کو مرے بھی گراں نہیں
ہے دوست صدق دشمن و دشمن دروغِ دوست — کیا رشک صلح جس میں صفا درمیاں نہیں

پی کے گرنے کا ہے ملال ہمیں — ساقیا لیجو سنبھال ہمیں
شب نہ آتے جو اپنے وعدے پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
طالعِ بد سے نیّرؔ رخشاں — اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

رخشاں جو آتے آتے ابھی رک گئے ہیں اشک — آنکھوں میں آگیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

(گلستانِ سخن دوم ص ۳۹۰ ، خطوطِ غالب ص ۱۱۳ ،
تلامذۂ غالب ص ۳۸۵ ص ۲۹۳)

حکیم محبّ علی نیّر

حکیم محب علی نیّرؔ کاکوروی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن حنفیہ تک پہنچتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی ۳۲ ویں پشت تھی۔ ان کے پردادا شیخ محبوب عالم اٹاوہ کے چکلہ دار تھے۔ ان کے دادا شیخ عاشق علی نے ملازمت کے سلسلہ میں میرٹھ کے ایک قصبہ گلاوٹھی میں سکونت اختیار کر لی تھی، اسی طرح والد حکیم مشتاق علی طب کی تکمیل کے بعد ضلع ایٹہ کی ایک ریاست آدر میں طبیب کی حیثیت سے

ملازم ہو گئے۔ چندے بھوپال میں بھی قیام کیا۔ آخر کار مین پوری پہنچ کر اپنا ذاتی مطب قائم کیا
۲۶ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ ان کی تاریخ انتقال ہے، محسن کاکوروی نے مہتاب قرین آفتاب سے
ان کا سال وفات برآمد کیا ہے۔

حکیم محب علی نیر ۲۹ ربیع الاول ۱۲۵۴ھ کو پیدا ہوئے۔ طبی اور درسی تعلیم اپنے والد
سے پائی۔ میرٹھ میں قیام کیا۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پڑوس میں اقامت تھی۔ غالب دو تین
مرتبہ میرٹھ گئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ہاں ٹھہرے۔ اسی دوران ان کی حکیم محب علی
نیر سے بھی ملاقات کی۔

جس وقت ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کا غلغلہ پیدا ہوا، حکیم محب علی نیر اپنے والد حکیم
مشتاق علی کی جگہ میرٹھ کی عدالت میں ناظر رشتہ کی خدمت پر کام کر رہے تھے۔ جب یہ غلغلہ
ماند پڑا اور سکون و عافیت کی کچھ صورت پیدا ہوئی تو وہ مین پوری چلے گئے اور وہیں وکالت اور
طبابت شروع کر دی۔

حکیم محب علی نیر میرٹھ کے قیام کے دوران نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے اصلاح لیتے
تھے، مین پوری آنے کے بعد انھوں نے غالب کو اپنا کلام دکھانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلہ
میں میرٹھ کی ملاقاتوں کا حوالہ دیتے ہوئے ان سے اصلاح کی درخواست جسے انھوں نے بخوشی
منظور کر لیا اور لکھا۔

"بندہ پرور آپ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مجھ سے میرٹھ میں ملے
تھے۔ مگر میں ہر چند یاد کرتا ہوں مجھ کو وہ صحبت اور آپ کی ملاقات کی صورت
یاد نہیں آتی ہے، بہرحال ارسال مسودات کی خواہش مقبول اور حک و اصلاح
کی خدمت بجا لانی بہ دل منظور، تمہارے ابوالآبا کا گروہ ابوالائمہ بھی ہیں، غلام
ہوں۔ علیہ الصلوٰۃ وعلیہ السلام ۱۲۔"

حکیم محب علی نیر نے ۱۰ جمادی الاول ۱۳۲۲ھ کو انتقال کیا اور مین پوری کی عیدگاہ کے

صحن میں اپنے والد کی قبر کے پائیں دفن ہوئے۔ ان کا کلام شاید ان کے اعزا اور اقربا کی تحویل میں ہو۔

(تذکرہ مشاہیر کاکوری صہ ۴۰۳، ۴۰۴، ۱۲۲، ۱۲۵
۔ ہندوستانی ۱۹۳۳ء (۴) صفحہ ۱۴۹)

حکیم نسیم اللہ

حکیم نسیم اللہ علیگڑھ کول کے رہنے والے تھے، انھوں نے دہلی آکر حکمت حکیم امام الدین سے اور فلسفہ مولوی صدر الدین آزردہ سے پڑھا، اسی زمانے میں ان کو اپنے والد کے بیمار ہونے کی اطلاع ملی، جس پر وہ اپنی تمام کتب درسیہ چھوڑ کر کول روانہ ہو گئے۔

حکیم نسیم اللہ نے حصول تعلیم سے فراغت پانے کے بعد علی گڑھ کے محکمۂ فوجداری میں ملازمت کرلی، ان کے حلقۂ احباب میں منشی نبی بخش حقیر اور مرزا گوپال تفتہ بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ دہلی میں بھی ان کے احباب کا جم گھٹا تھا۔ وہ ایک مرتبہ دہلی گئے تو منشی نبی بخش حقیر نے ان کے ذریعہ غالب سے پاکھل کے مرثیہ اور اچار کی فرمائش کی لیکن غالب مرثیہ بھجوانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

(نادرات غالب صہ ۲ ———— حاشیہ نادرات صہ ۹۳)

خواجہ وحید الدین

خواجہ وحید الدین، سر سید احمد خاں کے ماموں اور نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں وزیر اکبر شاہ ثانی کے خلف اکبر تھے۔ جب مرزا جہانگیر کا الہ آباد میں انتقال ہوا تو خواجہ وحید الدین الہ آباد بھیجے گئے تاکہ وہ مرزا جہانگیر کی لاش وہاں سے دہلی لائیں۔ ان کی اس کارکردگی پر نواب ممتاز محل نے ان کو مرزا جہانگیر کے صاحبزادے

مرزا تیمور شاہ کی سرکار کا مختار کل کر دیا اور وہ مختار الدولہ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔

نواب ممتاز محل، خواجہ وحید الدین کی بڑی قدر کرتی تھیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے ممتاز محل کے انتقال سے ایک یا ڈیڑھ برس پہلے کسی بات پر ناراض ہو کر ترکِ ملازمت کر لی اور لکھنؤ چلے گئے۔ اس وقت علی نقی خاں نائب اودھ تھے۔ انہوں نے ان کو انتہائی اعزاز و احترام کے ساتھ رکھا۔ چند سال کے بعد وہ دوبارہ دہلی چلے آئے۔ عبدالقادر رام پوری کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ جنرل اختر لونی کی مصاحبت میں بھی گذارا اور نواب رحیم النسا بیگم کی سرکار سے بھی انعام و اکرام پاتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران خواجہ وحید الدین کا قیام دہلی میں تھا، جس وقت انگریزوں نے دہلی کو دوبارہ فتح کر لیا، چیلوں کے کوچہ میں رہنے والوں میں سے کچھ افراد نے ان کی مدافعت کی، جس پر کچھ سپاہی خواجہ وحید الدین کے مکان میں گھس پڑے اور ان کو عین حالتِ نماز میں گولی کا نشانہ بنا دیا۔ غالب نے ان کے انتقال پر ذیل کا قطعۂ تاریخ لکھا ہے

کرد چوں ناظر وحید الدین ز دنیا انتقال — گفتم آیا بر کدام آئیں بود سالِ وفات
گفت غالب سر ز داری اگر نامش بر بند — خود ہمیں ناظر وحید الدین بود سالِ وفات

(سیرت فریدیہ صفحہ ۱۳۰، ۱۳۱، علم و عمل صفحہ ۲۹۵

بعد بارغ دو در صفحہ ۲)

میر وزیر علی

میر وزیر علی حضرت شاہ عالم مارہروی کے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۸۶۰ء میں وہ دہلی کے ڈپٹی کلکٹر ہو کر آئے تو اس کی اطلاع شاہ عالم مارہروی نے ایک خط کے

ذریعہ غالب کو دی، میر وزیر علی چاندنی چوک کے قریب حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں رہتے تھے، شاہ عالم مارہروی نے غالب کے توسط سے ایک خط ان کے نام بھی روانہ کیا تھا اور ان کی خیریت معلوم کرنا چاہی تھی، غالب نے شاہ عالم کو لکھا:

"ایک خط ڈپٹی وزیر علی کے نام کا پہنچا، وہ پڑھا، بھجوا دیا، جو آدمی خط لے کر گیا تھا، وہ دوبار جواب مانگنے کو گیا، حکم ہوا، کل آئیو، دوسری بار حضرت نہ ملے۔ میں نے اس کے جواب سے قطع نظر کرکے اپنی خدمت گذاری کی آپ کو اطلاع دی۔ یائے تحتانی لکھ چکا تھا کہ ایک چپراسی آیا اور اس نے خط تمہارے نام کا ٹکٹ لگا ہوا دیا اور کہا کہ ڈپٹی صاحب نے سلام کہا ہے اور یہ خط دیا ہے۔ اب میں یہ خط اپنا مع ان کے خط کے ڈاک گھر بھیجتا ہوں۔"

شاہ عالم مارہروی وقتاً فوقتاً غالب سے میر وزیر علی کی خیریت پوچھتے رہا کرتے تھے، غالب کو افراطِ ضعف سے چلنے پھرنے کی طاقت نہیں تھی، دوسرے خود میر وزیر علی اتنے مصروف رہتے تھے کہ ان سے ملنا انتہائی دشوار نظر آتا تھا۔ اسلئے غالب نے یہ لکھ کر معذرت کرلی:

"ڈپٹی صاحب سے مجھ سے ملاقات کثرت سے نہیں ہے، ان کو کثرت اشغال سے فرصت نہیں، مجھ کو افراطِ ضعف سے طاقت نہیں۔"

(عودِ ہندی ص۹۲، ص۹۳)

راجہ جوالا پرشاد وقار

راجہ جوالا پرشاد لکھنؤ کے مشہور کائستھوں میں سے تھے۔ ان کو امجد علی شاہ کی جانب سے مدبر الدولہ منشی الملک راجہ جوالا پرشاد بہادر محکم جنگ خطاب دیا گیا۔ اور وہ امیر الانشائی کے عہدہ پہ مامور کئے گئے تھے جس کے نتیجہ میں ہر وقت ان کے گرد متعدد لوں

کا ہجوم رہنے لگا تھا۔ ایک طرف ناطق مکرانی ان کے ذریعہ امجد علی شاہ کے حضور میں باریاب ہونے کے متمنی تھے۔ دوسری طرف غالب نے ان کو اپنا وسیلہ بنا کر امجد علی شاہ کی مدح میں ایک قصیدہ روانہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ لکھنؤ سے صلہ کی سبیل پیدا ہوتی، امجد علی شاہ کا یکم فروری ۱۸۴۷ کو بعارضہ سرطان انتقال ہو گیا۔ ان کے جانشین واجد علی شاہ، غالب کی رائے میں آشفتہ سر اور نالائق تھے۔ غالب کو ان سے کبھی صلہ کی امید نہیں تھی۔ ان کے دور میں پیش آنے والے ہنگاموں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے غالب نے منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھا ہے۔

"اس کے لئے زمانہ چاہیئے کہ اعتقاد الدولہ نورُ ز علی خاں اور جوالا پرشاد میرے امور میں دلچسپی لے کر سلسلہ جنبانی کریں اور لکھنؤ سے میرے نام فرمان طلب پہنچے"۔

راجہ جوالا پرشاد نے غالب کی کاربراری میں کوئی کردار ادا کیا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں تحقیقی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ یقینی امر ہے کہ راجہ جوالا پرشاد، واجد علی شاہ کے عہدِ حکومت میں بھی امیر الانشائی کے عہدہ پر مامور رہے لیکن جب ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر کے مٹیا برج بھیج دیا۔ راجہ جوالا پرشاد نے ان کی رفاقت ترک کر دی اور لکھنؤ ہی میں تنزلی کی زندگی گذارنے لگے۔

صبح گلشن کے مولف نے راجہ جوالا پرشاد کا تخلص وقار بتایا ہے اور لکھا ہے کہ خلق و محبت اور مروت و تواضع ان کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ انھوں نے ایک با اختیار عہدہ پر کام کرنے کے باوجود کسی کے لئے کوئی درشت لفظ زبان سے کیا، نہ قلم سے لکھا۔ وہ نظم و نثر نگاری میں اچھی استعداد رکھتے تھے۔ ان سے ایک دیوان یادگار بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ چھپ چکا تھا۔ ان کے چند شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

نمی آید چرا یارب بہ سویم ترک سفّا کے

سرم را ہست از روز ازل سودائے فتراکے

بہ وقت گریۂ خونیں ز چشم بادہ می ریزد
مگر باشد دلم انگور و مژگانم بود تاکے

دلا گر عاقلی امروز راہِ خاکساری گیر
کہ فردا رفتنت ناچار می باید بہ زیرِ خاکے

وفا از آتشِ دوزخ چرا در دل نیندیشم
پئے اطفار او کافی ست مارا چشم نمناکے

(ربیع گلشن ص ۵۹۸ ـ ۵۹۹ ، سبد باغ دو در حصۂ نثر ص ۱۱۲
تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۳۰)

میر ابراہیم علی خاں وفا

میر ابراہیم علی خاں وفا، میر اکبر علی خاں کے بیٹے اور میر سرفراز علی خاں کے پوتے تھے جنھوں نے تلاش معاش میں بدایوں کے شہر سہوان سے ہجرت کی تھی اور بڑودہ پہنچ کر مہاراجہ گوبند راؤ گائے کواڑ کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے تھے۔ مہاراجہ نے ان کی خاطر خواہ قدر و منزلت کی اور جاگیر سے بھی سرفراز کیا تھا۔

میر ابراہیم علی خاں وفا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، بعد میں ان کو سورت بھیجدیا گیا جہاں انھوں نے منشی لطف اللہ فریدی کی خدمت میں رہ کر علوم متداولہ کی تحصیل کی مرزا عسکری نے ان کو رئیس سورت بتایا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ وہ سورت سے واپس ہونے کے بعد بڑودہ میں اپنے والد میر اکبر علی خاں کے جاگیری علاقوں کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ریاست کے منشی غلام قادر کی صاحبزادی کے ساتھ ان کا نکاح ہو گیا۔

میر ابراہیم علی خاں وفا کو شاعری کا شوق کب اور کیوں پیدا ہوا؟ یہ کہنا مشکل

ہے۔ البتہ یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں کہ وہ ۱۸۶۶ء میں غالب کے شاگرد ہوئے تھے۔ غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب ۸ جنوری ۱۸۶۹ء کو نواب کلب علی خاں کے جشن مسند نشینی میں شرکت کے بعد رام پور سے دہلی پہنچے تھے۔ ان کو سید احمد حسن مودودی کا ایک خط ملا تھا جس میں میر غلام بابا نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ میر ابراہیم علی خاں وفا اور میر عالم علی خاں کے کلام پر اصلاح دیدیا کریں۔

غالب نے میر ابراہیم علی خاں وفا کو کبھی دیکھا تھا نہ ان سے کہیں ملاقات کی تھی وہ ان سے ملنے یا دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اس خیال سے ایک مرتبہ میر ابراہیم علی خاں وفا نے ان کے پاس اپنی تصویر بھجوائی۔ جس پر غالب کو خیال پیدا ہوا کہ وہ بھی اپنی تصویر روانہ کریں۔ لکھتے ہیں:

"تصویر مہر تنویر مجھے پہنچی اور میں نے رسید لکھ نہ بھیجی، عجب ہے کہ آپ کو اس کے پہنچنے میں تردد ہے۔ ارسال فقیر نے جو اپنی خاکسای کا خاکہ یعنی تصویر منشی میاں داد خاں کی معرفت نذر کی ہے۔ یقین ہے وہ بھی پہنچی ہوگی"

اسی طرح جب میر ابراہیم علی وفا کے یہاں بیٹا ہوا تو غالب نے ایک عبارت رنگین مرتب کر کے اکمل الاخبار میں چھپوادی اور وہ رباعی اور قطعہ بھی چھپوادیا جو ابراہیم علی خاں نے اس سلسلے میں موزوں کر کے روانہ کیا تھا، علاوہ ازیں خود بھی یک رباعی اور قطعہ نظم کیا، لکھتے ہیں:

"اپنی لکھی ہوئی رباعی اور قطعہ عرض کرتا ہوں،

حق داد بہ سید زپئے انعامش فرخ پسرے کہ واجب است اکرامش،
تاریخ ولادتش بود بے کم و بیش ارشاد حسین خاں کہ باشد نامش

غالب حال بسنین ہجری   معلوم کن از خجستہ فرزند
چو یک صد و بست و چار ماند   ایں ست شمار عمر دل بند

یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۲۸۵ھ ہے۔ جب "خجستہ فرزند" کے اعداد میں سے ۱۲۸۵ لے لئے تو ایک سو چوبیس بچتے ہیں، ان کو میں نے دعائے عمر مولود قرار دیا ہے"

میر ابراہیم علی خاں وفا کے بیٹوں میں کسی کا بھی نام ارشاد حسین خاں نہیں ہے خیال کیا جاتا ہے کہ ارشاد حسین خاں کم سنی ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ میر ابراہیم علی خاں ۱۸۸۵ء تک زندہ رہے۔ ان کا انتقال بڑودہ ہی میں ہوا اور وہیں تدفین عمل میں آئی ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے :

وہاں نہ جاتے کا لیتے ہو وعدہ مجھ سے مرے   زباں سے لاکھ کہوں دل پر اعتبار نہیں
نہ دو دل اس گل رعنا کو اے وفا دیکھو   گلوں کے حسن دو روزہ کا اعتبار نہیں

کب لبوں پر مرے نالہ نہیں، فریاد نہیں   کب تری وعدہ فراموشی مجھے یاد نہیں
شاد ہوں سینہ میں جب سے دل ناشاد نہیں   اب وہ شیون نہیں نالہ نہیں فریاد نہیں
چھیڑنے کو یہ جفا اس کی وفا ہے ورنہ   طبع اس شوخ کی کچھ مائل بیداد نہیں

علی علی جو کہا تا سحر تو یوں سمجھے ،   کہ ذوالفقار سے کٹتی ہے اب اری بات

(خطوط غالب دوم ص ۱۳۵ ، ص ۱۳۹ ، ادبی خطوط ص ۳۰۲ ، ص ۳۰۳
"تلامذہ غالب" ص ۲۹۶)

حاجی مرزا بزرگ شیرازی وفاؔ

غالبؔ نے حاجی مرزا بزرگ شیرازی کے نام فارسی میں ایک خط لکھا ہے جس کا مقصد بظاہر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ان کی تعریف کرنا چاہتے تھے اور ایسی تعریف جو مبالغہ کی حدوں کو چھو جائے۔

حاجی مرزا بزرگ شیرازی کا اصل نام مرزا احسن علی اور تخلص وفا تھا۔ وہ اپنے دَور کے مشہور طبیب مرزا سید علی شیرازی کے صاحبزادے تھے۔ فارس نامہ ناصری کے مولف نے ان کا سال ولادت ۱۲۲۴ھ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد سے مختلف علوم کی تحصیل کی اور فنون طب و تشریح میں کمال حاصل کیا۔ بعدازاں ۱۲۵۴ھ میں شیراز سے نکل کر بمبئی پہنچے اور وہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کرنے کیلئے روانہ ہوگئے۔ ان دنوں محمد علی پادشاہ مصری بھی حج کے ارادے سے آئے ہوئے تھے۔ حاجی مرزا بزرگ شیرازی نے ان کی مدح میں ایک قصیدہ کہہ کر پیش کیا اور ایک سو اشرفیاں بطورِ انعام پائیں، حاجی مرزا بزرگ شیرازی نے سعادت حج سے مشرف ہونے کے بعد کچھ دنوں کے لئے پیرس اور لندن میں بھی قیام کیا۔ پھر ہندوستان کی راہ لی اور لکھنؤ پہنچ کر اقامت گزیں ہوگئے۔

ایک طویل عرصہ کی اقامت کے بعد بھی ان کو درخور اعتنا اور لائق توجہ نہیں سمجھا گیا تو وہ دل برداشتہ ہو کر اکبرآباد چلے گئے۔ اکبرآباد میں بھی مصیبتوں اور پریشانیوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا جس پر وہ کلکتہ پہنچ کر طبابت کرنے لگے۔ اسی زمانے میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا نے ان کی اہمیت اور بزرگی تسلیم کی اور ان کو فنِ شعر کے بارے میں مستند سمجھنے لگے۔ فارس نامہ ناصری کے مولف کے بیان کے مطابق انھوں نے کلکتہ ہی میں بیمار ہو کر انتقال کیا۔ پندرہ ہزار اشعار پر مشتمل ایک دیوان ان سے یادگار بتایا جاتا ہے لوب

حسن علی خاں نے اپنے تذکرہ میں ان کے یہ اشعار درج کیے ہیں :

بدتر از ہجراں بلائے ہست نیست ۔ دردِ ہجراں را دوائے ہست نیست
شہرہا گشتم کہ تا بینم مگر ۔ روز محنت آشنائے ہست نیست
یار را از دادِ مشتاقاں چہ غم ۔ شاہ در بند گدائے ہست نیست

(فارس نامہ ناصری ص۱۲۰ تا ۱۲۱ ، صبح گلشن ص۵۹۵

کلیات نثر غالب ص۲۲۳)

کیول رام ہشیار

کیول رام ہشیار سکینہ کائستھ تھے۔ ان کے والد سلطان سنگھ بیگم شمرو کی افواج میں بخشی کے عہدہ پر مامور تھے۔ انھوں نے کیول رام ہشیار کی تعلیم و تربیت کا تمام تر انتظام دہلی ہی میں کیا۔ کیول رام ہشیار نے یہیں مختلف اساتذہ سے عربی، فارسی، سنسکرت، اردو اور ہندی پڑھی۔ اس سے فراغت پانے کے بعد بیگم شمرو ہی کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ لیکن یہ نوکری ان کو زیادہ پسند نہیں آئی اور جلد ہی اس سے اکتا کر مستعفی ہوگئے اور مدرسی کو اپنایا۔ ابتدا میں صرف امیرزادوں کی تعلیم و تدریس پر قناعت کی بعد میں جیل خانوں میں قیدیوں کی تعلیم و اصلاح پر مامور ہوئے اور پھر یہاں تک ترقی کی کہ ان کو یوپی کے مدارس کا ڈپٹی انسپکٹر بنا دیا گیا۔ جب ضعیفی نے قویٰ مضمحل کر دیے اور ان کو مختلف شہروں اور علاقوں کے مدارس کی صورتحال کا جائزہ لینے اور دورہ کرنے کی سکت نہیں رہی تو انھوں نے اس عہدہ کو چھوڑ دیا اور چاند پور میں مستقل رہائش اختیار کر کے وہاں صدر مدرس ہوگئے۔ ان کی تصانیف کی تعداد اسی سے زیادہ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہر موضوع اور ہر علم پر کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور لکھا تھا۔ ان کا دیوان ۱۸۷۷ء میں نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ قادر بخش صابر نے اپنے تذکرہ میں

ان کو "مردِ سنجیدہ" اور "صاحب استعداد" بتایا ہے اور اس امر کی صراحت کی ہے کہ

"وہ قصاید و غزلیات فارسی سے دیوان فراہم رکھتے ہیں"

کیول رام ہشیار کے نام غالب کا ایک ہی خط ملتا ہے۔ جس میں انھوں نے بالعموم ہندی لغت نویسوں کی مذمت کی ہے اور محمد حسین تبریزی صاحب برہان قاطع کو خاص طور پر اپنا ہدف ملامت بنایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ان سب فرہنگ لکھنے والوں میں یہ دکن کا آدمی یعنی جامع برہان قاطع احمق اور غلط فہم اور معوج الذہن ہے۔ مگر قسمت کا اچھا ہے۔ مسلمان اس کے قول کو آیت جانتے ہیں اور ہندو اس کے بیان کو مطالب مندرجہ بید و وید کے برابر مانتے ہیں"

کیول رام ہشیار کا نمونۂ کلام یہ ہے:

ملایا خاک میں دکھلا کے تو نے قد بالا کو
سہی کو سرد کو شمشاد کو عرعر کو طوبیٰ کو

خراب چشم میگوں ہو گیا ہے اب سلام اپنا
صراحی کو پیالے کو سبو کو خم کو مینا کو

خط و زلف و قد و عارض کو تیرے کر لیا عاشق
سمن کو سرد کو سنبل کو ریحان مطرا کو

گلستان سخن دوم ص ۳۸۴ ، ۳۸۵ ، سخن شعرا ص ۵۶۵

تذکرہ آثار الشعرائے ہنود ص ۱۳۶ ،

خطوط غالب، مہر دوم ص ۲۳۸ ،

منشی یحییٰ علی خاں

منشی یحییٰ علی خاں یحییٰ کا مولد صفی پور تھا لیکن انھوں نے علوم درسیہ کی تحصیل لکھنؤ

ہیں کی جہاں ان کے والد منشی ثاقب علی خاں اور دادا منشی رونق علی خاں نواب رامپور کے دفتر انشا میں امین اور میر منشی کے عہدہ پر کام کرتے تھے۔ منشی یحییٰ علی خاں کے صاحبزادے عزیز صفی پوری غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح اسلاف میں لکھا ہے۔

"والد ماجد مغفور اور عم مرحوم منشی احمد علی خاں سے اور ان (میر احمد حسین میکش) سے نہایت رابطہ تھا اور وہ اکثر یہیں بیٹھے رہتے تھے۔ عم مرحوم منشی احمد علی نے غالب کی چار غزلیں ایک بیاض میں لکھ لی تھیں"

میر احمد حسین میکش نے ایک مرتبہ اپنے ایک خط میں منشی یحییٰ علی خاں کے حسن سلوک کی تعریف کی اور غالب کو بتایا کہ وہ شاعر بھی ہیں اور یحییٰ تخلص کرتے ہیں، میر احمد حسین میکش کے اس خط پر غالب منشی یحییٰ علی خاں کے کلام کے مشتاق ہو گئے اور ان کو لکھ بھیجا۔

"تم نے منشی یحییٰ علی خاں کے حسن سلوک کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے میرے دل میں بھی ان کی محبت جاگزیں ہو گئی ہے۔ تمہارے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تخلص یحییٰ ہے اور وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ تم میرا سلام ان تک پہنچا کر ان کا کلام میرے پاس بھجواؤ۔"

سید علی حسن خاں نے اپنے تذکرہ میں منشی یحییٰ علی خاں کو مرد نیکو نہاد اور صوفی مشرب بتایا ہے۔ عزیز صفی پوری کے بیان کے مطابق منشی یحییٰ علی خاں نے ۱۲۸۰ھ میں انتقال کیا۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

برباد داد شعلۂ حسنش غبارِ ما، پروانہ وار نیست نشانِ مزارِ ما

شعلہ ساں سوختت بے قراری ہا ؎ پیشم اس شعلہ خو نمی آید
چاک دل راچساں رفو سازم ؎ از قضا ہم رفو نمی آید

یکجی بیاد گیسوئے او شب سحر کنم ؎ وز آتش درونی خود شمع برکنیم
بربادروئے ساقی وپیمانہ چشم خود ؎ میکش شویم ونالہ مستانہ سر کنیم

(صبح گلشن ص ۶۲ ؎ ص ۶۱۵ ۔ سبد باغ دو در ص ۱۷۳ ،

سوانح اسلاف ص ۱۱۸ ص ۱۹۸)

مرزا یوسف خاں

مرزا یوسف خاں غالب کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے ۔ ان کا سال ولادت ۱۲۱۴ھ ہے ۔ جس وقت غالب نے آگرہ کا قیام ترک کیا اور دہلی میں آکر رہ گئے تو مرزا یوسف خاں نے بھی ان ہی کی تقلید کی اور ان کے مکان سے دو ہزار قدم کے فاصلہ پر فراش خانے کے قریب سرس کی گلی میں تنہا رہنے لگے ۔

مرزا یوسف خاں کی عمر ابھی اٹھائیس برس ہی کی تھی کہ ان پر اچانک دیوانگی کا دورہ پڑ گیا اور وہ آخر تک اسی میں مبتلا رہے ۔ دیوانگی کی کیفیت یہ تھی کہ نہ وہ کسی کو ستاتے تھے نہ شور و غوغا کرتے تھے ۔

سنہ ۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب ناکام ہوئی اور انگریزوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر کے ظلم و تعدی کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا تو بقول غالب مرزا یوسف خاں کی بیوی اور لڑکیوں نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ جے پور کی طرف بھاگ جانے میں عافیت سمجھی ۔ اور ان کو گھر کے سامان سمیت ایک بوڑھے دربان اور بڑھیا کنیز کے ساتھ چھوڑ دیا ۔ غالب ہر چند ان تینوں افراد کو بلانا اور ان کا سامان

منگوانا چاہتے تھے لیکن دہلی کی فضا کچھ ایسی مکدر تھی کہ گھر سے نکلتے ہوئے انسانوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ غالب کے لئے ممکن نہیں تھا، وہ صرف یہ سوچ کر رہ جاتے تھے۔ کہ ان کے بھائی نے دن میں کیا کھایا ہوگا۔ اور رات کس طرح کاٹی ہوگی اور ناواقفیت کا یہ عالم تھا کہ ان کو اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ ان کا بھائی زندہ ہے یا انگریزوں نے اس کو قتل کر دیا۔

اسی یاس و بیم کی حالت میں غالب نے ۲۱ ستمبر کو یہ اطلاع سنی کہ انگریزوں نے شہر کو فتح کر لینے کے بعد اس کی گلی کا دروازہ بند کر لیا اور ان کے بھائی کے مکان پر چڑھ دوڑے۔ سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔ دیوانے مرزا یوسف خاں ان کے دربان اور کنیز کو زندہ چھوڑ دیا۔ اسی دوران دو ہندو خاندانوں نے ان کے مکان میں پناہ لی اور ان کے خورد و نوش کا انتظام کرنے لگے۔

اس واقعہ کے چند روز بعد مرزا یوسف خان کے بوڑھے دربان نے ۱۹ اکتوبر کو غالب کے پاس پہنچ کر یہ خبر سنائی کہ مرزا یوسف خاں پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہے اور آدھی رات کے قریب ان کا انتقال ہو گیا۔

اس سلسلہ میں معین الدین حسن خاں کا بیان ہے کہ مرزا یوسف خاں مدت دراز سے حالت جنون میں تھے۔ گولیوں کی آواز سن کر یکایک گھر سے باہر نکلے اور مارے گئے۔ مرزا یوسف خاں کے انتقال سے زیادہ ان کی تدفین کا واقعہ درد انگیز تھا۔ شہر میں پانی، رومال، غسال، گورکن، اینٹ، چونے اور گارے کا حصول اور کفن کے لئے اچھے برے کپڑے کی تلاش بے سود تھی۔ میت کو قبرستان تک لے جانے کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اس موقعہ پر چند پڑوسیوں نے مدد کی پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا اور غالب کے دو نوکروں کو لے کر تدفین کے لئے چل پڑے۔ اور دو تین پرانی سفید چادروں میں لپیٹ کر مکان سے قریب ایک

مسجد کی زمین میں دفن کردیا۔

مرزا یوسف خان کی تاریخ انتقال ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ ایک شخص نے مجھ سے مرزا یوسف کی تاریخ وفات پوچھی میں نے ایک آہ کھینچی اور کہا "دریغ دیوانہ" دریغ دیوانہ سے ۱۲۹۰ کے عدد حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں آہ کے ۱۶ عدد نکال دیئے جائیں تو مطلوبہ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

(غدر کا نتیجہ ص ۶۵ ، غدر کی صبح و شام ص ۳۸۹ ،

احوال غالب ص ۸۹ ، دستنبو (مشمولہ اردوئے معلی دہلی)

سیّد ناصر الدین حیدر خاں یوسف مرزا

نواب یوسف مرزا کے نام غالب کے متعدد خطوط ملتے ہیں۔ ان کا اصل نام سید ناصر الدین حیدر خاں تھا۔ وہ مرشد آباد کے ایک عالی قدر امیر سید محمد نصیر خاں عرف نواب جان کے بیٹے، نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر نامی کے نواسے اور ناظر حسین مرزا کے بھانجے تھے۔ ناظر حسین مرزا سے غالب کو دیرینہ تعلق تھا۔ مولانا حالی کے بیان کے مطابق ان کے والد نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر نامی نے غالب کی غزل میر کو دکھائی تھی، جس پر انھوں نے کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی استاد کامل مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔" ان باتوں کے پیش نظر غالب یوسف مرزا کو زیادہ چاہتے تھے۔

یوسف مرزا کا ابتدائی زمانہ انتہائی امیرانہ شان و شوکت سے بسر ہوا، لیکن ۱۸۵۷ء کی سعی انقلاب ناکام ہوئی اور انگریزوں نے ان کے والد کو پھانسی پر چڑھا یا تو ان کو بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ذریعہ معاش کی تلاش میں ایک طویل عرصہ تک مختلف شہروں اور علاقوں میں سرگرداں رہے۔ بڑی کوششوں کے بعد

الور میں کچھ بندوبست ہو گیا۔ انھوں نے تھوڑے عرصہ میں اتنی ترقی کہ مہاراجہ انکا گرویدہ ہو گیا اور ان کے لئے بطور وظیفہ پچاس روپے ماہانہ مقرر کر دئے۔ ساتھ ہی یہ پابندی بھی ہٹالی کہ وہ ریاست ہی میں رہیں۔ یوسف مرزا سال میں ایک دو مرتبہ الور جاتے اور باقی عرصہ لکھنؤ اور دہلی میں گذارتے تھے۔

۱۸۵۹ء میں یوسف مرزا کا قیام لکھنؤ میں تھا۔ وہ غالب کی تنگ دستی اور گھریلو ذمہ داری سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے غالب سے تقاضا کیا کہ وہ واجد علی شاہ کا قصیدہ لکھ کر کلکتہ روانہ کریں تو کام بن جائے گا۔ غالب نے اس کے جواب میں لکھا:

”سنو صاحب! تم جانتے ہو کہ میں چودہ پارچہ کا خلعت ایکبار اور ملبوس خاص شال رومال دوشالہ ایک بار پیش گاہ سلطانِ عالم سے پا چکا ہوں مگر یہ بھی جانتے ہو کہ وہ خلعت دو بار کس کے ذریعہ ملا ہے۔ یعنی جناب قبلہ و کعبہ حضرت مجتہد العصر مدظلہ العالی۔ اب آدمیت اسکی مستقضی نہیں ہے کہ میں بغیر ان کے توسط کے مدح گستری کروں چنانچہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا کہ میرا دستور ہے۔ کاغذ بنوا کر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں بھیج دیا ہے اور یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا۔“

اس خط کے بائیسویں روز ۲۸ر نومبر ۱۸۵۹ء کو غالب نے اس قصیدے کی وضاحت کر دی اور اس امر کو یوسف مرزا کے علم میں لانا ناگزیر سمجھا۔

”جہاں پناہ کی مدح کی فکر نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ ممدوح کی نظر سے گزرا تھا۔ میں نے اسی میں امجد علی شاہ کی جگہ واجد علی شاہ کو بٹھایا۔ خدا نے بھی یہی کیا تھا۔ انوری نے بارہا ایسا کیا ہے کہ ایک کا قصیدہ دوسرے

کے نام پر کر دیا۔ میں نے اگر باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں .... اس قصیدے سے مجھ کو غرض دست گاہ سخن منظور نہیں، گدائی منظور ہے"

یوسف مرزا نے اپنی زندگی کا آخری حصہ لکھنؤ ہی میں بسر کیا اور ۱۸۸۲ء اور ۱۸۸۳ء کے لگ بھگ وفات پائی، نورباڑی لکھنؤ کے قبرستان میں دفن ہوئے یوسف مرزا کی مجروح سے گہری دوستی تھی، چنانچہ میر مہدی مجروح نے ان کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ کہا، جس کے اس شعر سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

چنیں گفت رضواں سنین وفات
بیا سیدم در بہشت بریں،

(۱۳۰۰ھ)

(خطوط غالب دوم ص۱۱۳، ص۱۱، ص۱۱
تلامذہ غالب ص۲۷)

بعض اہم حوالے

غالب کی تصانیف

کلیات غالب (نظم فارسی)	مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی	مجلس ترقی ادب، لاہور
کلیات غالب (نثر فارسی)		نول کشور پریس، کانپور
متفرقات غالب	مرتبہ مسعود حسن ادیب رضوی	ہندوستان پریس، رام پور
ماثر غالب	مرتبہ قاضی عبدالودود	مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ
مکاتیب غالب	مرتبہ امتیاز علی عرشی	ناظم پریس، رام پور
نادرات غالب	مرتبہ آفاق حسین	مشہور پریس، کراچی
خطوط غالب	مرتبہ مہیش پرشاد	سٹی پریس، الٰہ آباد
خطوط غالب	مرتبہ غلام رسول مہر	غلام علی اینڈ سنز، لاہور
انتخاب غالب	مرتبہ عبدالرزاق راشد	دین محمدی پریس، لاہور
باغ دودر	مرتبہ وزیرالحسن عابدی	پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور
ادبی خطوط غالب	مرتبہ محمد عسکری	انوار بک ڈپو، کراچی
مجموعۂ نثر غالب	مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی	مجلس ترقی ادب، لاہور
عود ہندی	مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی	مجلس ترقی ادب، لاہور
دیوان غالب		تاج کمپنی، لاہور
دیوان غالب	مرتبہ امتیاز علی عرشی	انجمن ترقی اردو، علیگڑھ
تیغ تیز		اکمل المطابع، دہلی
لطائف غیبی		اکمل المطابع، دہلی
سوالات عبدالکریم		اکمل المطابع، دہلی

سید حیین — مرتبہ مالک رام — جید برقی پریس، دہلی

غالب پر تصانیف

یادگار غالب — الطاف حسین حالی — اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

غالب — غلام رسول مہر — مبارک علی اینڈ سنز، لاہور

ذکرِ غالب (جدید) — مالک رام — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی

حیات غالب — شیخ محمد اکرام — فیروز سنز، لاہور

حکیم فرزانہ — شیخ محمد اکرام — فیروز سنز، لاہور

احوال غالب — مختار الدین آرزو — انجمن ترقی اردو، علیگڑھ

نقد غالب — مختار الدین آرزو — انجمن ترقی اردو، علیگڑھ

تلامذۂ غالب — مالک رام — مرکز تصنیف و تالیف نکودر

تذکرے

انتخاب یادگار — منشی امیر احمد مینائی — تاج المطابع، لکھنؤ

آثار الشعرائے ہنود — دیبی پرشاد بشاش — مطبوعہ

تذکرہ روز روشن — محمد مظفر حسین صبا — مطبع شاہجہانی، بھوپال

گل رعنا — مولوی عبد الحی — دار المصنفین، اعظم گڑھ

گلشن بے خار (ترجمہ) — مصطفےٰ خاں شیفتہ — نفیس اکیڈمی، کراچی

سخن شعرا — عبد الغفور خاں نساخ — مطبع نول کشور، لکھنؤ

مجموعہ نغز — قدرت اللہ قاسم — یونیورسٹی پریس، لاہور

یادگار ضیغم — عبد اللہ خاں ضیغم — مطبع قادری حیدر آباد دکن

خم خانۂ جاوید اول تا چہارم — لالہ سری رام — مطبوعہ

خم خانۂ جاوید پنجم — پنڈت دتاتریہ کیفی — مطبوعہ

گلستان سخن اول دوم	قادر بخش صابر دہلوی	مجلس ترقی ادب، لاہور
عمدۃ المنتخبہ	اعظم الدولہ سرور	یونیورسٹی پریس، دہلی
شمع انجمن	نواب محمد صدیق حسن خاں	مطبوعہ
صبح گلشن	علی حسن خاں	مطبوعہ
بزم سخن	سید علی حسن خاں	مطبوعہ
نگارستان سخن	نورالحسن خاں	مطبوعہ
طبقات الشعرائے ہند (تلخیص)	کریم الدین پانی پتی	مطبوعہ پٹنہ
ریاض الوفاق		مطبوعہ ایران
ہفت آسماں	آغا احمد علی	مطبوعہ ایران
فارس نامہ ناصری		مطبع کریمی، بمبئی
سراپا سخن	محسن علی لکھنوی	مطبع نول کشور، لکھنؤ
قطعہ منتخبہ	عبدالغفور خاں نساخ	(رسالہ اردو، کراچی)
تذکرہ محبوب الزمن	عبدالجبار خاں ملکاپوری	مطبوعہ
۱۸۵۷ء کے غدار شعراء	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ، دہلی
۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء		" "
انتخاب زریں	سرراس مسعود	نظامی بکڈپو، بدایوں
تکملہ مقالات الشعرا	مرتبہ حسام الدین راشدی	سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد
شمیم سخن		مطبوعہ
بہارستان ناز	حکیم ربیع میرٹھی	مجلس ترقی ادب، لاہور
گلزار اعظم		مطبوعہ
تذکرہ غوثیہ	مولوی گل حسن	تعلیمی پرنٹنگ پریس، لاہور

مشاہیر کاکوری	علی حیدر کاکوری	مطبوعہ
سیر المتاخرین (ترجمہ)	غلام حسن طباطبائیؒ	مطبع نول کشور، لکھنؤ
۱۸۵۷ء کے مجاہد	غلام رسول مہر	مبارک علی اینڈ سنز، لاہور

سوانح

سیرت فریدیہ	مرتبہ حکیم محمود احمد برکاتی	پاک اکیڈمی، کراچی
سوانح اسلاف	عزیز صفی پوری	مطبوعہ
حیات حافظ رحمت خاں	الطاف علی بریلوی	نظامی پریس، بدایوں
تجلیات	ہادی عزیز لکھنوی	نظامی پریس، لکھنؤ
مآثر صدیقی	نواب حسن علی خاں	مطبوعہ
اعمال نامہ	سر رضا علی خاں	مطبوعہ
نواب افضل الدولہ	مراد علی طالع	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن
بہادر شاہ ظفر	امیر احمد علوی	انوار بکڈپو، کراچی
داغ	تمکین کاظمی	آئینۂ ادب، لاہور
حیات مومن	کلب علی خاں فائق	مجلس ترقی ادب، لاہور
کارنامہ سروری	سرور جنگ	مطبع مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
حیات اجمل	قاضی عبدالغفار	انجمن ترقی اردو، علیگڑھ

دواوین

دیوان مشتاق		مطبوعہ
دیوان زکی		مطبوعہ
دیوان معروف		نظامی پریس، بدایوں
فغان دہلی		پنجابی اکیڈمی، لاہور

کلیات سالک		مجلس ترقی ادب، لاہور
کلیات نظام		مطبوعہ
کلام عاصی		دیال پرنٹنگ پریس، دہلی

متفرقات

بزم داغ	احسن مارہروی	انجمن ترقی اردو، دہلی
مرحوم دہلی کالج	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو، کراچی
تاریخ صحافت اول تا سوم	امداد صابری	فاروقی پریس، دہلی
انشائے سرور	رجب علی بیگ سرور	مطبع نول کشور، لکھنؤ
تاریخ ادب اردو (ترجمہ)	رام بابو سکسینہ	مطبع نول کشور، لکھنؤ
سیاح اوران کا کلام	ظہیرالدین مدنی	ادبیات اردو حیدرآباد
مشاطۂ سخن	صفدر مرزا پوری	مطبع نول کشور، لکھنؤ
غدر کا نتیجہ	غلام حسن خاں محو	محبوب المطابع، دہلی
غدر کے صبح و شام	خواجہ حسن نظامی	ہمدرد پریس، دہلی
نقش آزاد	ابوالکلام آزاد	غلام علی اینڈ سنز، لاہور
تحفۂ سعیدیہ	سید احمد ولی اللہی	دہلی
ذوق ادب اور شعور	احتشام حسین	فروغ اردو، لکھنؤ
دہلی کا آخری سانس	خواجہ حسن نظامی	دلی پرنٹنگ پریس، دہلی
مشکاف کی ڈائری	خواجہ حسن نظامی	دہلی
غدر کے علماء	مفتی انتظام اللہ شہابی	دہلی
چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

تاریخ

مشاہیر جنگ آزادی	مفتی انتظام اللہ شہابی	مطبوعہ
قیصر التواریخ	کمال احمد حیدر	مطبع نول کشور، لکھنؤ
تاریخ اودھ اول تا پنجم	حکیم نجم الغنی	〃 〃 〃
واقعات دار الحکومت دہلی اول تا سوم	بشیر الدین احمد	شمسی پریس، آگرہ
کاملان رام پور	احمد علی رام پوری	ہمدرد پریس، دہلی
عمدۃ الصحائف		مطبوعہ
اخبار الصنادید	حکیم محمد نجم الغنی	مطبع نول کشور، لکھنؤ
علمائے ہند	مولوی احسان علی	〃 〃 〃 〃
المشاہیر	فیض احمد	مطبوعہ
روضۃ الکرام	علی اصغر بلگرامی	مطبوعہ
تذکرہ اہل دہلی	سرسید احمد خاں	انجمن ترقی اردو، کراچی
صحیفۂ زریں	پراگ نارائن بھارگو	مطبع نول کشور، لکھنؤ
عہد بنگش	ولی اللہ فرخ آبادی	ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی
علم و عمل	عبد القادر رام پوری	ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی
تذکرۂ بے بہا		مطبوعہ دہلی
تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ	مولوی ذکاء اللہ دہلوی	مطبوعہ
تاریخ عروج سلطنت چشتیہ	خلیق احمد نظامی	مکتبہ برہان، دہلی
۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	مرتبہ خلیق احمد نظامی	〃 〃 〃
حدائق حنفیہ	فقیر محمد جہلمی	مطبع نول کشور، لکھنؤ
تاریخ راجگان ہند	حکیم محمد نجم الغنی	ہمدم برقی پریس، لکھنؤ

مشرقی تمدن کا آخری نمونہ عبدالحلیم شرر اردو ورلڈ سنٹر، کراچی

رسالے اور اخبارات

آج کل فروری فروری ۱۹۶۳ء، فروری ۱۹۵۵ء، ۱۵ر فروری ۱۹۴۷ء، فروری ۱۹۵۸ء، جون ۱۹۴۵ء، اگست ۱۹۵۱ء، فروری ۱۹۶۸ء

نوائے ادب — اکتوبر ۱۹۵۵ء

ادبی دنیا — ستمبر ۱۹۶۵ء

نگار لکھنؤ — مئی ۱۹۳۱ء نگار رام پور فروری ۱۹۶۳ء

العصر — جون ۱۹۱۳ء

ادیب — جون ۱۹۱۳ء

ہندوستانی — ۴/ ۱۹۳۴ء

اردوئے معلی دہلی (غالب نمبر)

دہلی کالج میگزین

نقوش — (آپ بیتی نمبر)

نقوش — (مکاتیب نمبر)

عالمگیر — (سالنامہ) ۱۹۴۴ء

دہلی اردو اخبار — ۱۵ر اگست ۱۸۴۸ء ۱۷ر مئی ۱۸۵۷ء

احسن الاخبار — ۱۳ر نومبر ۱۸۴۶ء ۸ر مئی ۱۸۴۶ء

کمال دہلی جنوری ۱۹۱۲ء

اردو — اپریل ۱۹۳۱ء

معارف — ۱۹۲۳ء

تاریخِ اشاعت

حفیظ ہوشیارپوری

بساطِ بزمِ غالب ہر ورق ہے　　نظر میں ہے فضائے بزمِ غالب
اگر منظور ہے سالِ اشاعت　　تو کہیے "رہنمائے بزمِ غالب"

۱۳۸۸ھ